امیر حجاج بن یوسف الثقفی رحمہ اللہ

چند غلط فہمیوں کا ازالہ

فتنہ ابن الاشعث وسعید بن جبیرؒ اور
معرکہ ابن زبیرؓ پر بے لاگ تحقیق وتبصرہ

محمد فہد حارث

مکتبۃ الفہیم
مئوناتھ بھنجن یوپی

حارث پبلی کیشنز

انتساب

میری والدہ اور زوجہ کے نام

وہ دو عظیم خواتین جن سے ہر روز کچھ نیا سیکھنے کو ملتا ہے۔

فہرست

تقریظ

اثر خامہ محقق اعظم رئیس القلم حکیم فیض عالم صدیقی مصنف کتب کثیرہ

حضور خاتم النبیین والمعصومین کی ازواج مطہرات میں سیدہ صدیقہ کائناتؓ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے امیر المؤمنین مروان بن الحکم (۱) اور تابعین عظام میں سے امیر المؤمنین امیر یزیدؒ اور امیر حجاج بن یوسف ثقفی علیہ الرحمۃ والرضوان امت کی مظلوم ترین شخصیتیں ہیں۔

۱۔ میں نے اپنی تالیف میں امیر المؤمنین مروان بن الحکمؓ کی عمر نبی علیہ السلام کی وفات کے وقت ۸۔۹ سال لکھی تھی۔ بعد میں چند شواہد نظر سے گذرے جو اس بات میں مؤید ہیں کہ امیر موصوف کی عمر نبی علیہ السلام کی وفات کے وقت ۲۸۔۲۹ سال تھی چنانچہ ایک حنفی عالم نے بخاری کے راویوں پر چند اعتراضات کیے تھے جن میں امیر مروان کا نام بھی تھا اس کے جواب میں مولانا ابوالقاسم بنارسی نے الامر المبرم میں ان اعتراضات کے جوابات لکھے۔ کتاب مذکورہ کے صفحات ۱۷۷ تا ۱۷۹ پر امیر المؤمنین مروان بن حکمؓ کے متعلق بحث کرتے ہوئے حیاۃ الحیوان صفحہ ۵۵ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ نبی علیہ السلام کے وفات کے وقت امیر مروانؓ کی عمر ۲۹ سال تھی۔ چنانچہ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ ابن طاہر کا یہ قول کہ مروانؓ ۲ھ میں پیدا ہوا مردود ہے۔

(اصابہ ج/۳،ص/۹۰۶)

حیاۃ الحیوان میں ہے کہ مروان نے ۶۵ھ میں وفات پائی اور اس وقت اس کی عمر ۸۳ سال تھی (ج/۱،ص/۶۶) گویا موصوف ہجرت سے ۱۸ سال پہلے پیدا ہوئے تھے امام بخاری لکھتے ہیں کہ امیر مروان کی وفات ۶۳ھ میں ہوئی اور اس وقت اس کی عمر ۸۱ سال تھی (تاریخ صغیر بخاری ص/ ۶۳) اس سے بھی امیر موصوف کا ہجرت سے ۱۸ سال پہلے پیدا ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ نبی علیہ السلام کی وفات کے وقت امیر مروانؓ کی عمر ۲۹ سال تھی۔ (تلخیص الامر المبرم ص/ ۱۷۸)

اسلام دشمن تحریکوں نے جب اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس کو نشانۂ تضحیک بنانا چاہا تو اُسے بداء کی لپیٹ میں لے کر رگیدا۔ کہیں یہ کہہ کر ؎

جبریل کہ آمد زپس خالق بے چوں
شد پیش محمد ومقصود علیؓ بود

اللہ تعالیٰ کی بے بسی کا نقشہ کھینچا۔ اور جب حضور صادق ومصدوق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس پر سب وشتم کی نشانہ بازی کی طرح ڈالی تو آسان ترین راستہ یہ سوجھا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج مطہرات اور آپ کے صحابہ کرامؓ کی طہارت وصحابیت کی فضائے بسیط میں دھجیاں بکھیری جائیں اور جب صحابہ کرامؓ کی طرف توجہ مبذول کی تو سیدنا امیر معاویہؓ سے یہ سلسلہ شروع کیا۔ اور جب تابعینؒ کی طرف رُخ کیا تو امیر المؤمنین سیدنا امیر یزیدؒ اور ان کے بعد فاتح اعظم امیر حجاج بن یوسف ثقفیؒ کی اسلامی خدمات کے ذکر کی بجائے ان کی مفروضہ برائیوں کی اس طرح پیہم تکرار شروع کی کہ آج اچھا خاصا پڑھا لکھا طبقہ انہیں اسلام دشمن عناصر کی لے میں ہانک لگائے چلا جا رہا ہے۔

امیر المومنین امیر یزیدؒ اور ان کے ماتحت لشکر جس میں عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن عباسؓ، حضرت ابوایوب انصاریؓ، حضرت حسینؓ بن علیؓ جیسی برگزیدہ شخصیتیں موجود تھیں، کی شان میں جس طرح دربار رسالت سے ''مغفور لھم'' کا پروانہ مغفرت جاری ہوا تھا اسی طرح امیر حجاج بن یوسفؒ کے لیے معرکۂ ہند میں شامل ہونے کے لیے مسند احمد، تاریخ الکبیر بخاری اور مستدرک حاکم میں آتش دوزخ سے آزاد ہونے کی بشارات موجود ہیں۔ گو امیر حجاجؒ خود غزوہ ہند میں موجود نہ تھا مگر کون نہیں جانتا کہ دیبل کے مقام پر عرب تاجروں کا قافلہ لُٹنے کے وقت اسلام کی ایک بیٹی کی چیخ امیر حجاج کے کانوں سے ٹکرائی تو اس نے لبیک کہتے ہوئے اپنے بھتیجے محمد بن قاسم کو بلا تاخیر قیدیوں کی رہائی کے لیے روانہ کر دیا جس کا نتیجہ فتح سندھ کی صورت میں ظاہر ہوا۔

حجاج سیاسی اسٹیج پر:

مسلمانوں کے عظیم خلیفہ امیر المومنین عبدالملک بن مروان (۶۵ تا ۸۶ھ) کے زمانہ میں ایک سفر کے دوران اسلام دشمن غنڈوں نے خلافت کے کیمپ میں آگ لگادی تو روح بن زنباع کے مشورہ سے ساقہ کا محکمہ قائم کر کے امیر حجاج رحؒ کو اس کا افسر اعلیٰ مقرر کیا۔ تاریخوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ امیر حجاج رحؒ کے افسر ساقہ مقرر ہونے کے بعد تمام غنڈے ملک کے جس حصے میں بھی تھے اپنے بلوں میں گھُس گئے اور اس وقت عربوں کو امیر حجاج رحؒ کے بلند مرتبے کا پتہ چلا۔ (مقدمہ ابن خلدون حصہ دوم ص ر ۱۲۰۔۱۲۱)

۷۳ھ مطابق ۶۹۱ء میں مصعب بن زبیر کو دجیل کے مقام پر شکست دی۔ ۷۳ھ مطابق ۶۹۲ء میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو شکست دی۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی خلافت کے خلاف شورش کو اسلام دشمن عناصر نے بڑا اچھالا اور انہیں امیر المومنین کہنے سے بھی نہیں ہچکچائے۔ مگر اس طرف توجہ نہ دی گئی کہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ جس حد تک عبادت گزار، شجاع، بہادر، غیور اور بلند ہمت تھے اس کا عشرِ عشیر بھی سیاست سے انہیں مس نہ تھی۔ ان کی شورش کو حق بیں اور حق گو اصحابؓ نے کسی دور میں مبنی بر حق نہیں سمجھا۔ یہاں تک کہ ان کے بھائی، قریبی عزیز اور رشتہ دار تمام امیر حجاجؒ کے کیمپ میں تھے اور سب سے اہم ترین بات کہ ۷۳ھ میں ہزارہا صحابہ کرامؓ بقید حیات (۱) تھے کسی نے بھی ان کے فعل کو نہیں سراہا۔ بلکہ عجیب ترین بات یہ کہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی شکست سے پہلے سال یعنی ۷۲ھ میں ان کی شکست کے سال ۷۳ھ میں اور اس سے اگلے سال یعنی ۷۴ھ میں یعنی لگا تار تین سال حجاجؒ کو امیر حُجاج ہونے کی سعادت حاصل رہی۔ حج فرض عبادت ہے اور حج پر دنیا بھر کے اعاظم رجال کا اجتماع ہوتا ہے امیر حج ہی حُجاج کو حج کے مناسک ادا کراتا ہے، نمازیں پڑھاتا ہے اور عرفات کے میدان میں خطبہ حج پڑھتا ہے ہمیں کسی تاریخ میں ایک لفظ بھی کہیں ایسا دکھائی نہیں دیتا کہ امیر حجاج بن یوسف رحؒ کے لگاتار تین سال امیر حج

۱۔ تفصیل کے لیے میری تالیف امیر المومنین مروان بن حکمؓ دیکھیے۔

مقرر ہونے پر کسی ایک نے تمام عالم اسلام سے اعتراض کیا ہو۔

اسلامی فتوحات کے دو دَور:

پہلے دور سے مراد سیدنا فاروق اعظمؓ کی خلافت کا دور ہے آپ نے مدینۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں بیٹھے ہوئے قادسیہ اور یرموک کے میدانوں میں دنیا کی دو عظیم سلطنتوں ایران اور روم کے بخیے اُدھیڑ کر رکھ دیے۔

دوسرا دور امیر المومنین ولیدؒ بن عبدالملکؒ اموی کا دور ہے جس کے زمانہ میں خلافت اسلامیہ کے مشرقی ممالک کے وائسرائے امیر حجاج بن یوسفؒ نے سیدنا فاروق اعظمؓ کی طرح اپنے مستقر یعنی بصرہ میں بیٹھے ہوئے اپنے قابل جرنیلوں کے ذریعہ مغرب میں مراکش تک موسیٰ بن نصیر شمال مشرق میں چین کی سرحدوں تک قتیبہ بن مسلم باہلی اور مشرق میں ملتان تک اپنے ۱۸ سالہ نوجوان بھتیجے اور داماد محمد بن قاسم کے ذریعہ باطل پرستوں کی طاغوتی طاقتوں کو ھباء منثورا کر کے نعرۂ تکبیر کی آوازیں پہنچائیں۔

امیر حجاج بن یوسفؒ عالم اسلام کے لیے ایک آیۂ رحمت تھا۔ اندرون ملک اس نے سبائیت اور خارجیت کے کَس بل نکال کر رکھ دیے اور بیرون ملک اس کی افواج طوفان آسا چار دانگ عالم میں حق وصداقت کا پرچم بلند کیے بڑھتی چلی گئیں۔

کیا حجاج ظالم تھا؟:

حجاج واقعی ایک ظالم اور جابر حکمران تھا۔ مگر کن لوگوں کے لیے؟ صرف ان لوگوں کی روحانی ذریت کے لیے جنھوں نے سب سے پہلے سیدنا فاروق اعظمؓ کو خاک وخون میں نہلایا۔ پھر نبی علیہ السلام کے دوہرے داماد اور محسن اسلام سیدنا ذوالنورینؓ کو چالیس روز بھوکا پیاسا تڑپا تڑپا کر شہید کیا اس کے بعد سیدنا علیؓ کو چکمہ دے کر مدینہ سے نکالا اور پہلے کائنات کی افضل ترین خاتون حضرت صادق ومصدوق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبوب ترین زوجہ یعنی حضرت صدیقہ کائناتؓ کے مقابل لاکھڑا کیا پھر سیدنا معاویہؓ سے الجھایا۔ اور آخر آپ کو

اپنے ڈھب کا نہ پاکر خوارج کی صورت میں اپنے محسن سے ہی اُلجھ پڑے اور نہروان کے مقام پر کیفرِ کردار کو پہنچے اور آخر انہیں بھی کوفہ کی مسجد میں قتل کر دیا۔ پھر ان کے بیٹے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے محبوب نواسے سیدنا حسنؓ کو مذل المومنین کہنے سے نہ ہچکچائے اور انہیں زخمی کر دیا اور آخر سیدنا حسینؓ کو گھیر کر کربلا میں جا پہنچایا اور انہیں بھی خاک وخون میں تڑپا کر دم لیا۔ سیدنا معاویہؓ کے زمانہ میں زیر زمین رہے امیر یزیدؒ کے زمانہ میں سیدنا حسینؓ کو قتل کر کے امیر یزیدؒ کے سر ان کے قتل کا الزام تھوپا۔

امیر مروانؒ اور ان کے بیٹے اور جانشین امیر المومنین عبدالملک کے زمانہ میں آہستہ آہستہ طاقت پکڑتے چلے گئے اور آخر امیر المومنین عبدالملک کے زمانے میں کونے کھدروں سے سر نکالنے لگے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت ان اسلام دشمن عناصر کا سر کچلنے کے لیے حجاج بن یوسفؒ کی شکل میں نمودار ہوئی۔ ۷۷ھ مطابق ۶۹۶ء میں ازارقہ کی بغاوت فرو کی اور ۷۸ھ تک عراق سے خارجی اور سبائی نیست ونابود کر کے رکھ دیے۔ ۸۶ھ میں جب امیر المومنین ولیدؒ کو خلافت ملی اس وقت مملکت اسلامیہ سے امیر حجاج ان تخریب پسند عناصر کو ختم کر چکا تھا۔ اس کے بعد اسلامی فتوحات کا دوسرا عظیم دور شروع ہوا۔

امیر حجاج بن یوسفؒ ایک فصیح البیان خطیب، بے مثال سیاستدان، عظیم مدبر، کامیاب کمانڈر اور نہایت جزرس حکمران تھا۔ مگر اس کی تمام خوبیاں اس کے دشمنوں نے خامیوں اور برائیوں میں بدل کر رکھ دیں جن کے سروں پر وہ برق جہندہ بن کر کوندتا رہا۔ قرآن مجید پر نقاط لگانے کا کام امیر حجاجؒ کا مرہون منت ہے۔ عراق میں نہریں کھدوانے کا بانی اور اسلامی ٹکسال کا ناظم اعلیٰ بلکہ بانی بھی امیر حجاجؒ تھا۔

عربی ادب کی کتابوں میں امیر موصوف کے ادبی شہ پارے امثلہ کے طور پر سند کی حیثیت سے آج تک پیش کیے جاتے ہیں۔ صدر اول کی کتب میں سے مستدرک حاکم، تاریخ کبیر بخاری، مسند احمد اور ابن اثیر ہیں اور ماضی قریب میں اردو انسائیکلو پیڈیا دائرہ معارف اسلامیہ بنیادی، السنۃ ومکانتھا از مصطفی السباعی اور آئینہ حقیقت نما وغیرہ میں

امیر موصوف کے حالات دیکھے جا سکتے ہیں۔

اللہ کرے ہوز ورِ قلم اور زیادہ جناب محمد اشرف الدین صاحب یکتا جودھ پوری نے ''حجاج بن یوسف'' لکھ کر عالم اسلام پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ امیر موصوف کے حالات لکھنے میں یکتا صاحب نے بڑی دیدہ ریزی اور کاوش سے کام لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی محنت کو قبول فرمائیں۔ یہ کتاب بقامت کہتر سہی مگر معلومات کے لحاظ سے بقیمت بہتر شاہکار ہے اور میرے خیال میں امیر موصوف کے حالات پر یہ پہلی کتاب ہے جو تطہیر تاریخ کی دنیا میں ایک لازوال شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے میں ہر صاحب ایمان مسلمان کو اس کے مطالعہ کی دعوت دیتا ہوں۔

میں اس حقیقت کے اظہار میں بے انتہا خوشی محسوس کرتا ہوں کہ السید صاحبزادہ ابرار احمد صاحب بگوی ایم اے مدیر ماہنامہ شمس الاسلام بھیرہ نے اس قیمتی مقالہ کی افادیت واہمیت کو محسوس کر کے اس کو اپنے مؤقر رسالہ کے صفحات کی زینت بنایا ہے اور بالاقساط شائع کرنا شروع کر دیا ہے۔

صاحبزادے صاحب کی علمی خدمات قابل قدر ہیں۔ انہوں نے یہ چیز اپنے اسلاف سے ورثہ میں پائی ہے اور وہ کسی مالی منفعت کی امید کے بغیر اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں اس زمانہ میں جب کہ گرانی اور اشیائے صرف کی نایابی نے اچھے اچھوں کے حوصلے پست کر رکھے ہیں صاحبزادہ صاحب اپنی علمی سرگرمیوں کو جاری رکھے ہوئے ہیں اور ایک خالص دینی اور علمی قسم کا ماہنامہ نہایت باقاعدگی سے نکال کر اپنی علم نوازی کا ثبوت بہم پہنچا رہے ہیں۔

اس کارِ خیر کا اجر دنیا والوں کے پاس تو نہیں ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ کے خزانے میں اس کی کمی نہیں۔ یقین ہے کہ حق سبحانہ تعالیٰ ان کو اس اجر سے محروم نہ رکھے گا۔

۱۵/رجب ۱۳۹۸ھ

فیض عالم صدیقی رجامع اہل حدیث محلہ مستریاں جہلم

تعارفی کلمات

ابتدائے اسلام سے عصرِ حاضر تک جتنی بھی کتبِ تاریخ مسلمانانِ عالم کے حوالے سے تحریر کی گئی ان میں صحیح وضعیف ہر قسم کی روایات کو بیان کر دیا گیا جبکہ ابتدائی ادوار کی تالیف وتصنیف کردہ کتب میں اسانید کے ساتھ روایات کو بیان کرنے کا منہج ان روایات کی تصحیح وتضعیف میں معاون وممد بن جاتا ہے۔اس کے باوجود جزوی طور پر تو ہمیں یہ اہتمام نظر آتا ہے کہ ان روایات کی جا بجا تحقیق و تنقیح کی گئی جیسا کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور مشہور مفسر وفقہیہ ومحدث ابن العربی رحمہ اللہ نے تصحیح و تنقیح سے کام لیا لیکن پھر بھی مرویاتِ تاریخ کی کماحقہ تحقیق کے حوالے سے ایک تشنگی کا احساس باقی ہے۔ دیگر تمام اسلامی علوم کے اصول وضوابط مدون ومرتب کیے گئے لیکن تاریخ وہ واحد معروف فن ہے جس کے حوالے سے ابھی تک اصولِ تاریخ کے نام سے باقاعدہ کوئی تالیف یا تصنیف نہیں ہے۔اور ابھی تک یہ امر بھی مختلف فیہ ہے کہ کیا مرویاتِ تاریخ کو اصولِ حدیث کی روشنی میں پرکھا جاسکتا ہے؟

جمہور علماء اس فکر کی تائید نہیں کرتے لیکن پھر بھی جہاں کسی تاریخی واقعہ کے مشتملات و حوادث میں اختلاف رونما ہوتا ہے تو رجوع اصولِ حدیث کی طرف ہی کیا جاتا ہے یعنی ایک لاشعوری سوچ پائی جاتی ہے کہ اصولِ حدیث کو ہی بنیاد بنایا جائے۔اس حوالے سے تاریخ مسلمانان عالم کے بے شمار واقعات وحوادث وشخصیات تحقیق کی محتاج ہیں۔انھی شخصیات میں سے ایک شخصیت مشہور اموی گورنر حجاج بن یوسف کی ہے۔معروف مورخ محمود شاکر لکھتے ہیں کہ چونکہ تاریخ بنوعباس کے دور میں مدون ہوئی اس لیے بہت سے مقامات پر بنوامیہ کے حالات بیان کرنے میں انصاف سے کام نہیں لیا گیا۔ باوجود اس امر کہ بنوامیہ کا دور بہترین ادوار میں شامل ہے۔

زمانہ طالب علمی میں کتور عبدالعزیز نورولی استاد تاریخ جامعہ اسلامہ مدینہ منورہ کے

مکتبہ میں حجاج بن یوسف کے حوالے سے چار مقالات دیکھے جن میں سے دو یا تین عرب جامعات میں پی ایچ ڈی کے مقالات تھے اور طبع بھی ہوئے۔ ان کا مطالعہ کرنے کے بعد شدید حیرانی ہوئی کہ حجاج بن یوسف کی شخصیت کا صرف ایک ہی رخ عمومی طور پر پیش کیا جاتا ہے جو ظلم وستم، سفاکیت، درندگی، قتل وغارت گری سے تعبیر ہے۔ جبکہ اس کی خدمات کا ایک طویل سلسلہ ہے جیسا کہ اعرابِ قرآن، تعریب الدواوین، اسلامی کرنسی میں سکوں کا باقاعدہ آغاز، عراق میں نہری نظام، فتوحات کا ایک طویل سلسلہ، انتظام وانصرام کی صلاحیت وغیرہا کا ذکر تفصیل سے پڑھا۔

انھی کتب میں سے چند صفحات میں نے محدث فورم پر شیئر کیے کہ اس پر تبصرہ کیا جائے کہ یہ کہاں تک درست ہے اور کہاں تک اس میں غلط بیانی سے کام لیا گیا لیکن مجھے شدید حیرانی کا سامنا کرنا پڑا کہ جب مذکورہ بالا صفحات پر کسی نے تبصرہ کرنے کی زحمت وکوشش نہ کی البتہ حجاج بن یوسف کو جہنم ضرور بھیج دیا گیا۔ علی کلِ حال زیر نظر چند مقالات جو حجاج بن یوسف کے حوالے سے جمع کیے گئے ہیں یہ صرف اس غرض سے مرتب وجمع کیے گئے کہ تاریخ کے اس پہلو کو اردو داں طبقے کے سامنے لایا جاسکے اور صحیح وسقیم کے مابین فیصلہ کیا جاسکے۔ عزیزم محمد فہد حارث حفظہ اللہ کی تحقیق اور ان کے جمع کردہ مقالات سے مکمل اتفاق نہ بھی کیا جائے لیکن اس کے باوجود یہ احساس ضرور اجاگر ہوتا ہے کہ حجاج بن یوسف کے ساتھ اردو زبان میں انصاف نہیں کیا گیا جبکہ عربی میں اس حوالے سے بہت کچھ موجود ہے اور اگر تاریخ کی امہات الکتب کا ہی جائزہ لے لیا جائے تو بہت کچھ غلط ثابت ہوتا ہے۔ محمد فہد حارث بھائی حفظہ اللہ کے یہ جمع کردہ مقالات کوئی حرفِ اخیر یا قطعی وحتمی نہیں ہیں بلکہ اصحابِ ذوق وتحقیق کے لیے غور وفکر کی ایک دعوت ہیں۔

دعاگو و دعاجو

ڈاکٹر شاہ فیض الابرار صدیقی

جامعہ ابی بکر الاسلامیہ کراچی

تائیدی تبصرے

حجاج بن یوسف تاریخ کے ان کرداروں میں سے ایک ہے جو بنو عباس کے دور میں لکھی تاریخ کی زیادتیوں کا شکار ہوئے ورنہ سو باتوں کی ایک بات ہے کہ خلافت بنو امیہ کے دوران جتنی فتوحات ہوئیں ان فتوحات کو بعد والے سنبھال بھی نہ سکے، نئی فتوحات کیا کرتے۔ بلکہ ایک اموی شہزادہ (عبدالرحمن الداخل) جو عباسی حکمرانوں سے بچتا بچاتا بے سروسامانی کے عالم میں اندلس پہنچ گیا، اس نے وہاں بھی ایسی حکومت قائم کردی جو کئی سو سال تک چلی۔۔۔۔۔

مولانا حافظ عبید اللہ ولد مولانا عبدالغفور سیالکوٹی مرحوم
سابق استاذ جامعہ فریدیہ اسلام آباد

بھیّا ہم تو تاریخی روایات کی بھول بھلیوں میں لوگوں کو الجھاتے ہی نہیں۔ کیا حجاج کا دور خیر القرون میں شامل نہیں؟ کیا نہی عن المنکر کی اعلیٰ ترین صورت برائی کو بزور بازو روک دینے کی نہیں؟ کیا اگر خیر القرون میں اشرار کی کثرت اور اخیار کی قلت ہو تو کیا وہ خیر القرون کہلائے گا؟ کیا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین کا قرانی وعدہ اگر خیر القرون

کے لیے بھی نہیں تھا تو بعد کے کسی شر القرون کے لیے تھا؟ ان سوالات کا جواب باصواب معلوم ہو جائے تو حجاج سخت گیر تو ہو سکتا ہے، ظالم و فاسق نہیں۔ خیر القرون میں فساق و فجار قرآنی مضامین کی روشنی میں مسلمانوں پر ہرگز مسلط نہیں ہو سکتے لیکن دھوکہ دے کر اور سازشیں کر کے نقصان پہنچا سکتے ہیں جیسے دورِ نبوی ﷺ میں بھی کفار و منافقین نقصان پہنچاتے رہے۔ کبھی نیک لوگ بھی کسی اعتقادی خرابی میں مبتلا ہوئے بغیر اہل باطل کے پُر فریب پروپیگنڈے کا شکار ہو کر عملاً ان کی نصرت کا ذریعہ بن کر تکلیف اٹھاتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں بجا طور پر متنبہ کیا گیا ہے:

واتقوا فتنة لا تصيبن الذين ظلموا منكم خاصة

محترم پروفیسر ظفر احمد صاحب
ابن اخت و تلمیذ علامہ رشید احمد لدھیانوی مرحوم،
ڈپٹی ڈائریکٹر کالج بہاولپور

عروہ بن مسعود الثقفی رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی کے نواسے حجاج بن یوسف الثقفی کے تمام محاسن کو نظر انداز کر کے اور ان جیسے اپنے وقت کی عظیم اسلامی سلطنت کے اصل روح رواں کی چند خامیوں کو لے کر جو تاریخ نویسوں نے ایک معلم قرآن کی شخصیت کو مسخ کیا ہے، ایک ایسا شخص کہ اس کی تقویٰ شعاری کا اعتراف کرنے سے اس کے مخالفین بھی رہ نہ سکے ہوں اسے ظلم و استبداد کے نمونے کے طور پر پیش کیا جانے لگا ہے، ان سب الزامات پر سے گرد ہٹانے کے لیے ایک بے لاگ تحقیق کی اشد ضرورت تھی۔ ویسے تو ان تاریخی روایات کے جھول سے کوئی بھی ناواقف نہیں کہ جن کے ذریعے حجاج بن یوسف کو نشانہ بنایا گیا ہے تاہم کچھ صحیح روایات کی بنیاد پر بھی زیادہ سے زیادہ یہی ثابت کیا جا سکتا

ہے کہ حجاج نے اطاعت کا حق ادا کر دیا۔

آج کے اس پر فتن دور میں کہ جس میں مسلمانوں کی جان، مال و آبرو کفار کے لیے ترنوالہ ہے، ایسے میں ہمیں ایک حجاج بن یوسف کی شدید ضرورت ہے کہ جو کسی مسلمان عورت کی فریاد کو پہنچے اور جہاں جہاں اس کی فوجیں پہنچیں اسلام کا علم بلند کرتی پھریں، ایسی شخصیت کے مثبت پہلوؤں کو مسلمانوں کے سامنے لانے اور اس پر لگائے گئے بے بنیاد الزامات سے اس کے دامن کو صاف کرنے کی کوشش پر میں محترم محمد فہد حارث سلمہ کو اس عظیم کاوش پر خراج تحسین پیش کرتا ہوں۔

أبوالولید عبدالباسط خان

اضل زادا کیڈمی، جدہ، ابن فضیلۃ الشیخ محمد عثمان السّلفی رحمہ اللہ

فاضل علوم دینیہ جامعہ ستاریہ کراچی و مدرس، حدیث محمدی مسجد، کراچی

اہل بصرہ و عراقی سبائیوں کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے امتِ مسلمہ شہادت عثمانؓ، شہادت علیؓ و حسینؓ جیسے عظیم صدمات سے دوچار ہو چکی تھی۔ حجاج جیسا منتظم ہی ان کو سیدھا کر سکتا تھا اور اس نے کر کے دکھایا۔ اور بعض اوقات سختی کے معاملات میں اونچ نیچ ہو جاتی ہے، شاید ہو بھی گئی ہو لیکن فسق و فجور سے حجاج کا دامن پاک ہے۔

نعیم گُل زر صاحب

محترم محمد فہد حارث صاحب! آپ نے ایک ایسے موضوع پر قلم اٹھایا ہے کہ جس پر برسوں سے میں ہچکچا رہا تھا۔ آپ کے موقف سے مکمل اتفاق کرتے ہوئے کہوں گا کہ جو لوگ حجاج کی طرف بے گناہوں کا کثرت سے قتل منسوب کرتے ہیں وہ ذرا یہ بھی دیکھیں

کہ مقتول کون لوگ تھے۔ بہرحال حجاج ایسے نہ تھے جیسے انھیں دنیا کے سامنے پیش کیا گیا۔ واللہ اعلم

یونس راجا صاحب

جزاک اللہ فہد حارث صاحب! حجاج کے متعلق تو صرف ایک دعا کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا کیونکہ میں اس سرزمین کا رہنے والا ہوں جو ہند میں باب الاسلام کہلاتا ہے اور مجھے فخر اس بات پر نہیں کہ داہر ہمارا راجہ تھا بلکہ آج بھی ہم فخر کرتے ہیں کہ ابنِ قاسمؒ ہمارے اجداد کا رہبر بنا فاتح بنا انھیں اس کائنات کے سب سے سچے دین سے روشناس کرایا ہمیں اللہ کے قریب کیا اپنے اخلاص و اخلاق سے اس طرح نقش کر گیا یہ دین ہمارے اجداد کے سینوں میں کہ الحمدللہ ہم آج مسلم ہیں۔ اسی لیے آج بھی دل سے دعا نکلتی ہے کہ اے اللہ! ہم آج بھی ایسے فاتح کے مفتوح بننے میں فخر محسوس کریں گے جو اپنے اخلاق و اخلاص سے اس قوم کی حالت بدل ڈالے، اے اللہ! بھیج کوئی حجاج جیسا حکمران کہ خواہ ہمارے فاتح کی صورت میں ہی کیوں نہ ہو مگر مجھے کھویا ہوا مقام لوٹا دے، اس امت کو پھر سے کامیابیوں کی معراج دکھا دے، میرا وقار لوٹا دے، مجھے اپنی عزتوں کی ناموس سکھا دے۔ آمین

تمثیل حسین صاحب

عرضِ مؤلف

عہدِ بنو امیہ وہ دور ہے جس کو مسلمانوں کی تاریخ میں ایک شاندار و درخشاں باب قرار دیا جاتا ہے۔ یہ عہد، عہدِ صحابہؓ سے شروع ہو کر تابعین اور تبع تابعین کے ادوار تک چلا جاتا ہے۔ ان ادوار کو زبانِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ''خیر القرون'' کے نام سے ملقب کیا ہے۔ اس عہد کی برکات پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک روایت جو کئی اسناد سے مروی ہیں، قطعیت کا درجہ رکھتی ہے اور اس عہد کو اسلام کے غلبہ اور ترقی کا دور بتاتی ہے۔ اس روایت کو امام بخاری اپنی صحیح کی کتاب : کتاب الاحکام میں لائے ہیں جبکہ امام مسلم نے اس کو اپنی صحیح کی کتاب: کتاب الامارۃ میں درج کیا ہے۔ امام مسلم کے الفاظ کچھ یوں ہیں:

حَدَّثَنَا هَدَّابُ بْنُ خَالِدٍ الْأَزْدِيُّ، حَدَّثَنَا حَمَّادُ بْنُ سَلَمَةَ، عَنْ سِمَاكِ بْنِ حَرْبٍ، قَالَ: سَمِعْتُ جَابِرَ بْنَ سَمُرَةَ، يَقُولُ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: لَا يَزَالُ الْإِسْلَامُ عَزِيزًا إِلَى اثْنَيْ عَشَرَ خَلِيفَةً، ثُمَّ قَالَ كَلِمَةً لَمْ أَفْهَمْهَا، فَقُلْتُ لِأَبِي: مَا قَالَ؟ فَقَالَ: كُلُّهُمْ مِنْ قُرَيْشٍ۔

حماد بن سلمہ نے سماک سے حدیث بیان کی، انھوں نے کہا: میں نے حضرت جابر بن سمرہؓ کو یہ کہتے ہوئے سنا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''بارہ خلیفوں (کے عہد) تک اسلام غالب رہے گا۔'' پھر آپ نے ایک کلمہ فرمایا جس کو میں نہیں سمجھ سکا، میں نے اپنے والد سے پوچھا: آپ ﷺ نے کیا فرمایا؟ انھوں نے کہا: آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ سب قریش میں سے ہوں گے۔''

محدثِ احناف ابو المآثر علامہ حبیب الرحمٰن الاعظمی صاحب اس حدیث کی بابت اپنی کتاب ''تبصرہ بر شہیدِ کربلا و یزید'' میں لکھتے ہیں:

''دیکھیے یہ حدیث جس طرح اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ مطلق خلافت کا انحصار صرف پانچ خلفاء میں نہیں ہے، اسی طرح یہ بھی پکار کر کہہ رہی ہے کہ بارہ خلفاء کے وجودِ ظہور تک اسلام باعزت و شوکت اور دین قائم رہے گا، اور ظاہر ہے کہ یہ ان خلفاء کے دینی شعور، احساسِ ذمہ داری اور فرائضِ خلافت کی انجام دہی میں پوری مستعدی کا نتیجہ ہوگا۔ پس ایسی خلافت جو چاہے راشدہ نہ ہو، مگر دین کا قیام اور اسلام کی عزت و شوکت اس سے وابستہ ہو، کون کہہ سکتا ہے کہ وہ شرعاً مطلوب و محمود نہیں ہے، اور کون کہہ سکتا ہے کہ اقامتِ دین اور اظہارِ شوکتِ اسلام کے لیے اس کی طلب و تمنا، مقامِ ولایت کے منافی ہو۔[۱]

گویا عہدِ رسالت ﷺ اور عہدِ خلفائے اربعہ و سیدنا حسنؓ و سیدنا معاویہؓ کے بعد عہدِ بنو امیہ مسلمانوں کا تیسرا عہدِ مبارک تھا۔ انھیں تینوں ادوار میں مسلمان دینی اور دنیوی سعادت و فلاح کی معراج کو پہنچے اور انھیں ہر طرح کی روحانی و مادی فتوحات نصیب ہوئیں۔ عہدِ اموی میں جہادِ اسلامی کا غلغلہ پورے زور و شور سے بلند ہوا، اسلامی سلطنت کی توسیع ہوئی، دینی علوم و فنون کی حفاظت و اشاعت کا کام ہوا جس کے ذیل میں نئے نئے علوم و فنون کی بنیاد رکھی گئی۔ غرض ان تمام برکات و فیوض کو، جن کا

۱۔ تبصرہ بر ''شہیدِ کربلا و یزید''، صفحہ ۲۰

عہدِ رسالت اور عہدِ خلفائے اربعہ و سیدنا حسنؓ و سیدنا معاویہؓ کے دور میں آغاز ہوا تھا، عہدِ بنو امیہ میں انھیں تکمیل تک پہنچایا گیا۔ یہ عہد امن و آشتی، عدل و انصاف اور علم و حکمت سے مزین تھا جس میں مسلمانوں کی بزرگ ترین شخصیات نے جانکاہ تکلیف اٹھا کر دینی علوم وفنون کی آبیاری کی اور جن کے فیض و برکات سے آج تک یہ دینی علوم و فنون زندہ وجاوید ہیں۔

درحقیقت اقوامِ عالم میں جتنی شاندار تاریخ مسلمانوں کی ہے، اس دنیا میں کوئی اور قوم اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتی، اسی لیے بعض اسلام دشمن عناصر نے عہدِ بنو امیہ کے خلاف جھوٹے پروپیگنڈے اور کذب بیانیوں کا انبار لگا کر اس شاندار وتابناک عہد کو نہایت تاریک بنا کر پیش کرنا چاہا اور ساتھ ہی بعض ضعیف روایات کی بناء پر اس عہد کو ''مذموم ملوکیت'' کا ثمرہ قرار دے کر خلفائے بنوامیہ اور ان کے عمال کو جی بھر کر مطعون کیا۔ اس سلسلے میں سب سے مشہور روایت جو پیش کی جاتی ہے وہ حدیثِ سفینہؓ ہے جس کے تحت خلافتِ راشدہ کو چار تک محدود کرکے بنو امیہ کو ملوکیت کا بانی قرار دیا جاتا ہے۔ یہ روایت کچھ یوں ہے کہ سیدنا سفینہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت میں خلافت تیس سال رہے گی، پھر اس کے بعد ملک ہوگا۔ سعید بن جمہان کا بیان ہے کہ پھر سفینہؓ نے مجھ سے فرمایا تو ابو بکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ کی خلافت کو دیکھ لے تو تجھے صاف نظر آجائے گا کہ یہ تیس سال ہوتے ہیں اور ایک روایت میں مزید اضافہ یہ بھی ہے کہ اس کے ساتھ حسنؓ کے چھ ماہ بھی شمار کرلو۔ سعید بن جمہان راوی کہتے ہیں کہ میں نے سفینہؓ سے عرض کیا کہ بنو امیہ تو یہ گمان کرتے ہیں کہ خلافت ان کے پاس ہے۔ وہ بولے بنو زرقاء جھوٹ بولتے ہیں، بلکہ وہ تو بادشاہ ہیں اور بادشاہ بھی بدترین بادشاہ۔ (ترمذی)

یہ ایک ایسی روایت ہے جس پر خلافت راشدہ اور بنو امیہ کی ملوکیت کی پوری عمارت قائم ہے۔ آج تک جس شخص نے بھی خلافت و ملوکیت پر کچھ قلم اٹھایا اس

نے سب سے اوّل اس روایت کو پیشِ نظر رکھا ہے اور اس روایت کو کچھ اس طرح سے پیش کیا ہے گویا یہ روایت ایک ایسا مسلّمہ اصول ہے کہ جسے دورِ صحابہ سے آج تک ہر فرد تسلیم کرتا آیا ہے۔ جبکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے کیونکہ خیر القرون کے اپنے لوگوں نے اس روایت کو اپنے عمل سے قابل احتجاج نہ سمجھا۔ اگر یہ تیس سالہ خلافت والی روایت درست ہوتی اور صحابہؓ کے مابین اس کی صحت مُسلّم ہوتی تو سارے کے سارے صحابہؓ پر سیدنا علیؓ کی خلافت کی بیعت نہ صرف واجب ہوجاتی بلکہ وہ جنگ جمل وصفین میں سیدنا علیؓ کا ساتھ دیتے۔ کیونکہ یہ روایت ان کی خلافت کے حق ہونے پر دلیل ہے لیکن اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ بقول امام ابن تیمیہ صحابہؓ کی آدھی یا اس سے کچھ کم یا اس سے کچھ زیادہ اکثریت نے سیدنا علیؓ کی بیعت نہیں کی اور نہ ہی جنگ جمل وصفین میں انکا ساتھ دیا۔ حتیٰ کہ سیدنا سفینہؓ نے بھی جنگ جمل وصفین میں حصہ نہیں لیا۔ حالانکہ باقی صحابہؓ کا تو چھوڑیئے لیکن کم از کم سیدنا سفینہؓ کو تو میدان جمل وصفین میں آگے آگے ہونا چاہیے تھا۔ گویا صحابہؓ کے نزدیک تو یہ روایت ثابت تھی ہی نہیں۔ اگر یہ روایت صحیح تھی تو سیدنا سفینہؓ نے امیر المومنین معاویہؓ اور ان کے فرزند یزید بن معاویہؒ کی بیعت کیسے کرلی، جبکہ سیدنا علیؓ اور سیدنا حسنؓ کے زمانے میں وہ الگ بیٹھے رہے۔ محدثین کے ایک گروہ کا ایک اصول ہے کہ اگر ایک راوی حدیث بیان کرے اور خود اس کا عمل اس حدیث کے خلاف ہو تو وہ اس روایت کے مشتبہ ہونے کی دلیل ہوتی ہے، سو اس لحاظ سے بھی یہ روایت ناقابل قبول ہے۔

اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس روایت سے متعلق علماء کی تصریحات اور اصول الحدیث کے تحت گفتگو کرلی جائے۔ علامہ ابن خلدون اپنی تاریخ کی جلد دوم کے آخر میں سیدنا معاویہؓ کی خلافت کے ضمن میں بحث کرتے ہوئے اس روایت کے غیر صحیح ہونے کی بابت اشارہ کرتے ہیں:

''مناسب یہ ہے کہ معاویہؓ کی حکومت اور ان کے حالات ان سے ماقبل خلفاء کی حکومت و واقعات کے ساتھ ذکر کیے جائیں کیونکہ شرف و فضل، عدالت وصحابیت میں وہ ان ہی کے بعد ہیں اور اس بارے میں حدیث ''میرے بعد خلافت تیس سال رہے گی'' کی طرف توجہ نہیں کی جائے گی کیونکہ وہ صحیح نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ معاویہؓ اپنے پیش رو خلفاء کے ساتھ شامل ہیں۔''

قاضی ابو بکر ابن العربی مالکی متوفی ۵۴۳ اپنی کتاب'' العواصم من القواصم'' میں صفحہ ۲۰۱ میں اس روایت کے غیر صحیح ہونے کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حدیث سفینہؓ صحیح نہیں اور اگر یہ صحیح بھی ہوتی تو اس صلح کے معارض ہے جس پر سب کا اتفاق ہو چکا لہٰذا اس صلح کی جانب رجوع کرنا واجب ہے۔''

مشہور سلفی عالم علامہ محب الدین خطیب المصری ''العواصم من القواصم'' کے حاشیہ میں رقم طراز ہیں:

''حدیث سفینہؓ صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ سفینہؓ سے یہ روایت نقل کرنے والا سعید بن جمھان ہے اور اس کے سلسلہ میں محدثین میں اختلاف ہے۔ بعض محدثین کہتے ہیں اس میں کوئی برائی نہیں، بعض کہتے ہیں ثقہ ہے لیکن امام ابوحاتم رازی فرماتے ہیں کہ ایک شیخ ہے لیکن اس کی حدیث کو ہرگز حجت نہ مانا جائے اور سعید بن جمھان سے نقل کرنے والا حشرج بن نباتہ الواسطی ہے جسے اگرچہ بعض نے ثقہ کہا ہے لیکن نسائی کہتے ہیں یہ قوی نہیں۔ عبداللہ بن احمد بن حنبل نے اس روایت کو سوید الطحان سے روایت کیا ہے۔ حافظ ابن حجر تقریب التہذیب میں لکھتے ہیں یہ حدیث ضعیف ہے اور یہ روایت اس صحیح

حدیث کے خلاف ہے جو صحیح مسلم کتاب الامارت میں جابر بن سمرہؓ سے مروی ہے کہ میں اپنے والد کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا یہ امر (خلافت) اس وقت تک منقطع نہ ہوگا جب تک کہ بارہ خلیفہ نہ گزر جائیں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آہستہ سے کوئی بات فرمائی جو میں نہ سن سکا۔ میں نے اپنے والد سے دریافت کیا۔ انھوں نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا کہ یہ بارہ خلفاء قریش میں سے ہوں گے۔ آپ اس حدیث کو بخاری میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔

محب الدین خطیب آگے مزید لکھتے ہیں:

”یہ ۱۲ خلفاء والی روایت مجمع الزوائد جلد ۵ صفحہ ۱۹۰، مسند احمد جلد ۵ صفحہ ۸۶، ۸۷ پر تین سندات سے، صفحہ ۸۸، ۸۹، ۹۰ پر تین سندات سے، صفحہ ۹۲ پر تین سندات سے، صفحہ ۹۳ پر دو سندات سے، صفحہ ۹۴، ۹۵ پر دو سندات سے صفحہ ۹۷ پر دو سندات سے صفحہ ۹۸ پر تین سندات سے، صفحہ ۹۹ پر تین سندات سے، صفحہ ۱۰۰، ۱۰۱ پر دو سندات سے، صفحہ ۱۰۷ پر دو سندات سے، صفحہ ۱۰۸ پر دو سندات سے اور مسند ابی داؤد طیالسی میں حدیث نمبر ۷۶۷ اور حدیث نمبر ۱۲۷۸ موجود ہے۔“ (۱)

قارئین کرام آپ نے دیکھا کہ محب الدین خطیب مصری نے حوالہ جات پر کتنا زور صرف کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام انھوں نے بلاوجہ انجام نہیں دیا ہے بلکہ صرف یہ دکھانے کے لیے انجام دیا ہے کہ جس تیس سالہ روایت کے بل بوتے پر خلافت راشدہ اور ملوکیت کے چکر چلائے گئے ہیں جہاں وہ ضعیف ہے وہاں وہ صحیح احادیث کے بھی معارض ہے۔ پھر یہ بھی یاد رہے کہ اس بارہ ۱۲ خلفاء والی روایت کو

۱۔ حاشیہ، العواصم من القواصم، صفحہ ۲۰۱۔۲۰۲

امام ترمذی بھی اپنی کتاب میں لائے ہیں اور اس بارہ ۱۲ خلفاء والی روایت کو صحیح اور تیس سالہ والی روایت کو حسن کہا ہے اور اہل علم یہ بات جانتے ہیں کہ ترمذی جس روایت کو مطلق حسن کہیں تو وہ ان کے نزدیک ضعیف کے درجہ میں بھی ہوسکتی ہے جیسا کہ حافظ ابو یحییٰ نورپوری نے شمارہ السنہ میں اپنے مضمون میں بدلائل ثابت کیا ہے۔سو امام ترمذی کے نزدیک بھی اس روایت کے ضعف کا احتمال موجود ہے۔

اس تیس سالہ روایت کی تردید سنن ابوداؤد کی ایک اور حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ جو انھوں نے ابو بکرؓ سے روایت کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک روز ارشاد فرمایا کہ اگر تم میں سے کسی نے کوئی خواب دیکھا ہو تو بیان کرو۔ ایک شخص بولا یا رسول اللہ ﷺ میں نے دیکھا کہ آسمان سے ایک ترازو آیا۔ اس میں آپ ﷺ اور ابو بکرؓ کو تولا گیا تو آپ ﷺ بھاری رہے، پھر ابوبکرؓ اور عمرؓ کو تولا گیا تو ابو بکرؓ بھاری رہے پھر عمرؓ اور عثمانؓ کو تولا گیا تو عمرؓ بھاری رہے، اس کے بعد ترازو اٹھالی گئی۔ ابو بکرؓ کا بیان ہے کہ ہم نے نبی ﷺ کے چہرہ مبارک پر کچھ ناگواری کے اثرات دیکھے لیکن آپ ﷺ نے لوگوں کی جانب متوجہ ہوکر فرمایا:'' یہ خلافت نبوت ہے، پھر اللہ تعالیٰ جس کو چاہے گا خلافت عطا فرمائے گا۔''

گویا خلفائے بنو امیہ کی حکومتیں بھی بالکل اسی طرح خلافتیں تھیں جیسا کہ خلفائے اربعہ و سیدنا حسنؓ و سیدنا معاویہؓ کی حکومتیں خلافت تھیں۔ اس بات کو ایسے سمجھیں کہ اسلامی حکومت جو خلافت کے منہج پر قائم کی گئی تھی، اس کے دو طریقے رائج ہوئے۔ پہلا خلافت علیٰ منہاج النبوۃ جو اعلیٰ درجہ کا معیاری و مثالی اندازِ حکمرانی تھا جبکہ دوسرا خلافت علیٰ سبیل التوارث یعنی موروثی حکومتیں۔ ثانی الذکر طریقۂ حکومت میں بھی اصولاً و شرعاً کوئی قباحت نہیں بشرطیکہ وہ حاکمیتِ الٰہی، عدل اور امانت کے تصورات پر استوار ہو جیسا کہ داؤد علیہ السلام اور ان کے بعد سلیمان علیہ السلام کا دورِ حکومت۔ تاہم اس بات سے مجالِ انکار نہیں کہ خلافتِ راشدہ کے ادوار میں جو برکات

اور ثمرات تھے وہ امتدادِ زمانہ کے ساتھ خلافتِ بنو امیہ میں اس طور سے نہ رہے البتہ رشد و خیر کا پہلو عہدِ بنو امیہ میں بھی غالب رہا تب ہی زبانِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس عہد کو خیر القرون کا نام دیا۔

دورِ بنو امیہ کو عموماً سیدنا معاویہؓ کے دور سے شروع کیا جاتا ہے جو کہ ۴۱ھ سے شروع ہوکر آخری اموی خلیفہ مروان ثانی کے ۱۳۲ھ میں قتل پر ختم ہوجاتا ہے۔ دورِ بنو امیہ دراصل دو ادوار کا مرکب و جامع ہے، دورِ سفیانیہ اور دورِ مروانیہ۔ سیدنا معاویہؓ کے پوتے معاویہ بن یزید بن معاویہؒ کے خلافت سے از خود دستبردار ہوجانے کے بعد سیدنا ابوسفیانؓ کی اولاد میں سے خلافت نکل کر سیدنا مروانؓ کی اولاد میں منتقل ہوجاتی ہے جو کہ مروان ثانی تک اسی خاندان میں رہتی ہے۔ بنو امیہ کی خلافت تقریباً اکانوے (۹۱) برس قائم رہی جس کے دوران چودہ (۱۴) خلفاء برسراقتدار آئے:

۱۔ سیدنا معاویہ بن ابوسفیانؓ: ۴۱ھ تا ۶۰ھ (بیس سال)

۲۔ یزید بن معاویہؒ (یزید اول): ۶۰ھ تا ۶۴ھ (تین سال آٹھ ماہ چودہ دن)

۳۔ معاویہ بن یزیدؒ (معاویہ ثانی): ۶۴ھ تا ۶۴ھ (ایک ماہ گیارہ دن)

۴۔ سیدنا مروان بن الحکمؓ: ۶۴ھ تا ۶۵ھ (آٹھ ماہ دو دن)

۵۔ امیر عبدالملک بن مروانؒ: ۶۵ھ تا ۸۶ھ (اکیس سال ڈیڑھ ماہ)

۶۔ امیر ولید بن عبدالملکؒ: ۸۶ھ تا ۹۶ھ (نو سال آٹھ ماہ)

۷۔ سلیمان بن عبدالملکؒ: ۹۶ھ تا ۹۹ھ (دو سال چھ ماہ پندرہ دن)

۸۔ امیر عمر بن عبدالعزیز: ۹۹ھ تا ۱۰۱ھ (دو سال پانچ ماہ پانچ دن)

۹۔ یزید بن عبدالملکؒ (یزید ثانی): ۱۰۱ھ تا ۱۰۵ھ (چار سال تیرہ دن)

۱۰۔ ہشام بن عبدالملکؒ: ۱۰۵ھ تا ۱۲۵ھ (انیس سال نو ماہ نو دن)

۱۱۔ ولید بن یزیدؒ (ولید ثانی): ۱۲۵ھ تا ۱۲۶ھ (ایک سال تین ماہ)

۱۲۔ ابوخالد یزید بن ولیدؒ (یزید ثالث): ۱۲۶ھ تا ۱۲۶ھ (دو ماہ دس دن)

۱۳۔ ابراہیم بن ولید: ۱۲۶ھ تا ۱۲۷ھ (چند دن)

۱۴۔ مروان الحمار (مروان ثانی): ۱۲۷ھ تا ۱۳۲ھ (پانچ سال دس دن)

ان چودہ خلفائے بنو امیہ میں وہ خلفاء بھی شامل ہیں جن کے ادوار میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلام کے غلبہ کی پیشین گوئی فرمائی ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں بارہ خلفاء والی روایت پر کافی مفصل بحث کی ہے اور آخر میں تصریح کی ہے کہ اس حدیث میں جن خلفاء کا ذکر ہے وہ خلفائے اربعہ، سیدنا معاویہؓ، یزید بن معاویہ، عبدالملک بن مروان، ولید بن عبدالملک، سلیمان بن عبدالملک، یزید ثانی، ہشام بن عبدالملک اور ولید ثانی رحمہم اللہ شامل ہیں۔ تاہم مُلّا علی قاری نے ولید ثانی کے بجائے عمر بن عبدالعزیزؒ کو رکھ کر ان بارہ خلفاء کی فہرست مکمل کی ہے(شرح فقہ اکبر صفحہ ۸۲)۔ شیخ عبدالعزیز ''شرح العقیدۃ الطحاویہ'' میں ''خلفاء اثنا عشرۃ'' کے متعلق حدیث کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

الاثناعشر الخلفاء الراشدون الاربعة ومعاوية وابنه يزيد و عبدالملك بن مروان و اولاده الاربعة و بينهم عمر بن عبدالعزيز۔

''اور بارہ خلفاء میں چاروں خلفائے راشدین، سیدنا معاویہؓ اور ان کے بیٹے یزید، عبدالملک بن مروانؒ اور ان کے چاروں بیٹے اور ان کے درمیان عمر بن عبدالعزیزؒ شامل ہیں۔''

الغرض اموی خلافت ایک طرح سے خلافتِ راشدہ کا تتمہ و تکملہ تھی جس پر قرآن و حدیث کی شہادتوں کے علاوہ سب سے بڑی شہادت صحابہ کرامؓ کی اس سے وابستگی و تعاون ہے۔ پوری کی پوری پہلی صدی ہجری اور دوسری صدی ہجری کا عشرۂ اوّل صحابہ کرامؓ کے وجودِ مسعود سے منور رہا۔ اس باب میں خلافتِ راشدہ اور خلافتِ امویہ میں کوئی فرق نہیں۔ صحابہ کرامؓ دونوں ادوارِ خلافت میں نہ صرف موجود تھے

بلکہ حکومت کی طرف سے مختلف عہدوں پر سیاسی خدمات بھی انجام دے رہے تھے۔ ان میں عشرہ مبشرہ بھی شامل تھے تو بدری صحابہ بھی، حدیبی بھی تھے تو فتح مکہ کے موقع پر ایمان لانے والے صحابہ بھی شامل تھے۔ سیدنا معاویہؓ و یزید بن معاویہؒ کے دور میں تو بکثرت عہدے صحابہ کرامؓ کے پاس تھے تاہم جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا اور صحابہ کرامؓ ایک ایک کرکے دنیا کو خیرباد کہتے چلے گئے، حکومتی مناصب میں ان کی جگہ تابعین نے لے لی۔ البتہ جب تک صحابہ کرامؓ زندہ رہے انھوں نے اموی خلفاء سے بھی اسی طرح تعاون کیا اور ان کی طرف سے اسی طور سے سیاسی خدمات سرانجام دیتے رہے جس طور سے وہ خلفائے اربعہ کے زمانے میں سیاسی خدمات انجام دیا کرتے تھے۔ ان اموی خلفاء اور ان کی طرف سے مقرر کردہ عمال کی زیر نگرانی صحابہ کرامؓ تمام جنگی و جہادی محاذوں پر مصروفِ عمل رہے چاہے وہ ایران و خراسان کے محاذ ہوں یا پھر رومی و بازنطینی سلطنت کے خلاف کی گئی لشکر کشی ہوں۔ ان جہادی سرگرمیوں کے لیے انھوں نے اموی خلفاء کی طرف سے پیش کردہ تمام عہدوں کو قبول کیا چاہے وہ برّی فوجوں کی سپہ سالاری ہو یا پھر سمندروں کی امیر البحری۔ اسی طرح صوبوں کی گورنری، صدقات کی عمالی اور قضاء و افتاء تمام شعبوں پر صحابہ کرام اموی خلفاء سے بھرپور تعاون کرتے آئے۔ اموی خلفاء کے ساتھ صحابہ کرامؓ کا یہ تعاون و مشارکت ثابت کرتا ہے کہ ان کی نظروں میں امرائے بنو امیہ اسی طور کے جائز خلفاء تھے جس طور کہ خلفائے اربعہ تھے اور اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیک اسلامی خلافت افراد و اشخاص اور ان کی حیثیتوں اور مرتبوں پر منحصر نہیں تھی بلکہ وہ اصولِ اسلام اور اقدارِ خلافت پر استوار تھی۔

یہی وجہ تھی کہ اموی خلافت میں اسلام کا نورِ آفتاب آدھی سے زیادہ معلوم دنیا پر چھا گیا اور صرف چند دہائیوں میں مسلمانوں کی تعداد کروڑوں تک پہنچ گئی۔ ترکستان، چین، افریقہ، ہندوستان، یورپ وغیرہ غرض دنیا کے ہر متمدن خطے میں

اسلام کا پیغام پہنچ گیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دورِ مسعود اور دورِ صحابہؓ سے جو وراثت اموی خلفاء کو ملی تھی، اسے انھوں نے اپنی کمائی سے اضعافاً و مضاعفۃً کر دیا۔ خلافتِ یزید بن معاویہؒ کے دور میں افریقہ کے بربر قبائل تقریباً سب کے سب مشرف بہ اسلام ہوگئے تھے۔ ہندوستان میں محمد بن قاسمؒ کی جہادی مساعی کے نتیجے میں دیکھتے ہی دیکھتے کئی بلاد میں اسلام پہنچ گیا۔ قتیبہ بن مسلم کے ذریعے چین کی سرحدوں تک اسلام پہنچا تو طارق بن زیاد کے قدموں نے اسے ہسپانیہ تک راہ دکھائی۔ المختصر خلافتِ اسلامیہ کے اس مبارک دور میں اسلام کی اشاعت روزافزوں ہوئی اور اتنی کثیر تعداد میں غیر مسلموں نے اسلام قبول کیا کہ عقل حیران و ششدر رہ جاتی ہے۔ اب اگر اس مبارک دور کے حکمران ظالم و فاسق تھے تو انھیں یا ان کے عمال کو دیکھ کر اتنی کثیر تعداد میں لوگ مشرف بہ اسلام کیسے ہوگئے؟ اسلام کا عملی نمونہ دیکھے بغیر اور زاہد و متقی مسلم حکمرانوں کی تبلیغی مساعی کے بغیر لوگوں کو اسلام کی طرف کشش و رغبت کیسے ہوئی؟ اس مبارک دور میں اس سرعت کے ساتھ اسلام کا پھیلنا اور بکثرت غیر مسلموں کا شرح صدر کے ساتھ اسلام قبول کرلینا، اس حقیقت کی واضح دلیل ہے کہ یہ اموی خلفاء و عمال متقی، رعایا پرور اور اعلیٰ کردار کے حامل تھے جن کے کردار و اعمال اور طریقۂ حکومت سے متاثر ہوکر غیر مسلم حلقہ بگوش اسلام ہوتے گئے۔

اموی دور میں مسلم تہذیب و تمدن اپنے عروج کو پہنچا، کئی شعبوں میں مسلمانوں نے ترقی کی۔ امیر عبدالملک بن مروانؒ کے دور میں پہلے اسلامی سکّہ کا اجراء ہوا، اس سے قبل عرب میں ایرانی درہم اور رومی دینار چلتے تھے جس کی وجہ سے مسلمانوں کی اقتصادی ترقی پر ایک حد تک یہ غیر مسلم قدغن لگا سکتے تھے۔ امیر حجاج بن یوسف ثقفیؒ کے زیر نگرانی عراق میں اسلامی ٹکسال قائم کی گئی اور اسلامی سکّے جاری کیے گئے جن کی ایک طرف ”قل ھو اللہ احد“ اور دوسری طرف ”لا الہ الا اللہ“ لکھا ہوتا تھا۔[۱]

۱۔ ابن اثیر، جلد ۴، صفحہ ۱۶۱۔

اسی طرح امیر عبدالملک بن مروانؒ نے اپنے دور میں عربی زبان کو دفتری زبان قرار دیا اور تمام دیوانوں کو عربی میں منتقل کروایا۔(۱)

امیر عبدالملک بن مروانؒ کے بعد ان کے صاحبزادے ولید بن عبدالملکؒ کا دورِ خلافت آیا تو اسلامی مملکت اپنے انتہائی عروج پر پہنچ گئی۔ اس سے بڑی اسلامی مملکت اور شاندار حکومت اس کے بعد مسلمانوں کو کبھی دیکھنے کو نہ ملی۔ امیر ولیدؒ نے اسلامی فوجی نظام کو بے انتہا ترقی دی جس کی وجہ سے ایک ہی وقت میں اسلامی فوجیں ہندوستان سے لےکر چین تک اور افریقیہ سے لےکر ہسپانیہ تک بلا کسی رکاوٹ کے برسرِ پیکار تھیں۔ سیدنا معاویہؓ نے اپنے دور میں جہاز سازی کی جس صنعت کا اجراء کیا تھا، ولید بن عبدالملکؒ نے اپنے دور میں اس کو چار چاند لگا دیئے۔ ولیدؒ کی معاونت و سرپرستی کے زیرِ اثر امیر موسیٰ بن نصیرؒ نے تیونس میں جہاز سازی کا جو کارخانہ قائم کیا تھا، اس میں صرف ولیدؒ کے زمانے میں ہی ۱۰۰ جہاز تیار کردیئے گئے تھے۔ طبری ولید بن عبدالملکؒ کے دور میں صراحت سے لکھتے ہیں کہ ۸۸ ہجری میں ولید نے تمام مما لک محروسہ میں سڑکیں درست کروائیں اور ان پر سنگِ میل نصب کروائے۔ تمام راستوں پر کنویں بنوائے اور مختلف بلاد و امصار میں نہریں جاری کروائیں۔ پورے ملک میں جابجا مسافروں کی سہولت کے لیے مہمان خانے قائم کیے۔ ولید بن عبدالملکؒ وہ پہلے مسلم حکمران تھے جنھوں نے مسلم بلاد میں شفا خانے بنوائے۔ اس سے پہلے اسلامی حکومت میں سرکاری شفا خانوں کا رواج نہ تھا۔(۲) طبری لکھتے ہیں کہ ولید بن عبدالملکؒ کا یہ کارنامہ قابلِ فخر ہے کہ اس نے تمام مما لکِ اسلامیہ میں معذور، ناکارہ اور اپاہج لوگوں کے روزینے مقرر کرکے انھیں بھیک مانگنے کی ممانعت کردی اور ساتھ ہی اندھوں کی رہنمائی اور معذوروں کی خدمت کے لیے آدمی مقرر کیے۔ ولیدؒ بازار کے نرخ بھی قابو میں رکھتا تھا اور خود بازاروں میں جا کر چیزوں کی قیمت دریافت کرکے

۱۔ ابن اثیر، جلد ۴، صفحہ ۵۲۲۔ ۲۔ یعقوبی، جلد ۲، صفحہ ۳۴۸۔

ان کے نرخ کم کرواتا تھا۔[1] اسی ذیل میں طبری لکھتے ہیں کہ ولید بن عبدالملک قرآن کی تعلیم کی طرف خصوصی توجہ دیتا تھا۔ وہ ہمیشہ لوگوں کو حفظِ قرآن کی ترغیب دیتا تھا اور جو لوگ حفظ کرتے تھے، ان کو عطیات سے نوازتا تھا اور جو لوگ تعلیمِ قرآن سے غفلت برتتے تھے، انھیں سزا دیتا تھا۔ حجاج بن یوسفؒ نے اسی کے زمانے میں اہل عجم کے لیے قرآن پر نقطے اور اعراب لگوانے کا کام کیا تھا۔[2] امیر ولیدؒ کے عہد میں ہی مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں اس دور کی سب سے بڑی توسیع ہوئی۔ امیر ولیدؒ کے حکم سے عمر بن عبدالعزیزؒ نے فقہاء و علماء مدینہ قاسم بن محمد بن ابی بکر، سالم بن عبداللہ، ابو بکر بن عبدالرحمٰن، عبیداللہ بن عبداللہ، خارجہ بن زید اور عبداللہ بن عبداللہ بن عمر رحمہم اللہ کی موجودگی میں مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پرانی عمارت گروا کر ان بزرگوں کے ہاتھوں سے نئی عمارت کی داغ بیل ڈلوائی۔[3] امیر ولیدؒ نے بڑے اہتمام اور ذوق وشوق سے مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعمیر کا کام شروع کروایا، ایک ایک نقش پر کاریگروں کو مزدوری کے علاوہ ۳۰ درہم انعام دیا جاتا تھا۔[4] صرف قبلہ رخ دیوار اور اس کے طلائی کام پر ۴۵۰۰۰ اشرفی خرچ آیا۔[5] تمام عمارت کو پتھر کی بنایا گیا جبکہ در و دیوار اور چھت پر اعلیٰ درجہ کی میناکاری کی گئی، مسجد کے ساتھ ہی ایک فوارہ بھی تعمیر کیا گیا۔ اس پوری توسیع میں تقریباً ۳ سال کا وقت لگا یہاں تک ۹۱ ہجری میں مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توسیع کا کام مکمل ہوا اور ولید دمشق سے مدینہ خود اس کے ملاحظہ کے لیے آیا۔ یہاں آکر کام سے مطمئن ہو کر مسجد کی نگرانی اور دیکھ بھال کے لیے خُدّام مقرر کیے[6] اور اس تعمیر و توسیع کی خوشی میں اہل مدینہ میں نقد روپیہ اور طلائی اور نقرئی ظروف

۱۔ طبری ۸ /۱۷۱، تاریخ الخلفاء السیوطی، صفحہ ۲۲۵۔

۲۔ البدایہ و النہایہ، جلد ۹ تحت الترجمۃ حجاج بن یوسف ثقفیؒ۔

۳۔ طبری، ۸ /۱۷۴۔

۴۔ خلاصۃ الوفا، صفحہ ۱۳۹۔

۵۔ ایضاً، صفحہ ۱۴۰۔

۶۔ ابن اثیر، جلد ۴ صفحہ ۲۰۴۔

تقسیم کیے۔(۱) یہ تمام کام عمر بن عبدالعزیز اور فقہائے مدینہ کی زیرِ نگرانی کروائے گئے تاکہ کسی بھی خلافِ شرع چیز پر ان کی طرف سے ٹوک وتنبیہ آسکے۔ ساتھ ہی قبر ِنبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حجرۂ عائشہؓ کی مرمت کا بھی حکم دیا جس پر امیر ولیدؒ کے حکم سے عمر بن عبدالعزیزؒ نے حجرے کے چاروں طرف دوہری دیوار تعمیر کروا دی تاکہ اگر ایک دیوار کمزور پڑے تو دوسری اس کو سہارا دے سکے۔(۲) سیدنا عمرؓ کے دور کے بعد ولید بن عبدالملک کا دور فتوحات کے سلسلے میں تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ خوش قسمتی سے امیر ولیدؒ کو حجاج بن یوسفؒ ثقفی جیسا مدبر گورنر نصیب ہوگیا جس کے ماتحت محمد بن قاسم، قتیبہ بن مسلم، موسیٰ بن نصیر اور مسلمہ بن عبدالملک نے اپنے گھوڑوں کے سموں تلے یورپ اور ایشیا کے میدانوں کو روند ڈالا۔ ولید کے دور میں ہندوستان، ترکستان اور اندلس کی فتوحات ہوئیں۔(۳)

امیر ولید بن عبدالملکؒ کے بعد ان کے بھائی سلیمان بن عبدالملکؒ کا دور آتا ہے۔ سلیمان بن عبدالملک کے خیر کے کاموں کی وجہ سے لوگ اس کو ''مفتاح الخیر''یعنی بھلائی کی کنجی کے نام سے یاد کرتے تھے۔(۴) مکہ المکرمہ میں پانی کی کافی قلت ہوجاتی تھی، اس پریشانی کے سدِ باب کے لیے سلیمان بن عبدالملکؒ نے مکہ میں میٹھے پانی کا ایک چشمہ جاری کروایا۔ اس کام کے لیے کوہِ ثبیر کے دامن میں ایک بڑا تالاب بنایا گیا جس سے سیسہ کے نل کے ذریعے حرم میں پانی لایا گیا جو زمزم کے کنویں کے درمیان سنگ رخام کے فوارے میں گرتا تھا۔ اس چشمہ کی وجہ سے مکہ میں میٹھے پانی کی افراط ہوگئی۔(۵) اسی طرح شام میں شہر رملہ کی تعمیر بھی سلیمان بن عبدالملک کا ایک قابلِ فخر کارنامہ ہے۔ دراصل یہ شہر بسایا تو ولید بن عبدالملکؒ نے تھا

۱۔ کتاب العیون والحدائق، صفحہ ۱۱۔ ۲۔ ایضاً، صفحہ ۹۔
۳۔ معجم البلدان، جلد ۱، صفحہ ۲۶۲۔ ۴۔ تاریخ الخلفاء لسیوطی، صفحہ ۲۲۴۔
۵۔ یعقوبی، جلد ۲، صفحہ ۵۳۵۔

لیکن ولید نے یہاں صرف چند عمارتیں بنوا کر اس کو چھوڑ دیا تھا۔ سلیمان بن عبدالملکؒ نے اس شہر کو بہت ترقی دی، یہاں بہت سی عمارتیں، جامع مسجد اور تالاب بنوائے اور جو لوگ یہاں منتقل ہونا چاہتے تھے، سلیمان نے ان کو حکومتی خرچ پر گھر بنوا کر دیئے۔ (۱)

سلیمان بن عبدالملکؒ کے بعد عمر بن عبدالعزیزؒ کا دور آتا ہے۔ ان کے دور میں ہونے والی اصلاحات کسی سے مخفی نہیں سو ان کا اعادہ کرنا طوالت کا باعث ہوگا۔ ان کی خدمات کی بابت یہ لکھ دینا ہی کافی ہے کہ کٹر بنو امیہ مخالفین بھی عمر بن عبدالعزیز کی اصلاحی مساعی کا دم بھرتے ہیں۔ عمر بن عبدالعزیز کے بعد یزید بن عبدالملک اور اس کے بعد اس کا بھائی ہشام بن عبدالملکؒ برسر اقتدار آیا۔ ہشام بن عبدالملکؒ کا شمار بنو امیہ کے ان تین ممتاز خلفاء میں ہوتا ہے جنھوں نے تدبر و سیاست کا نقش تاریخ میں ثبت کر دیا۔ علامہ ابن کثیرؒ ہشام بن عبدالملکؒ کی بابت لکھتے ہیں کہ وہ بہت مدبر خلیفہ تھا، سلطنت کے چھوٹے سے چھوٹے معاملات اس کی نگاہوں سے مخفی نہ رہتے تھے، تحمل و بردباری اس کی امتیازی خصوصیات تھیں۔ (۲) ہشام بن عبدالملک نے اپنے عہدِ حکومت میں فوج کے شعبہ کو بہت ترقی دی۔ کئی اہم و حساس جگہوں پر مستحکم اور مضبوط قلعے قائم کیے۔ بحری بیڑے کی ترقی کے لیے شمالی افریقہ میں جہاز سازی کے مزید نئے کارخانے بنوائے۔ (۳) ملکی مصنوعات کی صنعت کو ترقی دی جس میں سر فہرست ریشمی کپڑوں کی صنعت تھی۔ لوگوں کے لیے روزگار کا انتظام کیا اور عوام کا طرزِ زندگی مزید بہتر بنایا۔ (۴) ہشام نے اپنے دور میں کئی نئے شہر تعمیر کروائے جس میں سب سے مشہور سندھ کا شہر منصورہ تھا جو کہ اپنے زمانے میں ہندوستان میں اسلامی حکومت کا

۱۔ معجم البلدان ذکر رملہ، للیاقوت الحموی۔ ۲۔ البدایہ والنہایہ، جلد ۹ صفحہ ۳۵۴۔
۳۔ مروج الذہب، جلد ۳ صفحہ ۲۱۔ ۴۔ مروج الذہب، جلد ۳ صفحہ ۲۱۔

دارالخلافہ تھا۔[1] ہشام کا ایک بڑا کارنامہ حُجاج کے کاروانوں کے لیے مکہ کی سمت میں آنے والے راستوں پر سرائے، حوض اور تالاب بنوانا بھی ہے۔[2] ہشام بن عبدالملکؒ کو دینی علوم وفنون سے بھی خاص شغف تھا۔ امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے کہ ہشام بن عبدالملک نے امام زہریؒ سے ۴۰۰ احادیث کا ایک مجموعہ مرتب کروایا تھا،[3] عقیدہ وعمل کے لحاظ سے تمام اموی خلفاء بشمول ہشام بن عبدالملک سچے مسلمان اور راسخ العقیدہ مومن تھے۔ اسی وجہ سے ہشام بن عبدالملک غلط عقائد رکھنے والوں پر کڑی نگاہ رکھتا تھا۔ اس نے جعد بن درہم اور یونس بن غیلان کو خلق قرآن اورقدری عقائد رکھنے کی بناء پر قتل کروادیا تھا۔[4]

بعض محققین کے مطابق امیر ہشام بن عبدالملک پر آکر نبی ﷺ کی بارہ خلفاء کی پیشن گوئی پوری ہوجاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہشام بن عبدالملک کے بعد بنوامیہ کا زوال وانحطاط شروع ہوجاتا ہے اور آنے والا ہر خلیفہ پچھلے خلیفہ کے مقابلے میں کمزور ہوتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ اگلے چھ سالوں میں خلافتِ بنوامیہ کا تختہ الٹ جاتا ہے۔ اسی خلافتِ بنوامیہ کے دو عظیم خلفاء امیر عبدالملک بن مروانؒ اور ولید بن عبدالملکؒ کے دور میں اموی خلافت کے سیاسی افق پر امیر حجاج بن یوسف ثقفیؒ کا سورج طلوع ہوتا ہے جن کی شخصیت زیرِ نظر کتاب کی وجۂ تالیف بنی۔ امیر عبدالملک بن مروانؒ اور امیر ولید بن عبدالملکؒ کو جو سیاسی استحکام اور عروج نصیب ہوسکا اس میں امیر حجاج بن یوسفؒ کے کردار کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ حقیقت تو یہی ہے کہ اگر ان دونوں اموی خلفاء کو امیر حجاج بن یوسف ثقفیؒ جیسا وفادار، مخلص اور جانباز گورنر میسر نہ آتا تو ان کو وہ شوکت وسطوت بھی نصیب نہ ہوسکتی تھی جو آج تاریخ میں ان کے ناموں سے مذکور ہے۔ امیر حجاج بن

۱۔ فتوح البلدان، صفحہ ۴۴۸۔ ۲۔ مروج الذہب، جلد ۲، صفحہ ۲۱۔

۳۔ تذکرۃ الحفاظ، جلد ۱، صفحہ ۹۹۔ ۴۔ ابن اثیر، جلد ۵، صفحہ ۹۶۔

یوسف ثقفیؒ ان دونوں خلفاء کے عہد میں عراق کی گورنری پر مامور تھے اور درحقیقت ان کی حیثیت ایک طرح سے دوسرے درجہ کے حکمران کی تھی جو کہ اپنے ماتحت امراء کو جنوبی مشرقی علاقوں پر متعین کیا کرتے تھے جن کی حیثیت امیر حجاج بن یوسف ثقفیؒ کے نائب کی ہوا کرتی تھی۔ ان امراء کا عزل ونصب امیر حجاجؒ کی طرف سے ہوتا تھا۔ امیر حجاجؒ کے علاوہ ۱۵ اور عراقی حکام موجود تھے لیکن جو رتبہ و مرتبہ امیر حجاجؒ کو دربارِ خلافت میں حاصل تھا اور جہادی خدمات ان کے حصہ میں آئی، وہ باقی حکام کو نہ مل سکیں۔ تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اموی دور کے اس بطل جلیل کے خلاف کتبِ تاریخ میں جس قدر ظلم روا رکھا گیا ہے، وہ کم ہی کسی اور اموی عامل کے حصہ میں آیا۔ ظلم وشقاوت کی کون سی داستان نہ ہوگی، جو اس مظلوم خادمِ بنو امیہ سے منسوب نہ کی گئی ہو۔ اسی لئے ہم نے سوچا کہ کیوں نہ امیر حجاج بن یوسف ثقفیؒ سے متعلق عوام وخواص میں جو غلط داستانیں رائج ہیں، ان پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر ان کی شخصیت کے اصل خدوخال واضح کئے جائیں۔ ابتداء میں ارادہ تھا کہ اپنی طرف سے کچھ لکھنے کے بجائے موجودہ دور کے جن اصحابِ علم نے امیر حجاج بن یوسفؒ سے متعلق مثبت کام کیا ہے، ان کو یکجا کر کے ایک مختصر کتاب کی شکل میں شائع کر دیا جائے سو اس سلسلے میں پاکستان سے کتاب کا جو ایڈیشن شائع ہوا اس میں شیخ الحدیث ندوۃ العلماء لکھنؤ علامہ اسحٰق صدیقی سندیلوی، سابق چیئر پرسن کلیہ شعبۂ تاریخِ اسلامی، جامعہ کراچی ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر صاحبہ، پروفیسر شعبۂ تاریخ موصل یونیورسٹی عراق ڈاکٹر عبدالواحد ذنون طٰہٰ اور لیکچرار شعبۂ لسانیات بیروت یونیورسٹی، لبنان ڈاکٹر محمود زیادۃ کی مختلف تحاریر پر مبنی ایک مختصر سی کتاب ترتیب دی گئی۔ کتاب ترتیب دینے کے بعد جب ہم عرضِ مرتبہ لکھنے بیٹھے اور اس سلسلے میں تاریخ کی امہات الکتب کی ازسرِ نو ورق گردانی شروع کی تو امیر حجاج بن یوسف ثقفیؒ پر سے رفع مطاعن کے لئے اس قدر مواد مل گیا کہ جس قدر کتاب ترتیب دی تھی اس سے زیادہ ضخامت کی کتاب تالیف ہوگئی۔ سو بادل نخواستہ اس عرضِ مرتبہ کو اصل تالیف میں بدلا، علامہ اسحٰق صدیقی سندیلوی مرحوم،

ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر صاحبہ، ڈاکٹر عبدالواحد ذنون طٰہ اور ڈاکٹر محمود زیادۃ کی تحریرات کو اضافہ جات کی شکل دی اور کتاب پریس میں بھیج دی۔ تاہم جب کتاب ہندوستان سے شائع کرنے کا ارادہ کیا تو اس وقت تک امیر حجاج بن یوسف الثقفیؒ سے متعلق دو مضامین اور ایک تقریظ مزید مل گئے۔ پہلا مضمون رئیس المورخین پروفیسر عبدالقیوم صاحب کا مقالہ "حجاج بن یوسف: تاریخ و تنقید کی روشنی میں" جبکہ دوسرا مضمون محمد شرف الدین یکتا جودھپوری کا "تاریخِ اسلام کا ایک عظیم مدبر: حجاج بن یوسف" تھا۔ محمد شرف الدین یکتا جودھپوری کا مضمون جو کہ کتابی شکل میں مکتبہ جاء الحق کراچی سے شائع ہوا تھا، اس پر مشہور اہلحدیث عالم حکیم فیض عالم صدیقی شہید کی تقریظ بھی موجود تھی۔ سو جب فاضل شفیق الرحمٰن حفظہ اللہ، مکتبہ الفہیم مئو، انڈیا نے زیرِ نظر کتاب کی ہندوستان سے اشاعت کرنے کی خواہش ظاہر کی تو مناسب خیال کیا کہ ان دو مضامین اور تقریظ کو بھی اس نئے ایڈیشن میں شامل کر دیا جائے۔ سو اسی غرض سے کتاب کی از سرِ نو ترتیب و تدوین کی گئی اور ایک نئی شکل میں کتاب کو مرتب کیا گیا۔ کتابِ ہذا میں شامل مضامین کی بابت ہم یہ عرض کر دیں کہ یہ تمام صاحبانِ علم جن کی تحقیقات ہم نے اپنی کتاب میں شامل کی ہیں، ان سے تحاریر کے مندرجات میں چند جزوی اختلاف ہونے کے باوجود ان کے پیش کردہ مرکزی خیال سے ہم خود کو متفق پاتے ہیں، اسی لئے ہم نے ان حضرات کی بعض تحقیقات سے اختلاف کے باوجود ان پر کوئی توضیحی حاشیہ نہیں لگایا۔

تاہم اس بات کی وضاحت کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ چونکہ ہمارا تعلق منہجِ محدثین سے ہے جبکہ علامہ اسحٰق صدیقی سندیلوی مرحوم مسلکِ احناف کے ایک جید شیخ الحدیث تھے سو چند اصول و فروعات میں ان سے ہمارا اختلاف ایک فطری امر ہے لیکن چونکہ امیر حجاج بن یوسف ثقفیؒ سے متعلق ان کی تحقیق سے ہم خود کو متفق پاتے ہیں، اسی لئے اپنی کتاب کے مندرجات و مقاصد سے مطابقت رکھنے اور اس کی افادیت کی بناء پر ان کی تحقیق کو شاملِ کتاب کیا جا رہا ہے۔ ان کی یہ تحریر دراصل سید مودودی کی کتاب "خلافت

وملوکیت" کے نقد میں لکھی ان کی کتاب "اظہار حقیقت" جلد سوم سے ماخود ہے، اس لئے اس میں سید مودودی کے نظریۂ تاریخ پر تنقید کے زمرے میں امیر حجاج بن یوسف ثقفیؒ پر سے اعتراضات کو رفع کیا گیا ہے۔

اسی طرح پروفیسر عبدالقیوم اور محمد شرف الدین یکتا جودھپوری صاحب کے مضامین بھی اپنے اندر کئی بیش بہا معلومات رکھتے ہیں، اسی لئے کتاب کے جدید ایڈیشن میں ان کا اندراج کر کے ان کو اپنی گزارشات کے بعد سب سے اول لایا جا رہا ہے۔ جبکہ حکیم فیض عالم صدیقی شہید کی تقریظ کو ہم اپنی کتاب پر بحیثیت تقریظ لگا رہے ہیں جو کہ اصل میں محمد شرف الدین یکتا جودھپوری کی مختصر کتاب پر تقریظ تھی۔ جہاں تک ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر صاحبہ کی بات ہے تو ہم ان کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے ہمارے استفسار پر اپنی مصروفیت میں سے وقت نکال کر امیر حجاجؒ سے متعلق اپنی تحریر ہمیں ارسال کی۔ اس بابت ان کی جناب میں ہدیۂ ممنونیت پیش کرتے ہوئے ہم ان کی ارسال کردہ تحقیق کو اپنی اس کتاب میں شامل کر رہے ہیں۔ جبکہ کتابِ ہذا میں عبدالواحد ذنون طٰہٰ صاحب کی تحقیق ان کے مقالے "العراق فی عھد الحجاج" سے ماخوذ ہے۔ یہ پورا مقالہ امیر حجاج بن یوسف ثقفیؒ سے متعلق کافی بیش بہا اور وقیع معلومات اپنے اندر رکھتا ہے۔ ان شاء اللہ اس مقالہ کے شاملِ کتاب ابواب کے مطالعہ کے بعد قارئین امیر حجاج بن یوسف ثقفیؒ کی بابت کئی نئے اور ایجابی حقائق کو جان پائیں گے۔ اسی طرح ڈاکٹر محمود زیادۃ صاحب کی تحقیق بھی ان کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے مقالے "الحجاج بن یوسف الثقفیؒ۔ المفتریٰ علیہ" سے لی گئی ہے۔ ڈاکٹر محمود زیادۃ کا یہ مقالہ امیر حجاج بن یوسفؒ کی سیرت سے متعلق کئی نئے گوشے اجاگر کرتا ہے۔ ان شاء اللہ اگر اللہ کی مدد شاملِ حال رہی تو اس عربی مقالے کا اردو میں ترجمہ کر کے شائع کرنے کا ارادہ ہے۔

اس کتاب کی طباعت کے سلسلے میں سب سے پہلے تو اس اللہ عزوجل کے حضور شکر گزار ہوں کہ اس مالک نے اس احقر کو اس قابل بنایا کہ وہ یہ کام کر سکے۔ اگر اس کی مدد شاملِ حال

نہ ہوتو کوئی کام ممکن نہیں۔اسی کے کرم سے یہ کام ہوسکا ہے اوراس کام کی ہر اچھائی صرف اسی ذاتِ باری تعالیٰ کے سبب سے ہے۔اس مالک کُل کے شکریہ کے بعد اپنے عزیز دوست محمد صہیب نذیر اور راشد جمال صاحب کا شکریہ ادا کرونگا کہ ان کے تعاون کے بغیر یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچنا ناممکن تھا۔ان کی ہمت اور ساتھ رہا کہ یہ کام ہوسکا۔اللہ اس دوستی اور ساتھ کو ہمیشہ بنائے رکھے۔ساتھ ہی ہم شفیق الرحمٰن حفظہ اللہ، مکتبہ الفہیم کے بھی نہایت ممنون ہیں جنہوں نے ہندوستان سے اس کتاب کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا اور اس سلسلے میں ساری ذمہ داریاں کماحقہ ادا کیں۔وہ ہندوستان سے کتاب کی اشاعت کی فراخدلانہ پیش کش نہ کرتے تو شائد کتاب کا دوسرا ایڈیشن اتنی جلدی کبھی منظرِ عام پر نہ آسکتا تھا۔اللہ تعالیٰ ان کی اس علم دوستی کے لئے انہیں بھرپور جزا سے نوازے اور اس جذبے وسعی کو ان کے لئے توشۂ آخرت بنائے۔ اس کے علاوہ ہم اپنے نہایت فاضل، محترم اور محبت کرنے والے دوست جناب شہباز عالم انصاری حفظہ اللہ کے بھی نہایت شکرگزار ہیں کہ انہوں نے اپنے مصروف اوقات میں سے اس کتاب کے لئے وقت نکالا اور نہایت دقّتِ نظری سے کتاب کی نہ صرف پروف ریڈنگ کی بلکہ پہلی اشاعت میں جو کمپوزنگ کی غلطیاں رہ گئی تھیں، ان کو بھی پوری جانفشانی کے ساتھ درست فرمایا۔اللہ اس تھکا دینے والے کام کے لئے ان کو جزائے خیر سے نوازے۔ یہ احقر ہمیشہ ان کا ممنون رہے گا کہ جب بھی اس کو اُن سے کسی طور کی مدد و تعاون درکار ہوا، شہباز صاحب ہمیشہ خندہ پیشانی کے ساتھ موجود رہے۔اللہ ان کو دین و دنیا میں بہتیرا ترقیاں نصیب کرے اور ان کے لئے دونوں جہانوں میں آرام وسکون کا بندوبست کرے۔ساتھ ہی اپنے نہایت فاضل دوست جناب حافظ افضل خان بونیری صاحب کے شکرگزار ہیں کہ انہوں نے اپنے مصروف اوقات میں سے فرصت کے لمحات نکال کر اس احقر کی فرمائش پر عبدالواحد ذنون طٰہ صاحب کے شاملِ کتاب اقتباسات کو عربی سے اردو کا جامہ پہنایا۔جبکہ ڈاکٹر شاہ فیض الابرار صاحب، مدرس جامعہ ابی بکر کراچی ولیکچرار جامعہ کراچی کے بھی نہایت ممنون ہیں جنہوں نے ڈاکٹر محمود زیادۃ صاحب کی کتاب کے اقتباسات کتابِ ہٰذا میں شامل کرنے کی غرض سے

اس احقر کو مہیا کیئے۔ آخر میں اپنی زوجہ اور اپنے گھر والوں کا بہت ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھے اس کتاب کے لئے فرصت کے لمحات مہیا کیئے، ان کی طرف سے اگر فارغ البالی میسر نہ ہوتی تو ممکن نہ تھا کہ اس کتاب کی تکمیل ہو سکتی۔

جہاں تک ہماری ناقص معلومات ہے تو اردو زبان میں امیر حجاج بن یوسف ثقفیؒ سے متعلق یہ اپنی نوعیت کی پہلی تصنیف ہے۔ اس سے پہلے بعض مؤلفین اور تذکرہ نگاروں نے امیر حجاجؒ سے متعلق تصانیف تو رقم کی ہیں لیکن ان سب کا انداز یا تو افسانوی ہے یا پھر نہایت غیر محققانہ جن میں امیر حجاجؒ کو مطعون کرنے کے لئے ہر طرح کا رطب و یابس جمع کر دیا گیا ہے۔ پہلی بار محققانہ طرز پر امیر حجاجؒ بن یوسف ثقفی پر عائد اعتراضات کے تجزیئے پر مستقل نوعیت کی غالباً یہ پہلی اردو تصنیف ہوگی۔ البتہ یہ بات یاد رہے کہ یہ کتاب امیر حجاجؒ کی سیرت پر کوئی مستقل تصنیف کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ ان کی سیرت پر عائد چند الزامات کے تحقیقی جائزہ سے متعلق ہے۔ ان شاء اللہ مالک نے ساتھ دیا تو مستقبل قریب میں امیر حجاج بن یوسفؒ کی سیرت پر ایک مستقل تالیف کا ارادہ ہے۔ آخر میں عرض ہے کہ کسی بھی کام میں کمال صرف اس ذاتِ بے ہمتا کو ہی سزاوار ہے، مخلوق کا کام تو غلطیوں سے پُر ہوتا ہے۔ پھر بھی اپنے تئیں ہم نے پوری کوشش کی ہے کہ اس کتاب میں کوئی غلطی یا کمی نہ رہ جائے، تاہم اس کے باوجود اگر کوئی کمی یا غلطی نظر آئے تو قارئین سے التماس ہے کہ اس بابت مطلع فرمائیں، ان شاء اللہ ایجابی طریق سے آئی ہر تنقید کو سر آنکھوں پر رکھا جائے گا۔

محمد فہد حارث

۳/ مارچ ۲۰۱۹ء

امیر حجاج بن یوسف ثقفیؒ
چند غلط فہمیوں کا ازالہ

محمد فہد حارث

از محمد فہد حارث

امیر حجاج بن یوسف ثقفیؒ: چند غلط فہمیوں کا ازالہ

امیر حجاج بن یوسف ثقفیؒ تاریخِ اسلام کی ان چند بدنصیب شخصیات میں سے ہیں ، جو اگر کسی اور قوم میں پیدا ہوئی ہوتیں تو وہ قوم اس کو اپنا ہیرو بنا کر پیش کرتی لیکن مسلمانوں کی بدنصیبی یہ رہی کہ سبائی راویوں اور مجوسی مؤرخوں کی روایتی ریشہ دوانیوں کے سبب اس عظیم بطلِ جلیل اور مجاہدِ اسلام کو ایک قاتل، وحشی اور ظالم گورنر کی حیثیت سے پیش کیا گیا اور جہادِ اسلامی کے لیے اس کے تمام کارناموں کو کذب کے سمندر میں دریا برد کرنے کی سعی کی گئی۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ امیر حجاج بن یوسفؒ دورِ بنی امیہ کے ایک صاحبِ فراست گورنر تھے جن کی تدبیر و دانش اور اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کی وجہ سے عراق جیسا ہیجان انگیز اور فتنہ پرور صوبہ قابو میں آسکا اور ساتھ ہی چار دانگ عالم میں اسلام کا پرچم لہرا یا۔ جہاں ایک طرف امیر حجاجؒ نے اپنے چچازاد بھائی اور داماد محمد بن قاسمؒ کے ذریعے سندھ کو دارالکفر سے باب الاسلام بننے کا شرف بخشا تو دوسری طرف قتیبہ بن مسلمؒ اور طارق بن زیادؒ کے ذریعے چین اور ہسپانیہ کی سرحدوں تک اسلام کو پہنچادیا۔ اس عظیم مجاہد کی سیرت پر سبائی راویوں نے جی بھر کر دروغ گوئی کی اور ان کی شخصیت کو ظلم و بربریت کے جھوٹے الزامات سے آلودہ کردیا۔ کتاب ہٰذا میں ہم نے کوشش کی ہے کہ امیر حجاج بن یوسف ثقفیؒ

پر لگے ان غلط الزامات کا ازالہ کیا جائے اور مسلمانوں کے اس عظیم جرنیل کی اصل شخصیت و کردار سے قارئین کو روشناس کروایا جائے۔

امیر حجاج بن یوسفؒ مشہور صحابیٔ رسول ﷺ سیدنا عروہ بن مسعود ثقفیؓ کی پوتی کے صاحبزادے تھے۔ ابن خلکان کا قول ہے کہ حجاجؒ کی والدہ فارعہؒ بنت ہمام بن عروہ بن مسعود ثقفی تھیں۔ یہ فارعہ پہلے سیدنا مغیرہ بن شعبہؓ کے عقد میں تھیں جنھوں نے ان کو حجاجؒ کے والد یوسف بن ابی عقیل ثقفیؒ کے لیے یہ کہہ کر طلاق دے دی تھی کہ یہ عورت تو کسی سردار کی بیوی بننے کے لائق ہیں سو میں اسے طلاق دیتا ہوں، آپ اس سے نکاح کرلیں۔ چنانچہ سیدنا مغیرہ بن شعبہؓ کے طلاق دینے کے بعد یوسف بن ابی عقیلؒ نے ان سے نکاح کرلیا جن سے امیر حجاجؒ تولد ہوئے۔ ابن عساکر نے بیان کیا ہے کہ حجاجؒ کے والد یوسف بن ابی عقیلؒ خلیفۂ وقت کے کافی مقرب اور صاحبِ فراست تھے اور خلیفہ ان پر از حد اعتماد کرتے تھے۔ حجاجؒ کی پیدائش ۳۹ھ کی ہے البتہ بعض اقوال ۴۰ھ اور ۴۱ھ کے بھی ملتے ہیں۔ (۱)

ہمارے بعض تذکرہ نویسوں کو امیر حجاج بن یوسف ثقفیؒ سے خاص بیر و بغض رہا ہے، اسی وجہ سے انھوں نے امیر حجاجؒ کی والدہ، جو کہ صحابیٔ رسول ﷺ سیدنا عروہ بن مسعود ثقفیؓ کی پوتی تھیں، کے بارے میں انتہائی لغو باتیں نقل کی ہیں۔ علامہ ابن کثیر دمشقیؒ نے چونکہ کسی حد تک تنقیحِ روایات کا کام کیا سو انھوں نے حجاجؒ کی والدہ سے متعلق کسی بھی قسم کی لغو روایت کو اپنی کتاب میں شامل نہ کیا بلکہ اس بابت ان کے نزدیک جو روایت سب سے معتبر تھی اسی کو امیر حجاجؒ کے حالات میں درجِ کتاب کیا جس کا تذکرہ ہم چند سطریں اوپر کرچکے ہیں۔ ہمارے ان تذکرہ نویسوں کی مغالطہ انگیزی کیا ہے، اس سے متعلق موصل یونیورسٹی عراق میں متعین تاریخ کے پروفیسر عبدالواحد ذنون طٰہ اپنے تحقیقی مقالہ میں رقم طراز ہیں:

۱۔ البدایہ والنہایہ، جلد ۹ صفحہ ۱۱۵۔

''ام الحجاج کے بارے میں روایات میں کافی اختلاف ہے البلاذری ان کا نام الفارعہ بنت ھمام ذکر کرتے ہیں(۱) جبکہ ابن حزم نے فریعہ ذکر کیا ہے۔(۲) اس کے علاوہ یوسف بن الحکم سے پہلے ان کے شوہروں کے بارے میں بھی کافی اختلاف ہے۔ الجاحظ،(۳) البلاذری(۴) اور ابو الفرج الاصبہانی(۵) بیان کرتے ہیں کہ ان کے پہلے شوہر سیدنا مغیرہ بن شعبہؓ تھے اور انھوں نے حجاج کی والدہ کو ایک معمولی سی بات پر طلاق دے دی تھی ،اس کے بعد حجاج کے والد یوسف نے ان سے نکاح کیا۔ ہوا کچھ یوں کہ طلاق دینے کے بعد سیدنا مغیرہؓ کو احساس ہوا کہ وہ ان خاتون کے معاملے میں خطا پر تھے کیونکہ انھوں نے طلاق دینے میں تأمل سے کام نہ لیا پس وہ نادم ہوئے اور حجاج کے والد کو کہا کہ میں ثقیف کی بہترین خاتون کو طلاق دے بیٹھا ہوں تو تم ان سے شادی کرلو وہ یقیناً تمھارے لیے اولاد پیدا کرے گی۔ (۶) اصل واقعہ صرف اتنا تھا لیکن متأخرین کی روایات نے اصل امرِ واقعہ کو بالکل پلٹ کر رکھ دیا ہے اور سیدنا مغیرہؓ کی یوسف ابن الحکم کو کی گئی نصیحت کچھ اس طرح پیش کی ہے: ''اس سے شادی کرو کیونکہ وہ اسی قابل ہے کہ تمھارے لیے ایک بُرے آدمی کو پیدا کرے پس اس نے اس سے شادی کرلی۔'' (۷) یہ بات صاف دیکھی جا سکتی ہے کہ متأخر روایت میں جھوٹ گھڑنے کے آثار واضح طور پر نظر آرہے ہیں کیونکہ یہ ایک

۱۔ انساب الاشراف، جلد ۱۱ ،صفحہ ۳۶۔
۲۔ جمهرة انساب العرب، صفحہ ۲۶۳۔
۳۔ المحاسن و الاضداد، صفحہ ۱۵۸۔
۴۔ انساب الاشراف، جلد ۱۱ صفحہ ۱۳۶۔
۵۔ الاغانی، ۶ / ۲۳۔
۶۔ العقد الفرید، ۵ / ۱۳۔
۷۔ تہذیب ابن العساکر ، ۴/ ۴۹۔

انتہائی غیر معقول بات ہے کہ کوئی شخص کسی کو ایک ایسی عورت سے شادی کا کہے جو اس کے لیے ایک بُرے آدمی کو جنم دے گی اور پھر وہ آدمی اس عورت سے شادی بھی کرلے۔ تاہم اس بابت جب ہم مسعودی کی روایت[۱] کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ سابقہ ذکر کردہ قصے سے خاصی مختلف ہے، وہ بتاتا ہے کہ حجاج کی والدہ فارعہ کا پہلا شوہر حارث بن کلدہ تھا پھر اس کے بعد یوسف ابن الحکم نے فارعہ سے نکاح کیا۔ لیکن مسعودی اسی پر بس نہیں کرتا بلکہ وہ حجاج کی ولادت کو ایک بدترین شکل میں پیش کرتا ہے جہاں وہ حجاج کو پہلے دن سے خون کے پیاسے کے طور پر ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ حجاج اپنی ماں کا دودھ پینے پر اس وقت تک راضی نہ ہوا جب تک اس کی ماں کی چھاتی پر خون نہیں لگایا گیا۔[۲] یہ روایت حجاج مخالف روایات کی بہترین مثال ہے جس میں دکھایا جارہا ہے کہ وہ پہلے دن سے ہی خون کا پیاسا تھا۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ یہ روایت صرف مسعودی کے ہاں پائی جاتی ہے جس نے حارث بن کلدہ کو ام حجاج کا پہلا شوہر بنادیا جس کی تائید بقیہ کسی روایت سے نہیں ہوتی۔ مندرجہ بالا تفصیل سے مسعودی کی اس روایت کا رفض اور عدم قبولیت صاف ظاہر ہوتا ہے۔" [۳]

الغرض جناب عبدالواحد ذنون طہٰ کی اس توضیح سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ ذکر کردہ روایات اور اس طرح کی دوسری کذاب راویوں کی گھڑی ہوئی روایات اس قابل نہیں کہ ان کو بنیاد بنا کر خیر القرون کی کسی شخصیت یا گھرانے کی بابت ہرزہ

۱۔ مروج الذہب، ۳/ ٦٧۔ ۲۔ مروج الذہب، ۳/ ٦٧۔

۳۔ العراق فی عہد الحجاج بن یوسف الثقفیؒ، صفحہ ۲۷ تا ۲۸۔

سرائی کی جائے۔ درست بات یہی ہے کہ امیر حجاجؒ کا گھرانہ بنو ثقیف کے اشراف میں معروف گھرانہ تھا اور ان کے والد محترم اپنے قبیلے میں نمایاں حیثیت کے مالک اور خلیفۂ وقت سے دیرینہ تعلقات رکھتے تھے جیسا کہ ابن کثیر دمشقیؒ نے البدایہ و النہایہ میں تصریح کی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ حجاز میں اپنی ولایت کے دور میں جب امیر حجاجؒ نے نبی ﷺ کے چچازاد بھائی جناب جعفر بن ابی طالبؓ کی پوتی اور صحابی رسول عبداللہ بن جعفرؓ کی بیٹی امِ کلثوم بنت عبداللہ کا رشتہ مانگا تو سیدنا عبداللہ بن جعفرؓ نے بخوشی اپنی بیٹی کا ہاتھ امیر حجاجؒ کے ہاتھ میں دے دیا۔(۱) یاد رہے کہ یہ عبداللہ بن جعفر بن ابی طالبؓ، سیدنا علیؓ کے بھتیجے اور داماد تھے کیونکہ سیدنا علیؓ کی سب سے چھوٹی بیٹی زینب بنت علیؓ ان کی زوجیت میں تھیں۔ انھیں عبداللہ بن جعفرؓ کی ایک اور بیٹی ام محمد بنت عبداللہ بن جعفرؓ امیر یزید بن معاویہؒ کی زوجیت میں تھیں۔(۲) یوں امیر حجاجؒ اور یزید بن معاویہ دونوں سیدنا عبداللہ بن جعفرؓ کے داماد اور آپس میں ہم زلف تھے۔ سیدنا عبداللہ بن جعفرؓ جنھوں نے اپنی بیٹیوں کے رشتے بخوشی امیر یزید بن معاویہؒ اور امیر حجاج بن یوسفؒ کو دے دیئے تھے، نبی ﷺ کی نظروں میں بڑی قدرومنزلت رکھتے تھے۔ علامہ ابن حجر عسقلانی الاصابہ میں لکھتے ہیں:

> عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب کی والدہ کا نام اسماء بنت عمیسؓ تھا جو کہ ام المومنین سیدہ میمونہؓ بنت حارث کی ماں شریک بہن تھیں۔ یہ حبشہ میں پیدا ہونے والے پہلے بچے تھے۔ انھوں نے نبی ﷺ سے احادیث سنی ہیں، اس کے علاوہ آپ نے اپنے والدین، اپنے چچا سیدنا علیؓ، سیدنا ابوبکرؓ، سیدنا عثمانؓ اور سیدنا عمار بن یاسرؓ سے بھی حدیث کی روایت کی ہے۔ ابن جریج کی روایت ہے کہ عبداللہ بن جعفرؓ فرماتے ہیں کہ

۱۔ نسب قریش للزبیری، صفحہ ۸۲۔

۲۔ الانساب الاشراف تحت الترجمۃ عبداللہ بن جعفر۔

نبی ﷺ نے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر فرمایا کہ "اے اللہ! جعفر کی اولاد کا وارث بن جا۔" فرماتے ہیں کہ "ہم لوگ کھیل رہے ہوتے، جب آپ ﷺ وہاں سے گزرتے تو مجھے اٹھا کر اپنے آگے سوار کر لیتے۔" امام احمد سیدنا جعفر بن ابی طالبؓ کی غزوہ موتہ میں شہادت سے متعلق ایک طویل حدیث لائے ہیں جس کے آخر میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ "عون اور محمد ابنائے جعفرؓ اپنے والد جعفرؓ پر جبکہ عبداللہ بن جعفرؓ شکل و شباہت اور اخلاق میں مجھ پر گیا ہے"۔۔۔ جودوسخا میں یہ عبداللہ بن جعفرؓ بہت مشہور تھے۔۔ طبری اور بیہقی میں روایت آتی ہے کہ یزید بن معاویہؒ نے اپنے سسر عبداللہ بن جعفرؓ کی خدمت میں بہت سارا مال و متاع ہدیہ روانہ کیا، آپؓ نے وہ سارا مال اسی وقت اہل مدینہ میں تقسیم کردیا اور اپنے گھر اس کا ایک ماشہ بھی نہیں لے گئے، جس کے بارے میں شاعر عبداللہ بن قیس رقیات کہتے ہیں:

"تم اس معزز ابن جعفرؓ کی طرح ہو، جس نے سمجھا کہ مال فنا ہوجائے گا اور اس کا ذکر خیر باقی رہے گا۔"

مشہور شاعر شماخ بن ضرار نے ان الفاظ میں عبداللہ بن جعفرؓ کی مداح کی:

"ابن جعفر! تم بہترین نوجوان ہو اور رات کے مسافروں کا بہترین ٹھکانہ، کتنے مہمان جو رات کا سفر کرکے قبیلے میں پہنچتے ہیں تو انھیں تمھارے طفیل زادِ سفر اور من پسند چیزیں مل جاتی ہیں۔"

سیدنا عبداللہ بن جعفرؓ کا انتقال با اختلافِ روایات ۸۴ھ سے ۸۷ھ کے بیچ میں اسّی (۸۰) سال کی عمر میں ہوا۔ امیر عبدالملک بن مروانؒ

کی طرف سے متعین امیر مدینہ جناب ابان بن عثمان بن عفانؒ نے
آپ کی صلوٰۃ المیت ادا کی۔(۱)

سیدنا عبداللہ بن جعفرؓ کا ذکر یہاں تفصیل سے کرنا اس لیے مناسب سمجھا گیا تاکہ قارئین کو ان کے اصل مقام و مرتبہ کا اندازہ ہوجائے اور یہ سمجھنے میں آسانی رہے کہ خاندان بنو ہاشم کے ایک ممتاز فرد اور صحابئ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کبھی اپنی بیٹی کسی ایسے شخص سے نہیں بیاہیں گے جو کہ ظالم یا فاسق ہو۔ آج قحطِ رجال کے اس دور میں ہم آپ جیسے گناہ گار مسلمانوں کو اپنی بیٹیوں کے لیے شریف اور کسی حد تک پابندِ سنت لڑکے کا رشتہ درکار ہوتا ہے اور کہاں ایک صحابی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ کیا یہ توقع رکھی جاسکتی ہے کہ وہ اپنی بنات کا رشتہ صرف کفو ہونے کی بناء پر کسی بھی فاسق، ظالم یا قاتل شخص کو دے دیں گے۔ ہمارے علماء و تذکرہ نویس اگر صرف انساب کی کتب ہی فکر و تدبر کے ساتھ پڑھ لیں تو بنو امیہ دشمنی پر مبنی کئی تاریخی ہفوات کا غلط ہونا ان پر مبرہن ہوجائے گا۔ المختصر آلِ بنو ہاشم کے ساتھ قائم کی گئی یہ رشتہ داری ثابت کردیتی ہے کہ امیر حجاجؒ پر فاسق و ظالم ہونے کی روایات ازسرتاپا جھوٹ پر مبنی اور کذبِ محض ہیں۔

ان ام کلثوم بنت عبداللہؓ کے علاوہ امیر حجاجؒ نے دیگر نکاح بھی کیے۔ ان کی بقیہ بیگمات میں ہند بنت اسماء بن خارجہ، ہند بنت المہلب بن ابی صفرہ، ام الجلاس بنت عبدالرحمن بن اسید، امۃ اللہ بنت عبدالرحمن بن جریر بن عبداللہ البجلی، ام ابان بنت نعمان وغیرہ شامل ہیں۔(۲) ان ازواج میں سے امۃ اللہ بنت عبدالرحمٰن بن جریر بن عبداللہ البجلی مشہور صحابئ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جریر بن عبداللہ البجلی کی پوتی تھیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی ان جریر بن عبداللہ البجلیؓ کی بابت لکھتے ہیں:

۱۔ الاصابہ فی تمیز الصحابہ، جلد ۳، تحت الترجمۃ عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب۔

۲۔ المحاسن و الاضداد، صفحہ ۱۶۱، العقد الفرید ۶/ ۱۰۴، انساب الاشراف، جلد ۱۱، صفحہ ۴۲۔

”سیدنا جریرؓ بہت خوبصورت و وجیہہ تھے۔ سیدنا عمرؓ ان کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ یہ اس امت کا یوسف ہے۔ عراقی جنگوں میں سیدنا عمرؓ نے ان کو پیش پیش رکھا تھا۔ ان کے قبیلے کے لوگوں کا فتح قادسیہ میں نمایاں کردار رہا تھا۔ بعد میں یہ کوفہ منتقل ہوگئے۔ سیدنا علیؓ نے انھیں قاصد بنا کر سیدنا معاویہؓ کے پاس بھیجا تھا۔ اس کے بعد یہ دونوں فریقین سے جدا ہوکر قرقیسا میں ہی سکونت پذیر رہے، یہاں تک کہ ۵۱ھ اور بقول بعض ۵۴ھ میں انتقال فرماگئے۔ صحیح بخاری میں روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جریر بن عبداللہ البجلیؓ کو ذی الخلصہ بھیجا جسے یہ منہدم کرآئے۔ اسی روایت میں مذکور ہے کہ جریر بن عبداللہ البجلیؓ خود فرمایا کرتے تھے کہ جب سے میں مسلمان ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی مجھے اپنے پاس آنے سے نہیں روکا اور جب مجھے دیکھتے تو تبسم فرماتے۔ طبرانی معجم الکبیر جلد ۲ صفحہ ۲۹۲ میں سیدنا علیؓ سے مروی مرفوع روایت میں آتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جریر ہم اہلبیت میں سے ہیں۔“(۱)

جنابہ امۃ اللہ بن عبدالرحمٰن بن جریر بن عبداللہ البجلی کا امیر حجاج بن یوسفؒ کی زوجیت میں ہونا بھی اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ ہم عصر امت کے مابین آپ جناب کا کردار و عدالت مسلّم تھے اوریہی سبب بنا کہ امیر حجاجؒ کے نکاح بیشتر ایسی خواتین سے ہوئے جن کے گھرانے نسب کے ساتھ ساتھ زہد و تقویٰ کے حامل بھی تھے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ امیر حجاجؒ کا اپنی ازواج کے ساتھ برتاؤ حسنِ سلوک اور محبت و قدردانی پر مبنی تھا اور یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ شادیاں ان شریف النفس خواتین کی صفات اور نسب کی بنا پر کی تھیں اور ساتھ ہی اس بات کو

۱۔ الاصابہ فی تمیز الصحابہ جلد ۱ تحت الترجمۃ جریر بن عبداللہ البجلی۔

بھی ملحوظ رکھا کہ ان کے سسرال شرافت و نجابت میں ممتاز اور عرب قبائل میں اپنا اثر و رسوخ رکھتے ہوں۔(۱)

تاہم مذکورہ بالا ازواج میں سے ام کلثوم بنت عبداللہؒ، ہند بنت اسماءؒ، ہند بنت مہلب بن ابی صفرہؒ اور امیر حجاجؒ میں بعد میں جدائی ہو گئی تھی۔ البتہ ام کلثوم بنت عبداللہؒ سے طلاق کے بعد بھی امیر حجاجؒ کے سیدنا عبداللہ بن جعفرؓ سے تعلقات خراب نہیں ہوئے اور ان کے مابین ہدایا اور انعام و اکرام کا سلسلہ مسلسل جاری رہا۔(۲) تذکرہ نویسوں اور ماہر انساب نے امیر حجاجؒ کے چھ بیٹوں اور ایک بیٹی کا ذکر کیا ہے۔ بیٹی کے متعلق زیادہ معلومات نہیں مل سکی سوائے اس کے کہ وہ سیدہ ام کلثوم بنت عبداللہ بن جعفر طیارؒ کے بطن سے تھی جبکہ بیٹوں میں محمد، ابان، عبدالملک، سلیمان، ولید اور یوسف کا ذکر ملتا ہے جن میں سے یوسف اور محمد نے امیر حجاجؒ کی زندگی میں ہی وفات پائی۔(۳)

اپنی جوانی کے ابتدائی ایام سے ہی امیر حجاجؒ سیاسی زندگی اور امویوں کی خدمت میں مشغول ہو گئے جس کی وجہ سے جلد ہی وہ امیر عبدالملک بن مروانؒ کی نظروں میں آ گئے جس کے بعد امیر حجاجؒ کی معاملات کو بہترین انداز میں سلجھانے اور آسان کرنے کی صلاحیت نے انھیں سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے ہونے والی جنگ کا سپہ سالار بننے اور عراق کی ولایت سنبھالنے تک پہنچا دیا۔ چونکہ امیر حجاج بن یوسف ثقفیؒ کو اس دور کی سیاست میں منظرِ عام پر لانے کا سہرا اموی خلیفہ عبدالملک بن مروانؒ کے سر ہے سو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ امیر عبدالملک بن مروانؒ کی بابت بھی چند سطریں ہدیۂ قارئین کر دی جائیں تاکہ قارئین جان سکیں کہ امیر حجاجؒ کو

۱۔ رسائل الجاحظ، صفحہ ۲۶۹، عیون الاخبار، جلد ۴، صفحہ ۸۰، نسب قریش، صفحہ ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۶۳۔

۲۔ العقد الفرید، جلد ۲، صفحہ ۷۲۔

۳۔ جمہرۃ الانساب، صفحہ ۳۶۷، ۳۶۸۔

گورنری کے منصب پر فائز کرنے والے امیر عبدالملک بن مروانؒ خود کس پائے کے مسلمان تھے۔

خلیفہ ثامن امیر عبدالملکؒ بن مروانؒ:

ڈاکٹر حمید اللہ اور ڈاکٹر محمود احمد غازی دونوں خلیفہ ثامن (فی احد الاقوال) امیر عبدالملک بن مروانؒ کے بارے میں تصریح کرتے ہیں کہ بڑے پائے کے صاحب ِعلم انسان اور سیدنا عبداللہ بن عمرؓ کے شاگردِ خاص تھے۔ جب سیدنا عبداللہ بن عمرؓ کے انتقال کے وقت ان سے پوچھا گیا کہ آپؓ کے بعد فتاویٰ کے لیے کس سے رجوع کیا جائے تو انھوں نے عبدالملک بن مروانؒ کا نام لیا۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی ان عبدالملک بن مروانؒ کی بابت اپنے محاضرات سیرت کے تیسرے لیکچر میں بتاتے ہیں کہ عبدالملک بن مروانؒ علمی اور دینی اعتبار سے اس درجہ اور مقام و مرتبہ کے انسان تھے کہ امام مالک نے موطا میں کئی جگہ کسی چیز کا سنت ہونا عبدالملکؒ کے طرزعمل کے حوالہ سے بیان کیا ہے۔ مثلاً کہا ہے کہ فلاں چیز سنت ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اہل علم نے عبدالملک بن مروانؒ کو اس طرح کرتے دیکھا ہے۔ گویا امام مالکؒ نے عبدالملک بن مروانؒ کے طرزعمل کو سنت کی دلیل قرار دیا۔ امیر عبدالملک بن مروانؒ سیرت و مغازی سے متعلق معلومات کے لیے اکثر و بیشتر عروہ بن زبیرؒ کو سوالات بھیجا کرتے تھے اور عروہ ان سوالات کا تفصیلی جواب دیا کرتے تھے۔ الغرض عبدالملکؒ بن مروانؒ ایک صاحب ِعلم انسان تھے جو اگر مسند خلافت پر نہ بیٹھتے تو فقہائے سبعہ میں سے ہوتے۔ ان کے علمی کمالات کا مختلف اصحاب ِعلم نے اعتراف کیا ہے جس کو حافظ ابن کثیرؒ نے اپنی تاریخ البدایہ و النہایہ جلد ۹ صفحہ ۶۱ تا ۶۷ تک میں درج کیا ہے۔

حافظ ابن کثیر امیر عبدالملک بن مروانؒ کا شجرہ لکھنے کے بعد بیان کرتے ہیں

کہ ان کا سیدنا عثمانؓ بن عفان سے سماع ثابت ہے اور یہ وہ پہلے شخص ہیں جو لوگوں کو اپنے ساتھ لےکر ۴۲ھ میں روم کے علاقوں میں چل پھر کر آئے تھے۔ سولہ سال کی عمر میں سیدنا معاویہؓ نے ان کو امیرِ مدینہ مقرر کیا۔ ان کا اٹھنا بیٹھنا فقہاء، علماء اور عابد و زاہد لوگوں میں ہوتا تھا۔ اپنے والد سیدنا مروانؓ کے علاوہ انھوں نے سیدنا جابرؓ، ابو سعید الخذریؓ، ابو ہریرہؓ، عبداللہ بن عمرؓ، معاویہ بن ابو سفیانؓ، سیدہ ام سلمہؓ اور بریرہؓ سے حدیث کی سماعت اور روایت کی۔ جبکہ خود ان سے ایک عظیم جماعت نے روایتِ حدیث کی جن میں خالد بن معدان، عروہ بن زبیر، امام زہری، عمرو بن الحارث، رجاء بن حیوۃ اور جریر بن عثمان شامل ہیں۔

عبدالملک بن مروانؒ کی ولادت ۲۶ھ میں ہوئی۔ خلیفہ بننے سے قبل ان کا شمار عباد اور زہاد میں ہوتا تھا اور یہ ان فقہاء میں شمار ہوتے تھے جو ہر وقت مسجد میں قائم اور تلاوت قرآن پاک میں مشغول رہتے تھے۔ امام نافعؒ مولیٰ عبداللہ بن عمرؓ کا کہنا ہے کہ میں نے مدینہ میں عبدالملک بن مروان سے زیادہ چاق و چوبند سیرو سیاحت کرنے والا اور کتاب اللہ کا قاری کسی کو نہیں دیکھا۔ امام اعمشؒ ابو الزناد سے روایت کرتے ہیں کہ مدینہ کے فقہاء چار اشخاص تھے، ایک سعید بن المسیبؒ، دوسرے عروہؓ، تیسرے قبصیہ بن زویبؒ اور چوتھے عبدالملک بن مروانؒ۔ دور خلافت میں یہ قبصیہ بن زویب عبدالملک بن مروان کے وزیر تھے۔

امیر عبدالملک بن مروانؒ اس پائے کے انسان تھے کہ سیدنا عبداللہ بن عمرؓ جیسے زاہد و عابد صحابی نے ان کے متعلق فرمایا کہ لوگوں نے بیٹے جنے ہیں جبکہ مروانؓ نے باپ جنا ہے یعنی عبدالملک۔ یہی وجہ تھی کہ ایک دن جب سیدنا عبداللہ بن عمرؓ نے لوگوں کا عبدالملک کی امارت میں اختلاف دیکھا تو کہا کہ کاش! اس لڑکے کی امارت پر سب کا اتفاق ہوتا۔ امام شعبیؒ نے عبدالملک کی بابت فرمایا کہ میں نے کسی مجلس میں اپنے سے زیادہ فضیلت والا کسی کو نہیں پایا سوائے عبدالملک بن مروان کے،

اس لیے کہ جب بھی میں کوئی بات کرتا تو وہ اس میں اضافہ کرتے اور جب بھی کوئی شعر کہتا تو وہ اس میں اضافہ کرتے۔ سیدنا معاویہؓ نے ۵۰ھ میں امیر مدینہ سیدنا مروانؓ کو خط لکھا کہ معاویہ بن خدیجؓ کی معیت میں جو وفد مغرب کے شہروں کی طرف جارہا ہے اس میں اپنے بیٹے عبدالملک بن مروانؒ کو بھی شامل کردو، نیز اس خط میں سیدنا معاویہؓ نے عبدالملک بن مروانؒ کی ان علاقوں میں مجاہدانہ صلاحیت و اہلیت کا بھی ذکر کیا تھا۔

امام زہریؒ فرماتے ہیں کہ عبدالملک بن مروانؒ نے فرمایا کہ علم عنقریب اٹھ جائے گا، جس شخص کے پاس ہے جلدی سے پیش کرے، نہ خیانت کرے اور نہ پہلوتہی کرے، اس کے علاوہ عبدالملکؒ کے خطبہ میں وعظ و نصیحت کی باتیں ہوتی تھیں۔ امام اعمشؒ فرماتے ہیں کہ سیدنا انس بن مالکؓ نے امیر عبدالملکؒ کو خط لکھا جس میں خود کا خادم رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہونا بتا کر فرمایا کہ مجھے حجاجؒ نے تکلیف پہنچائی اور ایسا ایسا کیا، عبدالملکؒ خط پڑھ کر رونے لگے اور غصہ ہوئے، پھر ایک سخت خط حجاجؒ کو لکھا جس کی وجہ سے امیر حجاجؒ نے سیدنا انس بن مالکؓ سے معذرت کی اور اپنے فعل پر نادم ہوئے۔ ایک شخص عبدالملکؒ کے پاس آیا اور ان سے تنہائی میں کچھ کہنا چاہا تو عبدالملکؒ نے فرمایا کہ جو چاہو کہو مگر تین باتیں مت کرنا، پہلی میری تعریف، دوم مجھ سے جھوٹ مت بولنا اور سوم میری رعایا کے خلاف مجھے مت بھڑکانا۔ امام اصمعیؒ فرماتے ہیں کہ عبدالملک بن مروانؒ کے سامنے ایک شخص لایا گیا جس نے ان کے خلاف خروج کیا تھا۔ اس کی بابت قتل کا فیصلہ ہوا۔ اس شخص نے عبدالملکؒ سے کہا کہ آپ کی طرف سے میرا یہ بدلہ ہے۔ عبدالملکؒ نے اس سے پوچھا پھر کیا بدلہ ہونا چاہیے؟ اس شخص نے کہا کہ میں جس کے ساتھ بھی نکلا ہوں وہ ناکام ہوا اور شکست کھائی اور ان کا لشکر منتشر ہوا۔ یہ بات سن کر عبدالملک کو ہنسی آگئی اور اس کو چھوڑ دیا۔ عبدالملک سے کسی نے پوچھا کہ کون سا شخص سب سے بہتر ہے؟ فرمایا کہ جو

بلندی کے بجائے تواضع اختیار کرے اور قدرت کے باوجود زہد اختیار کرے اور انتقام پر قدرت رکھنے کے باوجود انتقام نہ لے۔ بہترین مال وہ ہے جو قابل تعریف ہو یا مذمت کو دور کرے۔ یہ کبھی نہ کہو کہ کون پالے گا کہ تمام مخلوق اللہ کا کنبہ اور عیال ہے۔

امام اصمعیؒ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ عبدالملک بن مروانؒ نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ خطبہ دے رہے تھے، اچانک خطبہ روک کر رونے لگے اور پھر کہا یارب! ان ذنوبی عظیمة و ان قلیل عفوك اعظم منها، اللهم فامح بقلیل عفوك عظم ذنوبی یعنی اے میرے رب! میرے گناہ بہت زیادہ ہیں اور یقیناً تیرا کم از کم معاف کرنا ان گناہوں سے کہیں زیادہ ہے، اے میرے اللہ! اپنے قلیل عفو سے میرے عظیم گناہوں کو معاف فرمادے۔ راوی کا کہنا ہے کہ جب حسنؒ کو یہ خبر ملی تو وہ رونے لگے اور پھر کہا کہ لو کان کلام یکتب بالذهب لکتب هذا الکلام یعنی اگر کوئی کلام سونے سے لکھنے کے قابل ہوتا تو یہ کلام سونے سے لکھا جانا چاہیے۔ حسنؒ کے علاوہ دیگر لوگوں نے بھی اس دعا کے بارے میں یہی رائے دی۔

ان کی خلافت کی بیعت ۶۵ھ میں کی گئی جو کہ مصر و شام تک محدود تھی جبکہ دوسرے علاقوں پر سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ کی خلافت قائم تھی لیکن ۷۳ھ میں سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ کی شہادت کے بعد پوری بلاد اسلامیہ میں ان کا اقتدار قائم ہوگیا۔ ۸۶ھ میں وسط شوال میں دمشق میں ان کا انتقال ہوا جبکہ ان کی عمر ۶۰ برس کے آس پاس تھی۔ ان کے جانشین امیر ولید بن عبدالملکؒ نے ان کی صلوٰۃ المیت ادا کی۔ ان کی ایک بیوی بنومخزوم سے تھی جن کے بطن سے ہشام بن عبدالملک پیدا ہوا تھا جو بعد میں جا کر خلیفہ بنا۔ سیدنا علیؓ بن ابی طالب کی ایک صاحبزادی بھی ان عبدالملک بن مروانؒ کے عقد میں تھیں اس لحاظ سے یہ سیدنا علیؓ کے داماد اور حضرات حسنینؓ کے

بہنوئی تھے۔ امیر یزید بن معاویہؒ کی صاحبزادی عاتکہ بھی ان عبدالملک بن مروانؒ کی زوجیت میں تھیں۔ عبدالملکؒ کی کل مدت خلافت ۲۱ سال تھی جس میں سے نو سال سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ کے ساتھ حکومت میں شامل تھے جبکہ تیرہ سال تین ماہ مستقل حکومت کی۔(۱)

امیر عبدالملک بن مروانؒ کی سیرت و کردار سے متعلق مذکورہ بالا تصریحات کے بعد قارئین پر یہ مترشح ہوگیا ہوگا کہ آپ کس قدر زہد وتقویٰ، فراست اور علم کی قدر کرنے والے انسان تھے اور ایسا ممکن نہ تھا کہ اس قدر جزرسی، علم اور فراست رکھنے والا انسان کسی ظالم یا فاسق انسان کا تقرر بطور گورنر کرے۔

امیر حجاج بن یوسفؒ کا تقررِ گورنری اور جہادی مساعی:

۷۳ ہجری میں مصعب بن زبیرؒ کے قتل کے بعد عبدالملک بن مروانؒ نے امیر حجاجؒ کو مکہ معظّمہ بھیجا جہاں ان کے اور سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ کے درمیان معرکہ پیش آیا اور سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ شہید ہوگئے۔ اس کے بعد خلیفہ عبدالملک بن مروانؒ نے امیر حجاجؒ کو مکہ، مدینہ، طائف اور یمن پر عامل بنادیا جہاں وہ خلیفہ کے بھائی بشر بن مروانؒ کی وفات تک اپنی ذمہ داریاں نبھاتے رہے۔ ۷۴ ہجری میں امیر حجاجؒ کے کہنے پر مشہور محدث ابو ادریس خولانیؒ نے یمن میں عہدۂ قضاء سنبھالا جبکہ خلیفہ عبدالملک بن مروانؒ نے حجاجؒ کو امیر حج بنا کر بھیجا اور اس وقت حیات صحابہؓ و تابعینؒ نے امیر حجاجؒ کی اقتداء میں حج ادا کیا۔ ابن کثیر لکھتے ہیں:

قال ابن جرير: وحج بالناس فيها الحجاج وهو على إمرة المدينة ومكة واليمن واليمامة۔(۲)

۱۔ البدایہ والنہایہ، جلد ۹ صفحہ ۶۱ تا ۶۷۔

۲۔ البدایہ والنہایہ، جلد ۹ صفحہ ۳۔

ابن جریر کہتے ہیں کہ حجاج اس سال امیر حج بنے جب کہ وہ مدینہ، مکہ، یمن اور یمامہ کے گورنر تھے۔

۷۵ ہجری میں عاملِ عراق بشر بن مروانؒ کے انتقال کے بعد خلیفہ عبدالملک بن مروانؒ نے امیر حجاجؒ کو ان کی جگہ پر عراق کا گورنر بنا کر بھیجا جہاں مکمل بیس سال تک وہ اپنے فرائض سر انجام دیتے رہے۔ علامہ ابن کثیرؒ اس بابت لکھتے ہیں:

''اسی سال (۷۵ ہجری میں) امیر عبدالملک بن مروانؒ نے حجاج بن یوسفؒ کو عراق، بصرہ، کوفہ اور اس کے قرب و جوار کے بڑے بڑے علاقوں کا گورنر بنا کر بھیجا اور یہ سب کچھ بشر بن مروانؒ کے انتقال کے بعد ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عبدالملکؒ کے خیال میں اہلِ عراق کی سرکشی و بغاوت روکنے کی قابلیت سوائے حجاجؒ کے اور کسی میں نہ تھی۔ صرف وہی اپنے رعب و دبدبہ، شان و شوکت اور ہیبت و عظمت کے ذریعہ اہلِ عراق کی سرکشی اور فتنہ انگیزیوں پر غالب آسکتے تھے، چنانچہ عبدالملک بن مروانؒ نے حجاجؒ کو مدینہ خط لکھ کر ان کو عراق کی گورنری سپرد کیے جانے کی اطلاع دی۔ امیر حجاجؒ کو جیسے ہی خلیفہ عبدالملکؒ کا حکم نامہ ملا، وہ اپنے ۱۲ شہسواروں کے ہمراہ مدینہ سے عراق کے لیے روانہ ہوگئے۔''(۱)

امیر حجاجؒ جب عراق میں داخل ہوئے تو جمعہ کا دن تھا اور مؤذن جمعہ کی پہلی اذان دے چکا تھا۔ امیر حجاجؒ لوگوں کو اطلاع کیے بغیر منبر پر جا کر بیٹھ گئے اور کافی دیر تک خاموش رہے اور پھر اٹھ کر انتہائی فصیح و بلیغ تقریر کی جس میں اہلِ عراق کو ان کی سرکشی پر سختی سے متنبہ کیا اور نافرمانی کی صورت میں سزاؤں سے ڈرایا۔ علامہ ابن کثیرؒ اس متعلق لکھتے ہیں:

۱۔ البدایہ والنہایہ، جلد ۹، صفحہ ۷۔

''امیر حجاجؒ منبر پر چڑھے اور لوگ ان کے منبر کے نیچے جمع ہو گئے۔ حجاجؒ نے بہت دیر تک سکوت اختیار کیا حتیٰ کہ محمد بن عمیر نے اپنی مٹھی کنکریوں سے بھر لی اور یہ کہہ کر ان پر کنکریاں پھینکنے کا ارادہ کیا کہ اللہ اس کا برا کرے، کیسی تھکا دینی والی تقریر کرنے لگا ہے اور ان کی برائی بیان کرنے لگا۔ پھر امیر حجاجؒ نے کھڑے ہوکر تقریر کی، جب وہ تقریر ختم کر چکے تو محمد بن عمیر کے ہاتھ سے کنکریاں گرنا شروع ہوگئیں اور اس کو پتہ بھی نہ چلا کیونکہ وہ امیر حجاج بن یوسفؒ کی فصاحت و بلاغت میں گُم ہو کر رہ گیا تھا۔''(۱)

عراق کی امارت سنبھالنے کے بعد امیر حجاج بن یوسفؒ نے مختلف بغاوتوں کو فرو کرنے کی طرف دھیان دیا جن میں ازارقہ اور خوارج کی سرکشی سر فہرست تھی۔ اس غرض کے لیے انھوں نے مہلب بن ابی صفرہ اور عبدالرحمٰن بن مخنف کو مہم سر کرنے بھیجا۔ امیر حجاجؒ اور ان کے مقرر کردہ عمال اپنے ماتحت علاقوں کی بغاوتوں اور سرکشیوں کا اچھے سے قلع قمع کرتے رہے یہاں تک کہ ان حضرات کی فوجی اور انتظامی کاروائیوں سے متاثر ہوکر امیر عبدالملک بن مروانؒ نے جناب امیہ بن عبداللہؒ کو خراسان کی امارت سے معزول کر کے اس کو بھی امیر حجاجؒ کی ماتحتی میں دے دیا۔ علامہ ابن کثیرؒ اس واقعہ کو ۷۸ ہجری کے ذیل میں رقم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اسی سال عبدالملک نے امیہ بن عبداللہ کو خراسان کی امارت سے معزول کر کے امیر حجاجؒ کو سجستان کے ساتھ ساتھ خراسان پر بھی عامل بنا دیا۔ امیر حجاجؒ شبیب خارجی کے معاملے سے فارغ ہو کر کوفہ سے بصرہ منتقل ہوگئے اور کوفہ کی امارت پر اپنی جگہ مغیرہ بن عبداللہ عامر الحضرمی کو مقرر کر گئے۔ اس اثناء میں مہلب بھی ازارقہ و خوارج کا خاتمہ

۱۔ البدایہ والنہایہ، جلد ۹ صفحہ ۹۔

کر کے حجاجؒ کے پاس بصرہ پہنچ گیا۔ امیر حجاجؒ نے مہلب کی عزت افزائی کے لیے اس کو اپنے تخت پر بٹھایا اور ان فوجیوں کو طلب کیا جنھوں نے جنگ میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا اور بے جگری سے لڑے تھے۔ مہلب جس فوجی کی تعریف کرتا جاتا امیر حجاجؒ اس کو انعام و اکرام سے نوازتے جاتے۔ اس کے بعد امیر حجاجؒ نے سجستان کی گورنری مہلب کو تفویض کی اور عبداللہ بن ابی بکرہ کو خراسان کا گورنر مقرر کیا۔ "(۱)

المختصر امیر حجاجؒ کے دور میں اندرونی خلفشار اور بغاوتیں فرو ہوتی گئیں جس کی وجہ سے جہادِ اسلامی کی طرف مکمل طور سے مسلمانوں کی توجہ مرکوز ہوسکی۔ ابن کثیرؒ تصریح کرتے ہیں کہ عراق کا والی بننے کے بعد امیر حجاجؒ نے جہادِ اسلامی کا علَم بلند کیا اور کئی فتوحات حاصل کیں، حتیٰ کہ اسلامی فتوحات کا دائرہ بلادِ ہند اور سندھ تک پھیل گیا۔ ہر سو حجاجؒ کی ہدایات پر مسلم افواج کی کاروائیاں جاری رہیں یہاں تک کہ مسلمان یلغار کرتے ہوئے بلادِ چین تک پہنچ گئے۔ (۲)

علامہ ابن کثیرؒ ۹۵ ہجری کے واقعات کی سرخی قائم کر کے لکھتے ہیں:

"اسی سال عباس بن ولید نے بلاد روم میں جنگ کر کے بہت سے قلعے فتح کیے، اسی زمانہ میں مسلمہ بن عبدالملکؒ نے بلاد روم کا ایک شہر فتح کیا۔ اسی برس محمد بن قاسمؒ نے بلاد ہند کے شہر ملتان کو فتح کیا اور وہاں سے بہت سا مال غنیمت حاصل کیا۔ سالِ رواں ہی میں موسیٰ بن نصیرؒ بلادِ اندلس میں جہاد کرتے ہوئے افریقہ پہنچ گئے، واپسی میں اس کے ساتھ تیس ہزار قیدی تھے۔ اسی زمانے میں قتیبہ بن مسلمؒ نے بلادِ شام میں قتال

۱۔ البدایہ والنہایہ، جلد ۹ صفحہ ۲۱۔

۲۔ البدایہ والنہایہ، جلد ۹ صفحہ ۱۱۶۔

کیا اور بہت سے شہر اور علاقے فتح کیے۔ اسی اثناء میں حجاجؒ کی موت کی خبر آ گئی جس سے تمام چیزوں پر پانی پھر گیا اور فوجوں نے مزید پیش قدمی چھوڑ کر شہر کا رخ کرنا شروع کر دیا۔ اس موقع پر شاعر نے دو شعر کہے تھے

؎ میری زندگی کی قسم حجاجؒ بے شمار خوبیوں کا مالک تھا

؎ اگر تُو زندہ رہے تو مجھے اپنی زندگی کی کوئی پرواہ نہیں اور اگر تُو مر جائے تو تیرے بعد زندگی کا کوئی فائدہ نہیں۔ (۱)

امیر حجاجؒ کی جہادی مساعی اور فتوحات اس قدر زیادہ ہیں کہ اس پر خود ایک الگ مستقل کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ ان تمام فتوحات میں جہاں امیر حجاجؒ کے لائق سپہ سالاروں کا عمل دخل ہوتا تھا وہیں خود امیر حجاجؒ کی ہدایات اور بروقت رسد کا اہتمام بھی شامل تھا۔ دیبل کے محاذ سے جب امیر حجاجؒ کو سپہ سالار عبیداللہ بن نبہان اور بدیل بن بجلی کی شہادت کی خبر آتی ہے تو وہ فوراً اپنے داماد اور چچیرے بھائی محمد بن قاسمؒ کو چھ ہزار شامی فوجوں کی سرکردگی میں ہندوستان روانہ کرتے ہیں۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ امیر حجاجؒ نے اس شامی فوج کے ساتھ بھاری اسلحہ اور جدید آلاتِ حرب کے ساتھ ضرورت کی ہر چیز بھیجی تھی یہاں تک کہ سامانِ رسد کے ساتھ سوئی دھاگہ تک بحری راستہ سے روانہ کیا گیا تھا۔ امیر حجاجؒ کو محمد بن قاسمؒ کی اس مہم سے اس قدر تعلقِ خاطر تھا کہ ہر تیسرے روز محاذِ جنگ سے خبریں منگواتے اور پھر حالات کا گہرائی کے ساتھ تجزیہ کر کے تیز رفتار ترین قاصد کے ہاتھ مناسب جنگی ہدایات بھیجتے تھے۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ جب دیبل کے محاصرے نے طوالت اختیار کی اور کوئی نتیجہ نہ نکلا تو امیر حجاجؒ نے محمد بن قاسمؒ کو لکھا کہ منجنیق کا ایک زاویہ کم کر کے مشرقی جانب دیول کی تیرتھ گاہ پر سنگ باری کی جائے۔ تا کہ تیرتھ گاہ کے اونچے مینار پر لگا

---

۱۱ البدایہ و النہایہ، جلد ۹ صفحہ ۹۔

سرخ جھنڈا زمین بوس ہوجائے، اس سے اہل شہر کی ہمتیں پست ہوجائینگی۔ اور یوں ہی ہوا۔ اہل شہر نے اسے بدشگونی سمجھا اور ان کی ہمتیں پست ہوگئیں اور مسلمانوں نے شہر فتح کرلیا۔(۱)

اسی طرح امیر حجاجؒ نے جب ۸۶ھ میں مفضل بن مہلب کی جگہ قتیبہ بن مسلمؒ کو خراسان کا حاکم مقرر کیا تو قتیبہ بن مسلمؒ نے امیر حجاجؒ کی ہدایات اور مدد کے ذریعے کئی عظیم فتوحات کیں اور چین کی سرحد تک اسلامی افواج کو پہنچادیا۔ علامہ ابن جریر طبری ۸۹ھ کے واقعات میں امینیہ کی فتح کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ ۸۹ھ میں فتح بخارا کے قصد سے جب قتیبہ بن مسلمؒ نے دریائے جیحون کو عبور کیا تو امیر حجاجؒ ان سے ہر دم مسلسل رابطے میں تھے اور ان کو فوری اور مناسب ہدایات سے نواز رہے تھے۔ شاہ بخارا سے مقابلے کے پہلے پڑاؤ میں قتیبہ بن مسلمؒ کو جب فتح نصیب نہیں ہوئی تو انھوں نے امیر حجاجؒ کو جنگ کا نقشہ اور حالات لکھ بھیجے۔ امیر حجاجؒ نے اس کے جواب میں قتیبہ بن مسلمؒ کو جو ہدایات جاری کیں وہ ان کے خشیت الٰہی اور شوق جہاد کی اصل غایت کی مظہر ہیں۔ امیر حجاج نے قتیبہ کو لکھا کہ :

ان ارجع الی مراغتك فتب الی اللہ مما کان منك اتہا من مکان کذا او کذا۔(۲)

''تم اپنے خلوت خانہ میں جاؤ اور خلوصِ نیت سے اللہ کے حضور توبہ کرو اور پھر ان سمتوں اور ان راستوں سے (بخارا پر) چڑھائی کرو۔''

چنانچہ امیر حجاجؒ کی ہدایات کی روشنی میں ۹۰ھ میں قتیبہ بن مسلمؒ دوبارہ بخارا پر حملہ آور ہوئے اور اس بے جگری سے لڑے کہ دشمن کو گھٹنے ٹیکتے ہی بنی اور یوں مسلمانوں کا بخارا پر قبضہ ہوگیا۔ قتیبہ بن مسلمؒ نے امیر حجاجؒ کو فتح کی خوشخبری دی تو

۱۔ فتوح البلدان البلاذری، صفحہ ۴۴۲۔

۲۔ طبری، جلد ۶، صفحہ ۴۴۰۔

مارے فرطِ جذبات کے اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو گئے ۔(۱)

۸۰ ہجری میں مکّہ میں ایک تباہ کن سیلاب آیا۔ امیر حجاجؒ فوراً کوفہ سے مکہ عازمِ سفر ہوئے اور اونٹ پر لاد لاد کر لوگوں اور سامان کو شہر سے باہر نکالا۔ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں:

ففیھا کان السیل الحجاف بمکة لأنه حجف علی کل شئ فذھب به، وحمل الحجاج من بطن مکة الجمال بما علیھا، والرجال والنساء لا یستطیع أحد أن ینقذھم منه، وبلغ الماء إلی الحجون، وغرق خلق کثیر، وقیل إنه ارتفع حتی کاد أن یغطی البیت والله أعلم ۔(۲)

"اس سال (۸۰ھ میں) مکہ مکرمہ میں تباہی پھیلانے والا سیلاب آیا جو مکہ کی تمام چیزوں کو بہا کر لے گیا۔ امیر حجاجؒ نے مکہ سے اونٹوں پر لاد کر سامان باہر نکالا۔ لوگوں کا سیلاب سے بچ نکلنا ناممکن ہو گیا۔ سیلاب کا پانی وادی مکہ میں جمع ہو کر مقام حجون تک پہنچ گیا تھا جس میں خلقِ کثیر غرق ہو کر مر گئے اور کہا جاتا ہے کہ پانی اتنا اونچا ہو گیا تھا کہ بیت اللہ کے غرق ہونے کا خدشہ ہو گیا تھا۔ واللہ اعلم۔"

امیر حجاجؒ کے فسق و ضلال کی داستانوں کے غیر معتبر ہونے کی بابت ڈائریکٹر ادارہ علوم اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ، پروفیسر ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی صاحب لکھتے ہیں:

"حجاج بن یوسف ثقفیؒ کی سیرت و کردار کو اسی طرح مسخ کیا گیا ہے جس طرح بنو امیہ کے صحابہ کرام اور خلفاء عظام کی سیرت و کردار کو

۱۔ فتوح البلدان، صفحہ ۲۰۷۔

۲۔ البدایہ والنہایہ، جلد ۹، صفحہ ۳۱۔

کیا گیا حالانکہ وہ اتنے بُرے اور بدکردار نہیں تھے۔ ان میں بڑی خوبیاں تھیں اور ان میں سے ایک مردم شناسی تھی۔ وکیع کندی اور ابن حزم کا بیان ہے کہ ۷۴ھ میں حجاج بن یوسف ثقفیؒ نے حضرت عبداللہ بن قیس بن مخرمہ مطلبیؒ کو، جو بنو ہاشم کے قریبی حلیف اور خاندان بنی عبدمناف کے ایک ممتاز فرد تھے، مدینہ منوّرہ کا قاضی مقرر کیا اور جب اگلے سال ان کو مدینہ سے معزول کر کے عراق کا گورنر بنایا گیا تو حجاج ثقفیؒ نے اپنے ہاشمی قاضی کو اپنا جانشین گورنر مقرر کیا۔(۱) مذکورہ بالا روایات سے خلیفہ عبدالملک بن مروانؒ اور ان کے والیوں اور اہل خاندان کے بنو ہاشم سے قریبی روابط اور عزیزانہ تعلقات کا علم ہوتا ہے۔"(۲)

امیر حجاجؒ کی ایسی ہی ایک مردم شناسی اور تقرری کا تذکرہ حافظ ابن کثیر دمشقیؒ نے بھی کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اسی سال (۷۹ھ میں) قاضی شریح نے (بسببِ کبرسنی) قضاۃ کے منصب سے استعفیٰ دے دیا جسے امیر حجاجؒ نے منظور کر لیا اور ان کی جگہ ابو بردہ بن ابو موسیٰ الاشعریؒ کو مقرر کردیا۔"(۳)

یہ ابو بردہؒ سیدنا ابو موسیٰ اشعریؓ کے بیٹے تھے اور اپنے زہد و تقویٰ میں مشہور و ممتاز تھے۔

ایک روایت کے تحت امیر حجاجؒ نے قرآن کو رکوعوں میں تقسیم کروایا جو کہ قرآن کی سب سے بہترین اور ذوقی تقسیم مانی جاتی ہے جبکہ دوسری روایت کے تحت قرآن پر نقطے اور حرکات لگوانے کا کام حجاج بن یوسفؒ نے کروایا۔ الغرض دونوں میں

۱۔ کتاب الولاۃ و القضاۃ از وکیع کندی، صفحہ ۱۲۴، جمھرۃ الانساب از ابن حزم، صفحہ ۶۶۔

۲۔ بنو ہاشم اور بنو امیہ کے معاشرتی تعلقات، صفحہ ۹۳۔

۳۔ البدایہ و النہایہ، جلد ۹ صفحہ ۳۰۔

سے جو بھی کام حجاجؒ نے کروایا ہو، وہ ان کے قرآن کے ساتھ شغف پر دلالت کرتا ہے۔ اسی بات کی جانب ڈاکٹر مصطفیٰ سباعیؒ اپنی کتاب ''السنۃ و مکانتہا فی التشریع الاسلامی'' میں اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''حجاجؒ اور بعض علماء کے درمیان جو کچھ ہوا اس کا سبب دولتِ امویہ کے مخالفین کے دبانے میں اس کا سخت رویہ تھا نہ کہ اس کا فسق و ضلال میں مبتلا ہونا۔ یہ کس طرح ہوسکتا تھا جبکہ اس کو حروفِ قرآن پر نقطے لگانے اور شکلِ کلمات کا شرف حاصل ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ اس کو کتاب اللہ کے ساتھ بہت شغف تھا، یہ شغف صرف اسی شخص کو حاصل ہوسکتا ہے جس کے اندر دینداری کی جڑیں بڑی گہری ہوں۔''(۱)

تاریخ نگاری کا مبحث:

امیر حجاجؒ کے خلاف تاریخ میں فسق و ضلال اور ظالم و جابر ہونے کی روایتیں کس طور سے بار پاسکیں تو اس کا جواب بھی ڈاکٹر مصطفیٰ سباعیؒ اپنی اسی کتاب کے صفحہ نمبر۳۷۶ میں دیتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ:

> ''بنو امیہ جاہل و مطلق اور اسلامی تعلیمات و آداب سے یکسر بے گانہ تھے، یہ تاریخی حقائق پر عظیم افتراء ہے۔ یہ ایک طے شدہ بات ہے کہ جن کتبِ تاریخ میں اموی دور کی یہ تصویر کھینچی گئی ہے وہ سب کی سب خلافتِ عباسیہ میں تصنیف کی گئی ہیں۔ خلفاء بنی عباس کا عصر و عہد بنوامیہ کی عداوت سے بھرپور تھا۔ مؤرخ اور واقعہ نویس عباسی دور میں من مانی کارروائیاں کرتے رہے تھے۔ عباسی عہد کے مؤرخین نے بنو امیہ کے بارے میں جو کچھ تحریر کیا تھا، اس نے اسلامی تاریخ میں

۱۔ السنۃ و مکانتہا فی التشریع الاسلامی، صفحہ ۳۷۷۔

ایک خطرناک حصہ ادا کیا۔ تاریخی کتب کے ان مندرجات کو لوگ حقائق تصور کرنے لگے۔ حالانکہ ان کی حیثیت ان بے بنیاد واقعات سے زیادہ نہ تھی جو زبان زد عام ہوتے ہیں۔ یہ من گھڑت واقعات عباسیہ اور غالی شیعہ و روافض کے ساختہ پرداختہ تھے۔ لہٰذا بنو امیہ کے بارے میں نقد و تبصرہ کے بغیر کتبِ تاریخ و اخبارات کے مندرجات کو تسلیم نہیں کرنا چاہیے۔"(۱)

عراقی مؤرخ عبدالواحد ذنون طٰہٰ جو کہ موصل یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر ہیں، اسی بات کو ذرا زیادہ وضاحت کے ساتھ اس طرح سے لکھتے ہیں:

"جیسا کہ یہ بات معروف ہے کہ اموی دور کی تاریخ عباسی دور میں لکھی گئی اور عباسیوں کی مکمل کوشش ہوا کرتی تھی کہ وہ امویوں کو نقصان پہنچائیں اور ان کتب کو ضائع کریں جو امویوں کے بارے میں کلام کرتی ہیں۔ اموی دور پر لکھنے والے اکثر مؤرخین عباسی دور کے ہیں جس کی وجہ سے انھوں نے امویوں کے ظلم وستم کے بیان میں مبالغہ سے کام لیا اور بطور مثال حجاج بن یوسف کو پیش کیا جس کے مزاج میں موجود شدت نے ان کا کام آسان کردیا۔ لہٰذا انھوں نے اس کی شدّت کے بیان میں مبالغہ سے کام لیا اور اس کے بارے میں جھوٹی روایات گھڑیں تاکہ اس کے دورِ حکومت کو خصوصاً اور بنو امیہ کے دورِ حکومت کو عموماً بدنام کیا جا سکے۔ اس کے علاوہ اس زمانے کے واقعات وحوادث نے ان مؤرخین و رواۃ کو حجاج اور امویوں سے لوگوں کو متنفر کرنے کے لیے ایک بہترین موقع فراہم کردیا۔ اس دور میں ایسی بغاوتوں کی تعداد کافی زیادہ ہے جن کا قلع قمع حجاج نے کیا جس کی وجہ سے اس کے

۱۔ السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی، صفحہ ۳۷۶۔

دشمنوں کی تعداد کافی زیادہ ہوگئی۔ ایک طرف زبیری ہیں جن کی حجاز و عراق میں سلطنت کو حجاج نے ختم کیا جس کی وجہ سے وہ اس سے ناراض تھے دوسرے طرف علویوں کے انصار اس سے دشمنی کرتے تھے کیونکہ اس نے بنو امیہ کے حکم کو عراق میں نافذ کیا۔ پھر مہالبہ تھے جو اس لیے نالاں تھے کہ حجاج نے ان کے مصالح پر ضرب لگائی اور یزید بن مہلب کو خراسان کی ولایت سے محروم کیا۔ خوارج اس لیے اس پر غضب ناک تھے کہ اس نے ان کی تحریکوں کو ناکام و نامراد کیا اور ان کے عزائم کو خاک میں ملادیا۔ ان تمام گروہوں میں ادباء و شعراء اور رواۃ و مؤرخین کی بڑی تعداد موجود تھی جنھوں نے اپنی زبان و قلم کی صلاحیتوں سے حجاج اور اس کی سیاست کو بدنام کرنے کی پوری کوشش کی، مثلاً کتبِ ادب میں ایسے واقعات لکھے گئے جو حجاج کی شدت کو اور اس کے سخت احکامات کو مبالغہ کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ان کے نتیجہ میں ان روایات کا ظہور ہوا جن میں حق و باطل کو مختلط کردیا گیا اور جو صریح جھوٹ پر مبنی ہیں جن کو نا عقل مانتی ہے اور نہ تاریخی حقائق ان کی تصدیق کرتے ہیں، اور نہ ہی علمی تحقیق میں جن کا اعتبار کیا جا سکتا ہے جس کی ایک مثال جامع بصرہ میں ۷۰ ہزار نمازیوں کے قتل والی روایت ہے۔''(۱)

بعینہٖ اسی طور کا ''مقدمۂ تاریخِ بنو امیہ'' پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی ندوی صاحب نے بھی اپنی کتاب ''خلافت اموی، خلافت راشدہ کے پس منظر میں'' میں قائم کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''بنی امیہ کے سنہری اور زریں ادوارِ خلافت کے بارے میں اولین مواد

۱۔ العراق فی عھد الحجاج صفحہ ۷ تا ۸ از عبدالواحد ذنون طہٰ۔

بنیادی طور سے تین رافضی وقائع نگاروں نے پیش کیا: ابومخنف لوط بن یحییٰ ازدی (م ۱۵۷/ ۷۷۳ء)، سیف بن عمر تمیمی (م ۱۵۴/ ۷۷۰ء) اور عوانہ بن حکیم کلبی (م ۱۴۷/ ۷۶۴ء)۔ یہ وہ بنیادی حولیات نگار تھے جنھوں نے اموی دشمنی کا سارا مواد تاریخ میں بھردیا۔ امام طبریؒ نے اپنی تاریخ کو ان کی ناپاک روایات سے ایسا بھر دیا کہ شیعیت و رافضیت کے امام بن گئے، حالانکہ وہ شیعہ تھے نہ رافضی۔ مگر ان کی تاریخ میں بازاری گپوں اور عوامی قصوں کی ایسی بھرمار ہوگئی کہ وہ تاریخ سے زیادہ افسانۂ تاریخ بن گئی۔ ان کے بعد کے تمام مؤرخین نے جن میں امامانِ حدیث بھی شامل ہیں، ان کی روایات کو بے محابا نقل کیا، اگرچہ انھوں نے اپنی طرف سے صحیح حقائق کو بھی حدیث و تاریخ کے صحیح تر اور معتبر تر ذخیرے سے متوازن بنانے کی کوشش کی مگر اصلاح وتوازن کی یہ کوشش غلاظت کے انبار میں طہارت کے چند قطروں کے مانند تھی اور غلاظت دور نہ ہوسکی بلکہ اور متعفن ہوگئی۔ ۔ ۔

تاریخِ طبری بعد کے مؤرخین اور وقائع نویسوں کا بنیادی ماخذ ہے۔ ابن اثیر کی ''الکامل'' بلاحوالۂ ماخذ ،طبری کی تلخیص پیش کرتی ہے۔ دونوں کی روایات کا موازنہ اور بیانیہ کا واقعہ بہ واقعہ مقارنہ اس حقیقت کو ثابت کرتا ہے۔ حقیقت کا تقاضہ ہے کہ یہ تقابل کیا جائے۔ حتیٰ کہ امامِ حدیث وسنن ابن کثیر دمشقیؒ اپنی تاریخ ''البدایہ و النہایہ'' میں ہشام کلبی اور ابومخنف لوط بن یحییٰ کوفی اخباری کے بیانات و روایات سے ان تمام ''حوادث وفتن ایام'' کا ذکر کرتے ہیں بلکہ ان ہی سے آغاز کرتے ہیں۔ وہ اس شیعی رجحان و رافضی بیان سے اس قدر مرعوب ہیں کہ خلافتِ معاویہؓ کو ''ایّامِ معاویہ بن ابوسفیان'' ہی کہتے ہیں۔'(۱)

۱۔ خلافت اموی، خلافت راشدہ کے پس منظر میں، صفحہ ۱۷۵ تا ۱۷۷۔

اسی بات کو زیادہ محتاط طریقے سے فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ نے اپنی کتاب ''خلافت و ملوکیت کی تاریخی و شرعی حیثیت'' میں متعدد جگہ بیان کیا ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

''مؤرخین نے تاریخی روایات کا ذخیرہ کرتے وقت اسناد و تحقیق اور چھان بین کا وہ اہتمام نہیں کیا جس کا فی الواقع وہ مستحق تھا۔''(۱)

اسی ضمن میں ابنِ سعد کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''ابن سعد جن کی عدالت و ثقاہت اور جلالتِ قدر مسلّم ہے، ان کی کتاب ''الطبقات الکبریٰ'' بھی اسی حیثیت سے قدیم ترین ماخذ اور دوسری کتب کے مقابلے میں اس کی اسنادی حیثیت بھی زیادہ ہے، لیکن انھوں نے اپنی کتاب میں بے شمار روایات ضعیف و مجروح راویوں سے قبول کر کے بغیر کسی نقد و جرح کے درج کر دیں، جس نے کتاب کی اسنادی حیثیت کو قدرے مجروح کر دیا ہے۔''(۲)

اسی طرح ابن کثیر دمشقیؒ کی بابت تفصیل سے لکھتے ہیں:

''ابن کثیرؒ کی البدایہ و النہایہ نسبتاً بہت بہتر ہے اور متعدد مقامات پر انھوں نے طبری وغیرہ کی روایات پر نقد کر کے ان کو رد کر دیا ہے تاہم اس کے باوجود انھوں نے بیشتر اعتماد طبری پر کیا ہے، یہاں تک کہ بعض واقعات کے متعلق تو انھوں نے یہاں تک کہا ہے کہ ان کی صحت میرے نزدیک مشتبہ ہے لیکن چونکہ میرے پیش رَو ابن جریر وغیرہ ان کو ذکر کرتے آئے ہیں، اس لیے میں نے بھی ان کی متابعت میں ان چیزوں کا ذکر کر دیا ہے، اگر وہ انھیں ذکر نہ کرتے، میں بھی

۱۔ خلافت و ملوکیت کی تاریخی و شرعی حیثیت، صفحہ ۱۴۴۔

۲۔ ایضاً، صفحہ ۱۴۵۔

انھیں ہرگز درج ِکتاب نہ کرتا۔[1] یہی وجہ ہے کہ ابن کثیر کی البدایہ و النہایہ میں متعدد مقامات پر ہمیں واضح تضادات ملتے ہیں، ایک روایت کی صحت ان کے نزدیک مشکوک ہوتی ہے اور وہ ایک مقام پر اس کا اظہار بھی کردیتے ہیں لیکن دوسرے مقام پر پھر وہی غیر صحیح و مشکوک روایت تسلسلِ واقعات میں اس طرح ذکر کردیتے ہیں گویا وہ روایت ان کے نزدیک بالکل صحیح ہے، وہاں اس کے ضعف کی طرف کوئی اشارہ نہیں کرتے، دراں حالیکہ دوسرے مقام پر اس کے ضعف کی صراحت کرچکے ہوتے ہیں، ظاہر ہے یہ تضاد محض اسی وجہ سے پایا جاتا ہے کہ انھوں نے بھی ایک تو اپنے پیشروؤں پر حد سے زیادہ اعتماد کیا۔ دوسرے ان ہی کی طرح غیر جانبدارانہ روش اختیار کی۔“[2]

علامہ ابن کثیر دمشقیؒ کے جس طرز عمل کی جانب حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ نے توجہ دلائی ہے، اس کا جابجا نمونہ ان کی کتابِ مذکور میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ مثال کے طور پر تاریخی واقعات کے ضمن میں جب خلافت یزید بن معاویہ کا ذکر کرتے ہیں تو ”امارۃیزیدبن معاویہ وماجریٰ فی ایامہ من الحوادث والفتن“ کے تحت راس الحسین تک پورا واقعہ ابومخنف ہی کی روایات کے تحت بیان کرتے ہیں اور خلافت یزید و کردار یزید کا نہایت کریہہ نقشہ پیش فرماتے ہیں۔ لیکن خلافت یزید کے خاتمہ پر ترجمۃ یزید بن معاویہ میں خلیفہ یزید کے خصالِ محمودہ کا بھی ذکر کرتے ہیں اور واقعات کربلا و حرّہ وغیرہ کا خلافت کے نقطۂ نظر سے تجزیہ کرکے ان کو خلیفۂ مقرر کی اطاعت سے نکل جانے سے تعبیر کرتے ہیں۔[3] بعینہٖ یہی تضاد بیانی ابن کثیرؒ کے

۱۔ البدایہ و النہایہ، جلد ۸، صفحہ ۲۰۲۔

۲۔ خلافت وملوکیت کی تاریخی و شرعی حیثیت، صفحہ ۱۵۱، ۱۵۲۔

۳۔ البدایہ و النہایہ، جلد ۸، صفحہ ۲۲۶ تا ۲۳۷۔

ہاں آپ کو تمام اموی و مروانی خلفاء کے ذیل میں نظر آتی ہے چاہے وہ عبدالملک بن مروانؒ ہوں یا ولید بن عبدالملکؒ یا پھر ان دونوں کے معتمد گورنر حجاج بن یوسف ثقفیؒ، جن کے ظلم و شقاوت کا ذکر بھی ابن کثیرؒ کرتے ہیں تو ان کی خشیت الٰہی اور حبِّ قرآن پاک کو بھی پیش کرتے ہیں۔

تاریخی روایات کے رد و قبول کے اصول:

یاد رکھیے کہ اسلام کا قانون شہادت آپ سے مطالبہ کرتا ہے کہ جب کسی مسلمان کی طرف فسق کی نسبت ہورہی تو اس بابت معروف و معتبر ادِلّہ موجود ہوں۔ مسلمان کی طرف فسق کی نسبت کرنے والے شاہدین کا کردار عدالت کے تقاضوں پر پورا اترتا ہو۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو فسق کی نسبت غیر معتبر ٹھہرے گی۔ اسی لیے ہمارا یہ ماننا ہے کہ جن روایات سے خیر القرون کے کسی انسان کے کردار سے متعلق کلام پیدا ہوتا ہے تو اس بابت اسلام کا اصول شہادت کم از کم یہ مطالبہ کرتا ہے کہ ایسی روایت کو خبر کو پرکھنے کے اصولوں پر جانچ لیا جائے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ہر خبر کو اس معیار پر جانچا جائے لیکن کم از کم جس خبر سے کسی مسلمان کے کردار پر حرف آتا ہو، اس کی جانچ سورۃ الحجرات کے تحت ایک لازمی تقاضہ ہے۔ ہمارے اسی مقدمہ کے متعلق امام ابن تیمیہ اپنی کتاب منہاج السنۃ میں جلد ۴ ص ۱۰ تا ۱۲ میں رقم طراز ہیں:

> ''منقولات (روایات) میں صدق و کذب دونوں کی افراط ہے، ان کے مابین تمیز علم حدیث کی رو سے کی جائے گی۔ ۔ ۔ ابو نعیم نے ''الحلیہ'' میں اور ابو بکر وعمر، عثمان وعلیؓ کی کتابِ مناقب میں کئی احادیث ذکر کی ہیں، جن میں بعض صحیح اور بعض ضعیف بلکہ منکر ہیں۔ اگرچہ وہ خود علمِ حدیث کے ماہر ہیں لیکن وہ اور ان جیسے دیگر مصنّفین کا طریقۂ تالیف ہی یہ رہا ہے کہ ایک عنوان پر تمام قسم کی روایات جمع کر دیتے ہیں،

جیسے ایک مفسر تفسیر میں، ایک فقیہہ فقہ میں اور ایک مصنف اپنی تصنیف میں تمام رائے ، اقوال اور دلائل ذکر کر دیتے ہیں تا کہ قارئین پر تمام پہلو واضح ہوجائیں، اگرچہ یہ لوگ اپنی ذکر کردہ چیزوں میں سے بیشتر کی صحت کا اعتقاد نہیں رکھتے بلکہ اس کے ضعف کے معترف ہوتے ہیں کیونکہ وہ کہتے ہیں ، ہمارا کام صرف نقل کرنا ہے، اس کے (غلط و صحیح) کی ذمہ داری تمام تر قائل پر ہے نہ کہ ناقل پر۔

اس طرح وہ لوگ جنھوں نے تاریخ میں کتابیں تصنیف کیں جیسے ابن عساکر وغیرہ ہیں ان کا بھی یہی حال ہے، جب وہ خلفاء اربعہ اور دیگر خلفاء کے حالات لکھتے ہیں تو اس باب میں ہر طرح کی روایات بیان کر دیتے ہیں، اسی طرح جب وہ علیؓ و معاویہؓ کے متعلق روایات ذکر کرتے ہیں تو ایسی ایسی روایات بھی ذکرکردیتے ہیں جن کا جھوٹ اہل علم پر واضح ہوتا ہے۔پس جس شخص کے پاس ذرا بھی علم و انصاف ہے وہ اس بات کو سمجھ لےگا کہ منقولات (روایات) میں جھوٹ اور سچ ہر طرح کا مواد پایا جاتا ہے اور لوگوں نے مثالب (عیوب و نقائص) و مناقب میں کذب بیانی سے کام لیا ہے اور موافقت و مخالفت میں دروغ گوئی سے کوئی اجتناب نہیں کیا، نیز ہمیں معلوم ہے کہ لوگوں نے ابوبکرؓ، عمرؓ کے فضائل میں ایسے ہی جھوٹ تراشے ہیں جس طرح سے علیؓ کے فضائل میں تراشے گئے۔۔۔

بنابریں، بنیادی چیز ہر نوع کی روایات میں یہ ہے کہ نقل کرنے والے ائمہ و علماء کی طرف رجوع کیا جائے گا اور روایت کی صحت وضعف کا پتہ لگایا جائے گا، محض کسی شخص کا یہ دعویٰ کردینا کہ اس روایت کو فلاں (امام و محدث یا مورخ) نے بیان کیا ہے، نہ اہلسنت کے نزدیک

حجت ہے اور نہ شیعہ اسے تسلیم کرتے ہیں۔ مسلمانوں میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے کہ وہ ہر مصنف کی بیان کردہ ہر روایت کو (بغیر تحقیق کیے) قابلِ احتجاج سمجھ لے، اس لیے ہر وہ روایت جس سے کوئی شخص حجت پکڑے، سب سے پہلے ہم اس سے اس کی صحت کا مطالبہ کریں گے، محض کسی روایت کا اس کے راوی کی طرف نسبت کر کے یہ کہہ دینا کہ یہ ثعلبی وغیرہ کی روایت ہے، باتفاق اہل علم، روایت کے صحت کی دلیل نہیں۔''(۱)

علامہ ابن تیمیہ کے اس اقتباس سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ ہر خبر کو پرکھنے کے اصول ہوتے ہیں، خاص کر جب اس سے خیر القرون کے کسی انسان کے کردار پر حرف آتا ہو۔ غیر عادل راوی کی بات کسی انسان کے خلاف قابل قبول نہیں، چہ جائیکہ کہ وہ خیر القرون کے کسی شخص کے بارے میں ہو۔ علامہ معلمی نے کسی جگہ لکھا تھا کہ ''تاریخ کو حدیث سے کہیں زیادہ اس بات کی ضرورت ہے کہ تاریخی واقعات نقل کرنے والے راویوں کی معرفت حاصل کی جائے کیونکہ جھوٹ اور تساہل کا وجود تاریخ میں بہت زیادہ ہے۔'' اور یہی بعینہٖ ہمارا مقدمہ ہے کہ جس طور سے احادیث کی تنقیح کا کام ہوا ہے، اسی طور سے تاریخ کی تنقیح اور تجزیہ کا کام بھی ہونا چاہیے اور کوئی خبر بغیر چھان پھٹک کے قبول نہ کی جائے، خاص کر جب کہ اس سے کسی شخص کا کردار بھی مجروح ہوتا ہو۔ جبکہ تاریخ کی کتب کا یہ حال ہے کہ اکثر روایات بے سند ہوتی ہیں، کسی کو ''ذکروا'' اور کسی کو ''قیل'' یا ''یقال'' یا ''روی عن اصحابنا'' یا اسی طرح کے اور مبہم سے الفاظ کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہوئی کہ علامہ سیّد حسین احمد مدنی نے اپنے مکتوبات میں صراحتاً لکھا ہے:

''مؤرخین کی روایتیں تو عموماً بے سروپا ہوتی ہیں، نہ راویوں کا پتہ ہوتا

۱۔ منہاج السنۃ، جلد ۴، ص ۱۰ تا ۱۲۔

ہے اور ان کی توثیق وتخریج کی خبر ہوتی ہے، نہ انفصال و انقطاع سے
بحث ہوتی ہے اور اگر بعض متقدمین نے سند کا التزام بھی کیا ہے تو عموماً
ان میں ہر غث وثمین سے ارسال و انقطاع سے کام لیا گیا ہے خواہ ابن
اثیر ہوں یا ابن قتیبہ، ابن ابی الحدید ہوں یا ابن سعد۔" (۱)

پھر یہ بھی یاد رہے کہ دورِ بنو عباس میں جب تاریخ کی تدوین کا کام ہوا تو اس وقت جو کتابیں مدوّن ہوئیں وہ تاریخ نہیں بلکہ "مواد تاریخ" پر مبنی تھیں۔ ان کتابوں میں مؤرخین نے صحیح، غیر صحیح، مستند، غیر مستند، قوی، ضعیف ہر طرح کی روایات جمع کرنے کا التزام کیا تھا تاکہ بعد میں آنے والے مؤرخین ان روایات کی چھان پھٹک کرکے صحیح تاریخ از خود مرتب کرلیں۔ لیکن بعد کے مؤرخین نے بجائے اس کے کہ ان روایات کی تنقیح کرکے صحیح تاریخ مرتب کرتے، انھوں نے ان روایات کو مِن وعَن وقائع نگاری کرکے اپنی کتب میں بغیر کسی تنقیح کے، از سرنو مرتّب کردیا۔ علامہ ابن کثیرؒ اور ابن خلدونؒ نے اس بابت تھوڑی بہت کوشش کی اور بعض روایات کی تنقیح کا کام بھی کیا لیکن ابن جریر طبری سے آگے وہ بھی نہ نکل سکے، یہاں تک کہ ابن کثیرؒ نے تو صراحتاً اعتراف بھی کیا :

"اور جو کچھ ہم نے لکھا ہے اس میں سے بعض حصہ محلِ نظر ہے اور اگر
ابن جریر طبری اور دوسرے ائمہ حفاظ نے ان روایات کو نقل نہ کیا ہوتا
تو ہم بھی ان کر ترک کردیتے۔" (۲)

گویا صحیح وغیر صحیح روایات کو ایسے ہی مکھی پر مکھی مارتے ہوئے آگے بڑھایا جاتا رہا سو جب تنقیح روایات کا کام ہوا ہی نہیں تو ان کی بناء پر بنی امیہ کے خلفاء وعمّال کے مظالم کی بابت کیونکر یقین کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ مکتوبات شیخ الاسلام، جلد ۱، صفحہ ۲۶۶۔

۲۔ البدایہ والنہایہ، جلد ۸، صفحہ ۲۰۲۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کچھ تاریخی کتب سے متعلق بھی کلام کر لیا جائے تاکہ ان میں موجود مواد سے متعلق صحیح فیصلہ کیا جا سکے۔ تاریخ کی سب سے مشہور کتاب علامہ ابن جریر طبری کی ''تاریخ الامم و الملوک'' ہے۔ ابن جریر طبری مسلمانوں کے مُسلّمہ امام مانے جاتے ہیں تاہم یہ بھی یاد رہے کہ ان کی بابت جمہور محدثین نے تشیع کی اور چند ایک نے رفض کی نسبت کی ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی کتاب کی بیشتر روایات شیعہ راویوں سے مروی ہیں جن میں ابومخنف لوط بن یحییٰ، محمد بن سائب الکلبی اور اس کا بیٹا ہشام الکلبی شامل ہیں۔ ان تینوں رواۃ پر رفض کے ساتھ ساتھ کذب اور دروغ گوئی کی تہمت بھی ثابت ہے۔ سو ایسے راویوں کی روایت کسی بھی مسلمان کی طرف فسق کی نسبت سے متعلق قطعاً قابل قبول نہیں ہوسکتی۔ یہ راوی عام واقعات نقل کریں تو ماننے میں چنداں مضائقہ نہیں لیکن کوئی غیر معمولی واقعہ یا کسی مسلمان کی طرف فسق کی نسبت کریں تو ناقابل حجت قرار دیئے جائیں گے۔ علامہ شبلی نعمانی نے اسی بات کی طرف سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جلد اول، صفحہ ۴۵ میں اشارہ کیا ہے۔ علامہ شبلی لکھتے ہیں:

> ''ابن سعد اور طبری میں کسی کو کلام نہیں، لیکن افسوس ہے کہ ان لوگوں کا مستند ہونا ان کی تصنیفات پر چنداں اثر نہیں ڈالتا، یہ لوگ خود شریکِ واقعہ نہیں، اس لیے جو کچھ بیان کرتے ہیں راویوں کے ذریعے سے بیان کرتے ہیں، لیکن ان کے بہت سے رواۃ ضعیف الروایۃ اور غیر مستند ہیں۔'' (۱)

پھر یہ بھی یاد رہے کہ اپنی کتاب کے مقدمہ میں طبری نے خود اس بات کا اقرار کیا ہے کہ انھوں نے صرف روایات مع سند نقل کرنے کا کام کیا ہے، روایات کی تنقیح کا کام وہ بعد والوں پر چھوڑتے ہیں۔ ایسا ہی کچھ حال علامہ ابن سعدؒ کی

۱۔ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، جلد اول، صفحہ ۴۵۔

''طبقات'' کا بھی ہے۔ ابن سعد کے اساتذہ اور رواۃ میں واقدی، ہشام بن محمد بن سائب الکلبی اور ابومحشر شامل ہیں اور یہ سب حضرات عندالمحدثین سخت لائقِ اعتراض اور کذّاب مشہور ہیں۔ واقدی کی بابت بعض اہل علم حسنِ ظن کے تحت فرمادیتے ہیں کہ محدثین نے واقدی کے ''جداگانہ'' طرز تاریخ کی بناء پر ''بلاوجہ'' ہی لعن طعن کردی۔ جبکہ اصل حقیقت اس سے ماوراء ہے، محدثین کی واقدی پر جرح واقدی کے کذب کی وجہ سے بھی تھی جیسا کہ امام نسائیؒ ، امام ابن المدینیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ نے واقدی کو کذاب، امام بخاریؒ نے متروک اور امام یحییٰ بن معینؒ نے ضعیف قرار دیا ہے۔ یہاں تک کہ امام ذہبیؒ نے تو میزان الاعتدال میں واقدی کے ترجمہ کے تحت تصریح کی ہے کہ واقدی کے ضعف پر اجماع ہوچکا ہے۔ امام شافعیؒ جو کہ مغازی میں واقدی سے روایت لینے کے قائل ہیں، اس کے متعلق یہ کہنے پر مجبور ہوجاتے ہیں کہ کتبِ سیرت کی اکثر بیہودہ روایتوں کا سرچشمہ واقدی کی تصانیف ہیں۔ اور بقول شبلی نعمانی طبقات ابن سعدؒ کا بڑا حصہ واقدی سے ہی ماخوذ ہے۔

اب جہاں تک بات رہی ابن اثیرؒ کی الکامل اور ابن کثیرؒ کی البدایہ و النہایہ کی تو ان کتب کے مؤلفین نے طبری، ابن سعد وغیرہ سے نقلِ روایات کا کام کیا ہے سو ان کی حیثیت محض ناقل اور مرتّبین کی ہے ، البتہ ابن کثیرؒ نے تھوڑی بہت تنقیح کی کوشش کی ہے لیکن ابن اثیرؒ نے تو غالباً چن چن کر مفید مطلب اور ضعیف روایات سے استدلال کیا ہے۔ بنو امیہ و بنو عباس کے خلفاء و عمّال کی بابت تو جانے ہی دیجئے، ابن اثیرؒ کی مشاجرات صحابہؓ سے متعلق روایات کو اگر بلا کسی تنقیح کے قبول کرنا پڑجائے تو دور صحابہؓ کی تاریخ کا ایسا مکروہ چہرہ سامنے آتا ہے کہ جو بیان کرنے سے بھی زبان کپکپائے۔

ہوسکتا ہے کہ ہماری ان گزارشات سے قارئین کو یہ احساس ہو کہ شائد ہم پوری تاریخ کو دریا برد کرنے کی بات کررہے ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے اور نہ ہی کتبِ

تاریخ پر اس تنقیدی مبحث سے ہمارا یہ مقصد ہے۔ ہمارا صرف یہ کہنا ہے کہ کتبِ تاریخ نہ تو اس قدر قابل اعتماد ہیں کہ ان کی ہر روایت اور ہر واقعہ بغیر کسی جرح وقدح کے مِن وعَن تسلیم کرلیا جائے اور نہ ہی ان کی ہر روایت ایسی ہے کہ اس کو ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیا جائے، بلکہ اس بابت ہمارا وہی مؤقف ہے جو کہ قاضی ابو بکر ابن العربی مالکیؒ نے اپنی کتاب ''العواصم من القواصم'' کے آخری صفحہ پر نقل کیا ہے:

> ''میں تم سے صاف صاف کہتا ہوں کہ جب تم اپنے خلاف ایک دینار تو کیا ایک درہم کا دعویٰ بھی اس وقت تک تسلیم نہیں کرتے جب تک کہ مدّعی عادل اور تہمتوں سے برَی اور خواہشاتِ نفسانی سے پاک نہ ہو۔ پس تم احوالِ سلف اور مشاجرات کے بارے میں ایسے آدمی کی بات کو کس طرح تسلیم کرلیتے ہو جن کا عادل ہونا تو کجا خود دین ہی میں کوئی مقام نہیں۔'' (۱)

المختصر ہمارے نزدیک کسی بھی تاریخی واقعہ کی حیثیت ایک ''کرائم انویسٹی گیشن کیس'' کی طرح کی ہے جس میں صرف نقل پر بھروسہ کرنا مناسب نہیں بلکہ حالات کا مشاہدہ اور واقعہ کے وقوع پذیر ہونے کی صورت میں اس کے کیا اثرات مرتّب ہونے چاہییے، کی تفاصیل پر بھی غور کرنا لازم ہے۔ مثال کے طور پر مروانؓ و یزیدؒ اگر ظالم و فاسق تھے تو صحابہ نے اپنی بیٹیاں ان سے کیوں بیاہ دیں، ان کے ہاتھ پر بیعت کیوں کرلی جبکہ آج آپ اور ہم کسی فاسق یا غنڈے کو اپنی بہن بیٹی بیاہنے کو تیار نہیں، کسی ظالم کی حکمرانی قبول کرنے کو تیار نہیں وغیرہ وغیرہ۔ پھر اگر تاریخی روایت کوئی ایسا واقعہ بیان کررہی ہے جو فی الحقیقت وقوع پذیر ہوا ہوتا تو اس کو روایت کرنے والے متعدد آدمی ہونے چاہییں لیکن اگر اس کو روایت کرنے والے ایک دو راوی ہوں تو یہ چیز بھی اس تاریخی واقعہ کے مشکوک ہونے پر دلالت کرتا ہے جیسے

۱۔ العواصم من القواصم، آخری صفحہ۔

تلک الغرانیق کا واقعہ یا پھر یاساریۃ الجبل وغیرہم۔ پھر جس شخصیت کے ظلم کی بابت ہم اپنی اس کتاب میں بحث کررہے ہیں، ان کا دور ۶۰ ہجری کے بعد آتا ہے اور مظالم کی یہ داستانیں ۶۰ ہجری سے لےکر ۹۰ ہجری کی دہائی تک پھیلی ہوئی ہیں اور یہ وہ دور ہے جس دور کی تاریخ کو سند کے ذریعے نقل کیا گیا ہے، سو اس دور سے متعلق ہر واقعہ کی متصل و صحیح سند ہونا ضروری ہے وگرنہ ان کی حیثیت مشکوک ٹھہرتی ہے۔

حجاج بن یوسف ثقفیؒ : تصویر کا دوسرا رخ :

اوپر کی اس طویل تمہید سے یہ بتانا مقصود ہے کہ خلافتِ اسلامیہ سے متعلق بالعموم اور خلافتِ بنی امیہ سے متعلق بالخصوص ان تمام حقائق کو مدِّ نظر رکھ کر کتبِ تاریخ کا مطالعہ کیا جانا چاہیے۔ اب چونکہ امیر حجاج بن یوسفؒ ثقفی کی وجہ سے خلافت بنی امیہ کو استحکام نصیب ہوا اور حکومت کے خلاف خوارج اور علویوں کی بغاوتوں کو سختی سے دبا دیا گیا، اسی لیے دورِ بنوعباس میں تدوین ہونے والی تاریخ میں حجاج بن یوسفؒ کو جی بھر کر مطعون کیا گیا اور ان کے کردار کو صحیح تاریخی روایات کے تحت، جن میں ان کے بغاوتوں کو کچلنے کا ذکر ہے، ظالم و شقی القلب ثابت کرکے مجروح کیا گیا اور ساتھ ہی بغاوتوں کے فرو کرنے کے اس احسن اقدام کو مزید کریہہ دکھانے کے لیے اس پر وضعی روایات کا تڑکا لگایا گیا۔ حجاجؒ کے اقدامات کے اس غیر درست تجزیہ کی بابت محترمہ نگار سجاد ظہیر صاحبہ اپنی کتاب ''عرب اور موالی'' میں یوں شکوہ کناں ہوتی ہیں:

> ''تاریخ کا یہ کوئی صحیح جائزہ اور حجاج بن یوسف کی ذات اور حکمت عملیوں کا یہ کوئی درست تجزیہ نہیں ہے۔ اس بات کو اگر یوں کہا جائے تو تاریخی طور پر زیادہ مناسب ہوگا کہ حجاج بن یوسف اموی حکومت کا وفادار ساتھی اور ان کا انتہائی قابل اعتماد دست راست تھا۔ اپنے بیس سالہ

دورِ ولایت میں اس نے ہر اس مخالفت کا گلا دبا دیا جس نے امویوں کے خلاف صف آرائی کی کوشش کی۔ ۔ ۔ ۔ حجاج بن یوسفؒ کے نزدیک اصل معیار حکومت سے وفاداری تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ رعایا کے تمام طبقوں کی غیر مشروط اطاعت، صرف حکومتِ بنو امیہ کی ہی بنیادی ضرورت نہیں تھی، بلکہ ہر دور میں ہر حکومت کی ضرورت رہی ہے۔ ماضی قریب میں موالی، خصوصاً عراق میں آباد ایرانی موالی ایک جارح عنصر کے طور پر ابھرے تھے، چنانچہ وہ بھی حجاج کی حکمت عملی کے تحت کچلے گئے،جس پر یہ کہا گیا کہ حجاج نے موالی کو ذلیل و کمتر سمجھا، انھیں حقیر جانا اور ان کے خلاف اقدامات کیے، حالانکہ اصل واقعہ یہ تھا کہ اس نے مملکت کے باغیوں کے خلاف اقدامات کیے،خواہ وہ عرب ہوں یا موالی۔ یہ بات اب بخوبی واضح ہوچکی ہے کہ مؤرخین میں ایک گروہ ایسا موجود تھا جس نے نہایت منظّم طریقے سے بنو امیہ،خصوصاً ان کے ممتاز ترین متکلمین و مدبرّین کے تمام کارناموں کو بُری طرح مسخ کیا ہے۔ یہ دبستانِ عراق تھا جس کا سب سے بڑا نمائندہ سیف بن عمر ہے۔تعصب کو نظر انداز کرکے اگر تاریخی تحقیق سے کام لیا جائے تو حجاج کی خوبیاں بھی منظرِ عام پر آئیں گی۔ (۱)

امیر حجاج بن یوسفؒ کی انتظامی سختی سے متعلق اسی طرح کی رائے فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ نے بھی دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”عبدالملک بن مروانؒ کا دورِحکومت تاریخِ اسلام کا انتہائی پرآشوب دور تھا، بیک وقت کئی فتنوں نے ملک میں داخلی انتشار برپا کررکھا تھا،

۱۔ عرب اور موالی، باب ششم: موالی۔ ۔ حکومتی ردعمل کی زد میں للمولف نگار سجاد ظہیر صاحبہ صفحہ ۲۰۰، ۲۰۴، ۲۰۵۔

فتنوں اور شورشوں کو فرو کرنے میں کئی دفعہ ان کو تشدّد آمیز رویہ اختیار کرنا پڑا۔ اس کے بغیر ان کا استیصال ناممکن تھا۔ حجاج جیسے سخت گیر گورنر کی خدمات بھی انھوں نے اسی نقطۂ نظر سے حاصل کی تھیں۔ حجاج کے ظلم آمیز رویئے کی اگرچہ تعریف نہیں کی جاسکتی لیکن اس وقت کے حالات کو بالکلیہ نظرانداز کردینا بھی ایک مؤرخ کے لیے مناسب نہیں۔ حالات پُرامن ہوتے تو حجاج اپنی فطری افتادِطبع کے باوجود وہ کچھ نہ کر سکتا تھا جو اس کے متعلق مشہور ہے، اس کے رویئے میں خودبخود تبدیلی آجاتی۔ حالات اور اہل عراق کی گستاخانہ حرکات نے اس کے سخت مزاج کو سخت تر کر دیا، گویا اس کے تشدد کا مبنیٰ حکومت کا استحکام تھا نہ کہ اس کا فسق وضلال۔'' (۱)

اسی طرح آگے جاکر حافظ صاحب حجاج بن یوسفؒ کے اوصاف حمیدہ اور آزادی رائے کے لیے اس کے توسّع وتحمل کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''خود حجاج بھی حق بات اور حق کہنے والوں کی قدر کرتا تھا۔ سعید بن المسیب بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حجاج اپنے والد کے ساتھ نماز پڑھنے مسجد میں آیا، میں نے اس کو نماز پڑھتے دیکھا، رکوع وسجود وہ پوری طرح نہیں کررہا تھا، میں نے اس وقت ہتھیلی میں کنکریاں اٹھاکر ماریں، اس کے بعد حجاج کا کہنا ہے کہ میں نماز اچھی طرح پڑھتا ہوں۔ یہ واقعہ اس کی گورنری سے پہلے کا ہے، گورنر بن جانے کے بعد وہ سعید بن المسیب کی محض اسی وجہ سے عزت کرتا تھا کہ انھوں نے اس کی نماز درست کرادی۔ (۲) ایک مرتبہ حجاج کی ایک تقریر کے

۱۔ خلافت وملوکیت کی تاریخی وشرعی حیثیت، صفحہ ۴۶۷۔

۲۔ طبقات ابن سعد، جلد ۵ صفحہ ۱۲۹، البدایہ والنہایہ، جلد ۹ صفحہ ۱۲۰۔

دوران اس کے ایک قابل اعتراض فقرے پر ایک شخص نے اٹھ کر تنقید کی اور کہا ''برا ہو تیرا، اے حجاج شرم و حیاء سے تو بالکل ہی عاری ہوگیا ہے، تو جو کچھ کررہا ہے وہ تو ہی کررہا ہے، اب باتیں بھی اسی قسم کی کرنے لگا ہے، نامراد ہو تو اور رائیگاں جائے تیری سعی''، باڈی گارڈز نے اس کو پکڑ لیا، تقریر کے بعد حجاج نے اس سے پوچھا ''تجھے میرے روبرو اس طرح بولنے کی جرأت کیونکر ہوئی؟'' اس نے کہا ''برا ہو تیرا، اے حجاج، تو خود اللہ کے سامنے بھی اظہار جرأت سے باز نہیں آتا اور میں تیرے سامنے جرأت کا اظہار نہ کروں؟ تیری حقیقت کیا ہے کہ میں تیرے سامنے جرأت کا اظہار نہ کروں؟ دراں حالیکہ تو خود اللہ رب العالمین پر دلیری کرتا ہے'' یہ سن کر حجاج نے کہا کہ اسے چھوڑ دو ۔[1] ایک اور مرتبہ حجاج نے اپنی تقریر میں کہا ''ابن زبیرؓ نے اللہ کی کتاب کو بدل دیا'' سیدنا عبداللہ بن عمرؓ وہاں موجود تھے، انھوں نے جواب دیا ''اللہ نے ابن زبیرؓ کو یہ قدرت ہی نہیں دی تھی کہ وہ اس کو بدل سکتے، تو بھی اگر ان کے اس کام میں شریک ہوجاتا ، تب بھی ایسا نہیں ہوسکتا تھا، تیرے دعویٰ کو میں اگر جھوٹا کہوں تو بجا ہے''[2] حجاج یہ سن کر خاموش رہے۔ حجاج نے ایک مرتبہ خطبہ ذرا لمبا کردیا، عبداللہ بن عمرؓ کہنے لگے ''نماز نماز'' کئی مرتبہ انھوں نے یہ الفاظ کہے، حجاج نے کوئی توجہ نہ کی۔ عبداللہ بن عمرؓ نے کھڑے ہوکر نماز پڑھنی شروع کردی، یہ دیکھ کر دوسرے تمام لوگ بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ بالآخر حجاج کو خطبہ ختم کرکے نماز

۱۔ البدایہ والنہایہ، جلد ۹ صفحہ ۱۲۴، ۱۲۵۔

۲۔ البدایہ والنہایہ، جلد ۹ صفحہ ۱۲۱۔

پڑھانی پڑی۔ نماز کے بعد حجاج نے عبداللہ بن عمرؓ سے پوچھا ''آپ نے ایسا کیوں کیا؟'' آپؓ نے فرمایا ''ہم نماز کے لیے آتے ہیں، نماز اپنے وقت پر ادا کیا کرو، اس کے بعد جو کچھ کہنا ہو، کہا کرو۔''(۱)

یاد رہے کہ حجاجؒ کے یہ واقعات حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ نے ''دور ملوکیت میں تنقید اوراظہار رائے کی آزادی'' کی سرخی قائم کرکے اظہارِ رائے کی آزادی کے ثبوت میں پیش کیے ہیں، گویا انھوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ حجاجؒ لوگوں کی سخت لیکن جائز باتوں کو نہ صرف صبر و تحمل سے برداشت کیا کرتے تھے بلکہ ان کو اظہارِ رائے کی آزادی بھی حاصل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ حافظ صلاح الدین حفظہ اللہ نے حجاجؒ کا تذکرہ شروع کرنے سے پہلے عبدالملک بن مروانؒ کے تذکرے میں بھی حجاجؒ کی مثال پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

''سیدنا انس بن مالکؓ نے ایک مرتبہ عبدالملک بن مروانؒ کو حجاج کے سخت گیر رویئے کی شکایت لکھ بھیجی، عبدالملک کا یہ حال تھا کہ شکایت نامے کو پڑھتے جاتے اور روتے جاتے۔ پڑھ کر ان کو حجاج کے رویئے پر سخت غصہ آیا اور اسے ایک تہدید آمیز خط لکھا۔ حجاج کے پاس جب خلیفہ کا یہ خط قاصد لےکر پہنچا تو اسے پڑھ کر حجاج کو سیدنا انسؓ کی جرأت پر کوئی غصہ نہیں آیا بلکہ اپنے ہی فعل پر ندامت ہوئی اور قاصد کو ساتھ لےکر انھیں منانے کے لیے خود ان کے مکان پر گیا۔(۲)

کتبِ تاریخ کے ان حوالوں کے تحت حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ کی پیش کردہ ان تصریحات سے کیا یہ واضح نہیں ہوجاتا کہ حجاجؒ کی ساری سختی صرف باغیوں

۱۔ خلافت وملوکیت کی تاریخی وشرعی حیثیت، صفحہ ۴۶۹،۴۷۰۔

۲۔ البدایہ والنہایہ، جلد ۹ ،صفحہ ۶۵ ، ایضاً صفحہ ۱۳۳، ۱۳۴۔ خلافت وملوکیت کی تاریخی و شرعی حیثیت، صفحہ ۴۶۸۔

اور سرکش لوگوں کے خلاف تھی وگرنہ عوام الناس کی طرف سے کی جانے والی ہر تنقید کو وہ نہایت خندہ پیشانی سے برداشت کرتے تھے اور معمولی اختلاف کی صورت میں ہزاروں لوگوں کو قید کردینے اور سینکڑوں لوگوں کی گردن اتروانے کی روایات سراسر کذب و افتراء پر مبنی اور حجاجؒ مرحوم پر محض بہتان ہیں۔ خاص کر حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ کا بیان کردہ سیدنا انس بن مالکؓ کی شکایت والا واقعہ تو ان تمام واہی قصوں کی قلعی کھول دیتا ہے جن میں یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ صحابہؓ کی ایک جماعت کو ذلیل کرنے کے لیے حجاج نے ان کے ہاتھوں پر سیسے کی مہریں لگوائیں جس طرح ذمیوں کے ہاتھوں پر لگائی جاتی تھیں، ان صحابہؓ میں سیدنا جابر بن عبداللہؓ، سیدنا انس بن مالکؓ اور سہل بن ساعدی شامل تھے۔[۱] کہاں تو صرف سخت گیر رویئے کی بناء پر خلیفہ سے شکایت ہونے کی صورت پر حجاجؒ نادم ہوکر خود سیدنا انس بن مالکؓ سے معافی مانگنے ان کے گھر حاضر ہوجاتے ہیں اور کہاں ان جلیل القدر اصحاب کے ہاتھوں پر ان کو ذلیل کرنے کے لیے ذمیوں کی مانند سیسے کی مہریں لگوائی جارہی ہیں اور خلیفہ عبدالملک بن مروانؒ خاموش تماشائی بنے بیٹھے ہیں جبکہ یہ واقعہ بھی صفر ۷۴ھ کا بیان کیا جاتا ہے۔ پھر اس روایت کی بابت یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس روایت کو سب سے اوّل ابن جریر طبری نے روایت کیا ہے[۲] اور طبری جو سند لائے ہیں وہ کچھ یوں ہے عن ابن أبي ذئب عن إسحاق بن يزيد، اورحدثني شرحبيل بن أبي عون عن أبيه۔ دیکھا جاسکتا ہے کہ ابن جریر طبری اور ان واقعات کے درمیان دو سو برس کا طویل زمانہ ہے اور یہ ممکن نہیں ہے کہ محض دو واسطوں سے یہ روایت ان تک پہنچی ہو۔ یہ معلوم نہیں کہ یہ نامعلوم لوگ جن کا تذکرہ اس سند میں ہونے سے رہ گیا ہے وہ کس درجے میں قابل اعتماد تھے۔ درایت کے اعتبار سے

۱۔ تاریخ طبری، جلد ۶ صفحہ ۱۹۵۔ الکامل فی التاریخ، جلد ۴ صفحہ ۳۹۵۔

۲۔ طبری، ۷۴/ ۶۹۴۔

بھی یہ روایت قرین قیاس نہیں ہے کیونکہ جیسے جیسے اصحاب رسول دنیا سے رخصت ہو رہے تھے، باقی ماندہ صحابہ کی قدر و منزلت لوگوں کی نظر میں بہت زیادہ بڑھ رہی تھی۔ اس دور میں جب قلیل تعداد میں ضعیف العمر صحابہ باقی رہ گئے تھے، ان کے ساتھ اتنی گستاخی کی جاتی تو لوگ کوئی احتجاج نہ کرتے۔ یہ کام امیر حجاجؒ جیسے شخص کے لیے بھی ممکن نہ تھا۔ عین ممکن ہے کہ امیر حجاجؒ کے مظالم کی یہ داستان بھی اسی پروپیگنڈہ کا حصہ ہو جو بنو عباس نے بنو امیہ کی حکومت گرانے کے لیے کیا۔ اور پھر صحیح تاریخی روایات میں صاف تصریح موجود ہے کہ خلیفہ عبدالملک بن مروانؒ حجاجؒ کو صحابہؓ سے رہنمائی لینے اور ان کے ادب و احترام کو ملحوظ خاطر رکھنے کی خاص تاکید کیا کرتے تھے جیسا کہ پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی صاحب لکھتے ہیں:

> ''بلاشبہ خلافتِ عبدالملک میں عمالِ حکومت زیادہ تر تابعی طبقہ کے تھے لیکن صحابہ کرامؓ کے بارے میں ان کا رویہ بہت احترام و عقیدت کا تھا۔ خلیفۂ وقت خود ان سے دینی رہنمائی حاصل کرتے تھے۔ حالانکہ وہ خود اپنے وقت کے ایک عظیم فقیہ تھے اور حضرت ابن عمرؓ نے ایک سوال کے جواب میں لوگوں کو دین و شریعت اور فقہ و سنت میں جناب عبدالملکؒ سے رجوع کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ خلیفۂ اموی کا عالمِ احترام و عقیدت یہ تھا کہ اپنے عظیم ترین و محبوب و معتمد ترین نائب الملک حجاج بن یوسف ثقفیؒ کو بھی صحابہ کرامؓ بالخصوص سیدنا ابن عمرؓ سے مشورہ لینے بلکہ ان کی پیروی و متابعت کرنے کا حکم دیا تھا۔'' (۱)

پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی صاحب نے جس بات کی طرف اشارہ کیا، اس متعلق امام بخاریؒ اپنی صحیح میں بھی روایات لائے ہیں، جن سے واضح ہو جاتا ہے کہ امیر حجاج بن یوسفؒ نہ صرف صحابہؓ کا بے حد احترام کرتے تھے بلکہ ان کی ڈانٹ ڈپٹ

۱۔ خلافت اموی، خلافت راشدہ کے پس منظر میں، صفحہ ۲۵۰۔

تک خاموشی سے سن لیا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں پہلی روایت درج ذیل ہے:

حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ يُوسُفَ أَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ سَالِمٍ قَالَ كَتَبَ عَبْدُ الْمَلِكِ إِلَى الْحَجَّاجِ أَنْ لَا يُخَالِفَ ابْنَ عُمَرَ فِي الْحَجِّ فَجَاءَ ابْنُ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ وَأَنَا مَعَهُ يَوْمَ عَرَفَةَ حِينَ زَالَتِ الشَّمْسُ فَصَاحَ عِنْدَ سُرَادِقِ الْحَجَّاجِ فَخَرَجَ وَعَلَيْهِ مِلْحَفَةٌ مُعَصْفَرَةٌ فَقَالَ مَا لَكَ يَا أَبَا عَبْدِ الرَّحْمَنِ فَقَالَ الرَّوَاحَ إِنْ كُنْتَ تُرِيدُ السُّنَّةَ قَالَ هَذِهِ السَّاعَةَ قَالَ نَعَمْ قَالَ فَأَنْظِرْنِي حَتَّى أُفِيضَ عَلَى رَأْسِي ثُمَّ أَخْرُجُ فَنَزَلَ حَتَّى خَرَجَ الْحَجَّاجُ فَسَارَ بَيْنِي وَبَيْنَ أَبِي فَقُلْتُ إِنْ كُنْتَ تُرِيدُ السُّنَّةَ فَاقْصُرِ الْخُطْبَةَ وَعَجِّلِ الْوُقُوفَ فَجَعَلَ يَنْظُرُ إِلَى عَبْدِ اللَّهِ فَلَمَّا رَأَى ذَلِكَ عَبْدُ اللَّهِ قَالَ صَدَقَ۔

سالمؒ سے روایت ہے، انھوں نے کہا کہ خلیفہ عبدالملک بن مروانؒ نے حجاج بن یوسفؒ کو خط لکھا کہ وہ احکامِ حج میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مخالفت نہ کرے، چنانچہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ عرفہ کے دن زوال آفتاب کے بعد تشریف لائے جبکہ میں بھی آپ کے ہمراہ تھا۔ انھوں نے حجاجؒ کے ڈیرے کے پاس پہنچ کر زور سے آواز دی تو حجاجؒ کسم میں رنگی ہوئی چادر اوڑھے باہر نکلے اور کہنے لگا ابو عبدالرحمان! کیا بات ہے؟ سیدنا ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: اگر تمھیں سنت کی پیروی مطلوب ہے تو ابھی چلنا چاہیے۔ حجاجؒ بولے: بالکل اسی وقت؟ انھوں نے فرمایا: ہاں۔ حجاجؒ نے کہا: مجھے اتنی مہلت دیں کہ میں اپنے سر پر پانی بہالوں پھر چلتا ہوں۔ سیدنا ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی سواری سے نیچے اتر پڑے، یہاں تک کہ حجاجؒ فارغ ہوکر

نکلے۔ جب وہ، میرے اور والد گرامی کے درمیان چلنے لگےتو میں نے کہا کہ اگرآپ سنت کی پیروی چاہتے ہیں تو خطبہ مختصر پڑھیے گا اور وقوف میں جلدی کیجیے گا۔ یہ سن کر حجاجؒ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف دیکھنے لگے۔ جب سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انھیں دیکھا تو فرمایا کہ سالمؒ سچ کہتا ہے۔ (۱)

اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ امیر حجاجؒ نہ صرف سیدنا عبداللہ بن عمرؓ کا احترام اور مکمل اتباع کرتے تھے بلکہ ان کے صاحبزادے سالمؒ کی بھی دینی معاملات میں اتباع کو مقدم رکھتے تھے۔ امام بخاری اس متعلق ایک اور روایت لائے ہیں:

وَقَالَ اللَّيْثُ: حَدَّثَنِي عُقَيْلٌ، عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، قَالَ: أَخْبَرَنِي سَالِمٌ، أَنَّ الحَجَّاجَ بْنَ يُوسُفَ، عَامَ نَزَلَ بِابْنِ الزُّبَيْرِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، سَأَلَ عَبْدَ اللَّهِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، كَيْفَ تَصْنَعُ فِي المَوْقِفِ يَوْمَ عَرَفَةَ؟ فَقَالَ سَالِمٌ: »إِنْ كُنْتَ تُرِيدُ السُّنَّةَ فَهَجِّرْ بِالصَّلاَةِ يَوْمَ عَرَفَةَ«، فَقَالَ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عُمَرَ: »صَدَقَ، إِنَّهُمْ كَانُوا يَجْمَعُونَ بَيْنَ الظُّهْرِ وَالعَصْرِ فِي السُّنَّةِ«، فَقُلْتُ لِسَالِمٍ: أَفَعَلَ ذَلِكَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ فَقَالَ سَالِمٌ: »وَهَلْ تَتَّبِعُونَ فِي ذَلِكَ إِلَّا سُنَّتَهُ« (صحیح البخاری: کِتَابُ الحَجِّ: بَابُ الجَمْعِ بَيْنَ الصَّلاَتَيْنِ بِعَرَفَةَ، حدیث ۱۶۷۹)

حضرت سالم بن عبداللہؒ سے روایت ہے کہ حجاج بن یوسفؒ جس سال حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جنگ کرنے (مکے) آئےتو انھوں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے

۱۔ صحیح بخاری: کتاب: حج کے مسائل کا بیان، باب: عرفہ کے دن عین گرمی میں ٹھک دوپہر کو روانہ ہونا، حدیث ۱۶۷۷۔

دریافت کیا کہ آپ عرفہ کے دن موقف میں کیا کرتے ہیں؟ حضرت سالمؒ نے کہا: اگر آپ سنت کی پیروی کرنا چاہتے ہیں تو عرفہ کے دن نماز ظہر دوپہر کے وقت جلدی پڑھیے گا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: اس (سالم) نے سچ کہا ہے یقیناً صحابہ کرام رضوان اللہ عنھم اجمعین سنت کے مطابق ظہر اور عصر کی نماز جمع کرتے تھے۔ ابن شہاب کہتے ہیں: میں نے حضرت سالمؒ سے دریافت کیا: آیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی ایسا کیا تھا؟ حضرت سالمؒ نے جواب دیا کہ تم اس مسئلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت ہی پر چلتے ہو۔[1]

صرف یہی نہیں کہ امیر حجاجؒ سیدنا عبداللہ بن عمرؓ اور ان کے صاحبزادے کی مکمل اتباع کرتے تھے بلکہ کئی مواقع پر جب سیدنا عبداللہ بن عمرؓ نے ان کو ڈانٹا تو امیر حجاجؒ نے خاموشی سے سیدنا عبداللہ بن عمرؓ کی ڈانٹ سنی اور ان سے کچھ تعارض نہ کیا، اس بابت ایک قصہ تو ہم البدایہ و النہایہ کے حوالے سے اوپر بیان کر آئے ہیں جہاں سیدنا عبداللہ بن عمرؓ خطبہ لمبا کرنے پر امیر حجاجؒ کو ٹوکتے ہیں اور پھر صلوٰۃ پڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔ اسی متعلق ایک روایت امام بخاری بھی اپنی صحیح میں لائے ہیں جب امیر حجاجؒ حج کے موقع پر سیدنا عبداللہ بن عمرؓ کی عیادت کو آتے ہیں اور عبداللہ بن عمرؓ ان کو سخت سست سناتے ہیں لیکن امیر حجاجؒ خاموشی بنائے رکھتے ہیں اور کوئی ردِ عمل نہیں دِکھاتے:

حَدَّثَنَا زَكَرِيَّاءُ بْنُ يَحْيَى أَبُو السُّكَيْنِ قَالَ حَدَّثَنَا الْمُحَارِبِيُّ قَالَ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ سُوقَةَ عَنْ سَعِيدِ بْنِ جُبَيْرٍ قَالَ كُنْتُ مَعَ ابْنِ عُمَرَ حِينَ أَصَابَهُ سِنَانُ الرُّمْحِ فِي أَخْمَصِ قَدَمِهِ فَلَزِقَتْ قَدَمُهُ

۱۔ صحیح بخاری: کتاب: حج کے مسائل کا بیان، باب: عرفات میں دو نمازوں (ظہر اور عصر) کو ملا کر پڑھنا، حدیث ۱۶۷۹۔

بِالرِّكَابِ فَنَزَلْتُ فَنَزَعْتُهَا وَذٰلِكَ بِمِنًى فَبَلَغَ الْحَجَّاجَ فَجَعَلَ يَعُودُهُ فَقَالَ الْحَجَّاجُ لَوْ نَعْلَمُ مَنْ أَصَابَكَ فَقَالَ ابْنُ عُمَرَ أَنْتَ أَصَبْتَنِي قَالَ وَكَيْفَ قَالَ حَمَلْتَ السِّلَاحَ فِي يَوْمٍ لَمْ يَكُنْ يُحْمَلُ فِيهِ وَأَدْخَلْتَ السِّلَاحَ الْحَرَمَ وَلَمْ يَكُنِ السِّلَاحُ يُدْخَلُ الْحَرَمَ

(صحيح البخاري: كِتَابُ الْعِيدَيْنِ: بَابُ مَا يُكْرَهُ مِنْ حَمْلِ السِّلَاحِ فِي الْعِيدِ وَالْحَرَمِ، ترجمة الباب: وَقَالَ الْحَسَنُ: »نُهُوا أَنْ يَحْمِلُوا السِّلَاحَ يَوْمَ عِيدٍ إِلَّا أَنْ يَخَافُوا عَدُوًّا« حديث ۹۶۸)

حضرت سعید بن جبیرؒ سے روایت ہے، انھوں نے کہا کہ میں حضرت ابن عمرؓ کے ہمراہ تھا جب ان کے پاؤں کے تلوے میں نیزے کی نوک چبھ گئی اور ان کا پاؤں رکاب سے چمٹ گیا، چنانچہ میں نیچے اترا اور اسے پاؤں سے نکالا، یہ واقعہ منیٰ میں ہوا تھا۔ حجاج بن یوسف کو جب اس کی اطلاع ملی تو وہ آپ کی عیادت کے لیے آیا اور کہنے لگا: کاش! ہمیں معلوم ہو جائے کہ کس نے آپ کو یہ تکلیف پہنچائی ہے۔ حضرت ابن عمرؓ نے جواب دیا کہ تو نے خود ہی مجھے یہ تکلیف پہنچائی ہے۔ اس نے کہا: ایسا کیونکر ہوسکتا ہے؟ حضرت ابن عمرؓ نے جواب دیا کہ تو نے ہی اس دن ہتھیار اٹھائے جس دن ہتھیار نہیں اٹھائے جاتے اور تو نے ہی حرم میں ہتھیار داخل کیے حالانکہ حرم میں ہتھیار نہیں لائے جاتے۔(۱)

قارئین یہاں خود ملاحظہ کرسکتے ہیں کہ سیدنا عبداللہ بن عمرؓ کی اس ڈانٹ پر امیر حجاجؒ کچھ نہیں کہتے اور ان کا ویسے ہی ادب و احترام روا رکھتے ہیں۔ جبکہ یہ ایک

۱۔ صحیح بخاری: کتاب: عیدین کے مسائل کے بیان میں، باب: عید کے دن اور حرم کے اندر ہتھیار باندھنا مکروہ ہے، ترجمۃ الباب: اور امام حسن بصریؒ نے فرمایا کہ عید کے دن ہتھیار لے جانے کی ممانعت تھی مگر جب دشمن کا خوف ہوتا، حدیث ۹۶۸۔

خالص سیاسی معاملہ تھا جس میں امیر حجاجؒ اور سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ دونوں شامل تھے۔ امیر حجاجؒ چاہتے تو سیدنا عبداللہ بن عمرؓ سے سیدنا ابن زبیرؓ کی بابت عرض کر سکتے تھے کہ میرے حرم میں ہتھیار لانے کی وجہ وہ بنے۔ لیکن امیر حجاجؒ نے خاموشی بنائے رکھی اور سیدنا ابن عمرؓ سے کچھ نہیں کہا جبکہ وہ خود بھی جانتے تھے کہ سیدنا ابن عمرؓ بھی سیدنا ابن زبیرؓ سے متفق نہیں اور اسی وجہ سے ان کی بیعت سے محترز رہے اور ان کی شہادت کے بعد امیر عبدالملک بن مروانؒ کی بیعت میں داخل ہوگئے۔ اس طرح کی تمام روایات ثابت کر دیتی ہیں کہ امیر حجاجؒ حتیٰ المقدور صحابہ کا احترام روا رکھتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ ان کی جناب میں کسی طرح کی سوئے ادبی نہ ہونے پائے۔ لیکن بعض متعصب راویوں نے بلا سند قصوں کے ذریعے امیر حجاجؒ کو مطعون کیا اور صحابہؓ کے ہاتھوں پر سیسے کی مہرے لگانے والے وضعی واقعات کی طرح اور کئی سینکڑوں واقعات وضع کر کے ہماری تاریخ میں داخل کر دیئے اور جن کے تحت آج ہمارے نام نہاد مؤرخین امیر حجاج مرحومؒ کو مطعون، فاسق، فاجر اور ظالم باور کروانے میں اپنی محنتیں صرف کرتے نظر آتے ہیں۔

یہ امیر حجاجؒ ہی تھے جن کی وجہ سے عراق سے بغاوتیں فرو ہوئیں۔ حجاجؒ کی وجہ سے ہسپانیہ اور ماوراالنہر تک اسلام پہنچ سکا۔ حجاجؒ کی وجہ سے ہی سندھ کو باب الاسلام کا لقب مل سکا۔ بہترین منتظم ہونے اور انتظامی معاملات میں کمال رکھنے میں اپنے بعد کے لوگوں میں ان کی نظیر ملنا بہت مشکل ہے۔ اموی حکومت کو استحکام میسر کرنے اور جہاد کا غلغلہ قائم رکھنے میں کوئی اموی گورنر حجاجؒ کا ثانی نہیں ہوسکتا۔ اس بطلِ جلیل نے جہاد کے لیے ہر سو فوجیں بھیج رکھی تھیں۔ مسلم سرحدوں کی جیسی توسیع و حفاظت حجاج بن یوسفؒ نے کی، ان کے بعد کسی اور مسلم گورنر سے نہ ہوسکی۔ ایسا شخص کسی اور قوم کی تاریخ میں پیدا ہوا ہوتا، تو یقیناً وہ قوم اس کو اس کی فوجی خدمات کے صلے میں اپنے سر کا تاج بنا کر رکھتی۔ حکیم محمود احمد ظفر سیالکوٹی حفظہ اللہ اپنی کتاب

''دولت مروانیہ'' میں اس بابت لکھتے ہیں:

''حجاج بن یوسفؒ ایسا ظالم و جابر نہیں تھا جیسا اس کو غلط اور وضعی روایات کی روشنی میں بتایا جاتا ہے۔ حجاج بن یوسفؒ بنو امیہ کے دور کا نہ صرف ایک بڑا سیاست دان اور مدبر تھا بلکہ وہ بنو امیہ کا نہایت لائق اور قابل ترین گورنر تھا۔ وہ طائف میں ۴۱ھ کے لگ بھگ پیدا ہوا اور ۹۵ھ میں اس دنیا سے انتقال کیا۔ خارجیوں کی مسلسل سازشوں اور شورشوں کے باعث عراق کی گورنری، اسلامی ریاست کا سب سے اہم اور ذمہ دارانہ انتظامی عہدہ تھا۔ حجاجؒ کو ۳۳ برس کی عمر میں عبدالملک بن مروانؒ کے عہد خلافت میں اس اہم عہدہ پر فائز ہونے کا موقع ملا۔ اس سے پہلے وہ دو سال تک حجاز کا گورنر رہ چکا تھا۔ اسلامی ریاست کے مشرق میں خلیفہ ولید بن عبدالملکؒ کے زمانے کی شاندار فتوحات بھی حجاج کی مساعی اور انقلابی جنگی تدبیروں کے مرہون منت تھیں۔ ماوراء النہر (قدیم ترکستان کا علاقہ) کو قتیبہ بن مسلم، عمان کو مجاعہ بن مسعر اور برصغیر پاک و ہند کو محمد بن قاسم نے فتح کیا۔ اسلامی فتوحات کے اس عہد زریں کے ان تین سپہ سالاروں کو حجاج بن یوسف کی عقابی نظروں نے مذکورہ مہمات کے لیے منتخب کیا اور ان کی صلاحیتوں اور قابلیت سے خاطرخواہ فائدہ اٹھایا جس کی بدولت اس عہد کی اسلامی حکومت کو خوب تقویت ملی۔ حجاج بن یوسفؒ ایک مستعد اور ذوفہم حکمران تھا۔ وہ ملک کی خوشحالی میں اضافہ کرنے کے لیے ہمیشہ فکر مند رہتا تھا، اور خلیفہ عبدالملک اور ولید بن عبدالملک کے عہد میں انھوں نے اسلامی ریاست کی فلاح و بہبود اور استحکام کے لیے مثالی خدمات انجام دیں۔ ہمارے ہاں حجاجؒ کے بارے میں ظلم و جور کی جو داستانیں مشہور ہیں وہ بے اصل، وضعی اور سبائیوں کی گھڑی ہوئی ہیں۔ (۱)

۱۔ دولت مروانیہ صفحہ ۷۰،۷۱۔

علماء نے لکھا ہے کہ حجاجؒ کے دو احسانات پوری امت مسلمہ پر ایسے ہیں جن کے باردوش سے سبکدوش ہونا اس کے لیے ممکن نہیں۔ ان میں سے ایک قرآن حکیم پر اعراب لگوا کر اس کی حفاظت اور اس کی اشاعت کرنا ہے۔ دوسرا سرزمین پاک و ہند تک اسلام پہنچانا ہے۔ آج برصغیر پاک و ہند میں ہمارا کلمہ گو ہونا حجاجؒ ہی کی مساعی کا مرہون منت ہے۔ یہ حجاج کے ایسے احسانات عظیمہ ہیں جن کی وجہ سے دشمنان اسلام ان کے سخت دشمن بن گئے اور انھیں غلط اور لغو اعتراضات کا نشانہ بنایا۔ قرآن حکیم پر اعراب لگوانے کے سلسلہ میں علامہ شبلی نعمانی نے لکھا ہے کہ:

> ''اللہ کی قسم! یہ اسلام کے حق میں اتنی بڑی بھلائی ہے کہ کوئی بھلائی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی اور دین پر اتنا بڑا احسان ہے کہ اس احسان کے برابر کوئی احسان نہیں ہوسکتا۔'' (۱)

چند سطر قبل گذرے اقتباس میں خلیفہ ولید بن عبدالملک کے زمانے کی جن شاندار فتوحات کو حکیم محمود احمد ظفر سیالکوٹی حفظہ اللہ حجاجؒ کی مساعی کا نتیجہ قرار دے رہے ہیں، ان کی بابت علامہ شبلی نعمانی اپنی کتاب ''المامون، الغزالی'' میں لکھتے ہیں:

> ''اس عظیم خاندان (بنو امیہ و بنو مروان) میں عبدالملکؒ و ولیدؒ و سلیمانؒ و ہشامؒ نہایت عظمت و اقتدار کے بادشاہ گزرے ہیں۔ صرف ولید کی فتوحات پر اگر لحاظ کیا جاوے تو دولت عباسیہ اپنی چھ سو برس کی زندگی میں اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کرسکتی۔ اس عہد میں حدود اسلامی کا دائرہ اس قدر وسیع ہوگیا تھا کہ سندھ کابل و ایران و ترکستان و عرب و شام و ایشائے کوچک و اسپین اور تمام افریقہ اس میں داخل تھا۔'' (۲)

بعض فقہی نظائر سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ امیر حجاجؒ کو صرف قرآن سے ہی

۱۔ الانتقاد عربی از شبلی نعمانی، صفحہ ۱۸۔

۲۔ المامون، الغزالی، صفحہ ۱۶۔

شغف نہیں تھا بلکہ وہ سنت اور فقہ پر بھی اچھی دسترس رکھتے تھے اور ان کے فقہی فیصلوں سے مابعد کے فقہاء نے استدلال کیا ہے جیسا کہ قاضی ابو یوسفؒ کی بابت ملتا ہے کہ اپنی شہرہ آفاق کتاب ''کتاب الخراج'' میں مفتوحہ ممالک میں کفار محاربین کی متروکہ اراضی کے بارے میں امیر المومنین ہارون الرشیدؒ کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

فهذا سبيل القطائع عندی فی ارض العراق و الذی ضع الحجاج ثم فعل عمر بن عبدالعزيز رضی الله عنه فان عمرؒ اخذ بذلك السنة فان من اقطعه الولاة الموهبون فليس لاحد ان يرد ذلك۔

''پس ارضِ عراق میں زمینوں کے بارے میں میرے نزدیک یہ حکم ہے اور یہ وہی ہے جو حجاج نے کیا تھا، پھر عمر بن عبدالعزیزؒ نے بھی وہی کیا۔ بے شک عمر بن عبدالعزیزؒ نے ، اللہ ان سے راضی ہو، سنت کے مطابق عمل کیا کیونکہ کسی کو کوئی قطعہ زمین ہدایت یافتہ حکومت عطا کردے تو کسی کے لیے اسے واپس لینا جائز نہیں۔''(۱)

یہاں امام ابو یوسفؒ امیر حجاجؒ کے عمل سے استدلال فرما رہے ہیں۔ کیا کسی ظالم، فاسق اور جابر کے عمل سے کوئی جید و ثقہ فقیہ اسلام استدلال کرسکتا ہے، کیا کسی ظالم و جابر اور فاسق کے عمل کو بطور نظیر پیش کرکے اس کی پیروی کی تلقین کی جاسکتی ہے؟ پھر امام صاحب یہ بھی بتاتے ہیں کہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے بھی حجاجؒ کے عمل کی پیروی کی اور ساتھ ہی حجاجؒ اور دوسرے اموی عمال و مولاۃ کے اس طرز عمل کی تحسین بھی کرتے ہیں اور عباسی خلیفہ ہارون الرشیدؒ کو ان کی پیروی کی تلقین بھی کرتے ہیں۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ امیر حجاجؒ سے متعلق امام ابو یوسفؒ کی یہ رائے تنہا ان

۱۔ کتاب الخراج، صفحہ ۶۳۔

کی نہیں تھی بلکہ اس دور کے جملہ فقہاء و محدثین کی رائے تھی جس کی دلیل یہ ہے کہ ان کے فتویٰ پر امیر المومنین ہارون الرشیدؒ نے عمل کیا اور کسی عالم و فقیہ نے اس سے اختلاف نہیں کیا۔

OOOOO

معرکۂ ابن زبیرؓ اور فتنہ ابن الاشعث و سعید بن جبیرؒ

محمد فہد حارث

از محمد فہد حارث

معرکۂ ابن زبیرؓ اور فتنہ ابن الاشعث و سعید بن جبیرؒ

عموماً امیر حجاجؒ کو بدنام کرنے کے لیے معرکۂ ابن زبیرؓ اور فتنہ ابن الاشعث و سعید بن جبیرؒ کی تشہیر کی جاتی ہے۔ ان شاءاللہ ان تینوں مہمات اور ان سے منسلک واقعات کی بابت ہم کتاب ہٰذا میں علامہ اسحٰق صدیقی سندیلوی کی تصریحات کے تحت عرضداشتیں سامنے رکھ رہے ہیں۔ قارئین کو اس سے متعلق مفصل جواب و معلومات وہیں ملیں گے تاہم یہاں اجمالاً ان پر کچھ کلام کرنا چاہیں گے تاکہ قاری جب ان مباحث کو کتاب میں آگے جاکر پڑھے تو اس کو یہ مبحث نئے نہ محسوس ہوں۔ اس متعلق کچھ عرض کرنے سے پہلے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ قارئین کے سامنے ملّی وحدت، اطاعت امیر اور خروج و بغاوت سے متعلق چند احادیث پیش کردیں تاکہ ان کی روشنی میں زیرِ نظر مبحث کو سمجھنے میں آسانی رہے۔

ملّی وحدت، اطاعتِ امیر اور خروج و بغاوت:

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

لا اسلام الا بالجماعة، ولا جماعة الا بالامیر، ولا امیر الا بالسمع الطاعة۔

”جماعت کے بغیر اسلام کی سر بلندی ناممکن ہے اور امیر کے بغیر جماعت

متحد نہیں رہ سکتی اور امیر کی امارت اس وقت تک بار آور نہیں ہوسکتی جب تک ہر شخص اس کا حکم سن کر اس کی بات نہ مانے۔"

اب اس ملی وحدت کو برقرار رکھنے کے لیے ارشادات نبویﷺ ملاحظہ فرمایئے:

ملت اسلامیہ کا خلیفہ ایک ہی شخص ہوسکتا ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا:

اذا بویع الخلیفتین فاقتلوا الآخر منهما۔(۱)

"جب دو خلیفوں کی بیعت ہونے لگے تو بعد والے کو قتل کردو۔"

عن ابی هریرہ ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال من اطاعنی فقد اطاع الله و من عصانی فقد عصی الله و من اطاع امیری فقد اطاعنی و من عصیٰ امیری فقد عصانی۔(۲)

"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں آنحضرت اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی اور جس نے میرے مقرر کیے ہوئے حاکم کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے میرے امیر کی نافرمانی کی اس نے گویا میری نافرمانی کی۔"

عن عبدالله بن عمر یقول کنا نبایع رسول الله صلی الله علیه وسلم علی السمع الطاعة یقول لنا فیما استطعتم۔(۳)

"عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حکم سننے اور فرمانبرداری کرنے کی شرط پر بیعت کرتے تھے۔

۱۔ مسلم، کتاب الامارۃ والقضاء۔

۲۔ بخاری، کتاب الاحکام۔ مسلم، کتاب الامارت، باب وجوب اطاعۃ۔

۳۔ ایضاً

آپ ہمیں کہتے: اپنی استطاعت کے مطابق (یا مقدور بھر تم پر سمع و طاعت لازم ہے)۔“

عن عرفجة قال سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول من اتاکم وامرکم جمیع علی رجل و حد یرید ان یشق عصا کم او یفرق جماعتکم فاقتلوه۔ (۱)

”عرفجہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ اگر تمھارے معاملات کسی ایک شخص پر اکٹھے ہوں پھر کوئی شخص تمھاری قوت کو توڑنے یا تمھاری جماعت میں تفرقہ ڈالنے کی کوشش کرے تو اسے قتل کر دو۔“

عن ابی هریرة قال رسول الله صلی الله علیه وسلم من خرج من الطاعة و فارق الجماعة ثم مات مات میتة جاهلیة۔ (۲)

”ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کوئی امیر کی اطاعت سے نکلا اور جماعت سے الگ ہوا، پھر مر گیا تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔“

امیر اگر نسل کے لحاظ سے کہتر یا شکل کے لحاظ سے بدصورت ہو تو بھی اس کی اطاعت بدستور واجب ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان امر علیکم عبد مجدع یقود کم بکتب الله فاسمعوا له و اطیعو۔ (۳)

”اگر تم پر نکٹا غلام بھی امیر بنادیا جائے تو جب تک وہ تمھیں اللہ کے

۱۔ مسلم، کتاب الامارۃ و القضا۔ ۲۔ مسلم، کتاب الامارۃ و القضا۔

۳۔ مسلم، کتاب الامارۃ و القضا۔

احکام کے مطابق چلاتا ہے اس کی بات سنو اور اس کی اطاعت کرو۔''

ایسے امیر کے احکام کی ہر حال میں، تنگی یا آسانی، وہ احکام رعایا کو پسند ہوں یا نا پسند۔ اطاعت واجب ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

السمع والطاعة على المرء المسلم فيما احب و كره مالم يومر بمعصية و اذا امر بمعصية فلا سمع ولا طاعة (متفق عليه)۔[1]

''ہر مسلمان پر سننا اور اطاعت کرنا لازم ہے خواہ وہ حکم اسے پسند ہو یا ناپسند جب تک کہ وہ گناہ کا حکم نہیں دیتا اور اگر وہ گناہ کا حکم دے تو پھر نہ اس کی بات سنو نہ اطاعت کرو۔''

اور عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

بايعنا رسول الله صلى الله عليه وسلم على السمع والطاعة فى العسر واليسر والمنشط والمكره (متفق عليه)۔[2]

''ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سننے اور اطاعت کرنے کی شرط پر بیعت کی خواہ اس میں تنگی ہو یا آسانی، خوشی کی صورت ہو یا نا خوشی کی (ہر حال میں اطاعت امیر فرض ہے)''

اگر امام بد اعمال ہو جائے تو بھی اس کی اطاعت لازم ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

يكون عليكم امراء تعرفون و تنكرون فمن انكر فقد برء ومن كره فقد سلم ولكن من رضى و تابع۔ قالو افلا تقاتلهم؟ قال ''لا، ما صلوا'' اى من كره بقبله و انكر

۱۔ بخاری کتب الاحکام۔

۲۔ ایضاً۔

بقبلہ (۱)

''تم پر ایسے امیر ہوں گے جو اچھے کام بھی کریں گے اور برے بھی تو جس نے انکار کیا (کھل کر ان کی برائی بیان کی) وہ بری ہوا اور جس نے (دل سے) برا جانا وہ محفوظ رہا مگر جو شخص راضی ہوگیا اور ان کے پیچھے چل پڑا (وہی قابل مواخذہ ہے) صحابہؓ نے عرض کیا ''کیا ہم ایسے امیروں سے جنگ نہ کریں؟ فرمایا: نہیں جب تک وہ نماز پڑھتے ہیں'' یعنی جس شخص نے دل سے مکروہ سمجھا اور انکار کیا۔''

اگر امیر اپنے حقوق تو رعایا سے پورے وصول کرے لیکن رعایا کے حقوق پورے نہ کرے تو بھی اس کی اطاعت لازم ہے۔ وائل بن حجرؓ سے روایت ہے کہ سلمہ بن یزید جحفیؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا:

یا نبی اللہ! رایت ان قامت علینا امراء یسئلونا حقھم و یمنعونا حقنا فما تامرنا؟ قال اسمعوا واطیعوا وانما علیھم ما حملوا وعلیکم ما حملتم۔ (۲)

''اے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! اگر ہم پر ایسے امیر مسلط ہوں جو ہم سے اپنا حق تو مانگیں لیکن ہمیں ہمارا حق نہ دیں تو ایسی صورت میں ہمارے لیے کیا حکم ہے؟ فرمایا: ''ان کی بات سنو اور اطاعت کرو۔ ان کی ذمہ داری کا وبال ان پر ہے اور تمھاری ذمہ داری (سمع و اطاعت) کا تم پر۔''

نیز فرمایا:

من رای من امیرہ شیأ یکرھہ فلیصبر فانہ لیس احد یفارق الجماعۃ شبراً فیموت الامات میتۃ جاھلیہ (متفق علیہ) (۳)

۱۔ مسلم۔ کتاب الامارۃ۔ ۲۔ مسلم۔ کتاب الامارۃ۔

۳۔ بخاری۔ کتاب الاحکام۔

''جو شخص اپنے امیر میں ناپسندیدہ فعل دیکھے تو چاہیے کہ صبر کرے کیونکہ جو کوئی جماعت سے بالشت بھر بھی جدا ہوا اور مر جائے تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔''

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

عن ابی هریرہ عن نبی ﷺ قال: من خرج من الطاعة وفارق الجماعة فمات مات میتة جاهلیه ومن قاتل تحت رایة عمیة بغضب العصبیة اوید عوالی عصبیة اوینصر عصبة فقتل فقتلة جاهلیة۔ (۱)

''ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص امیر کی اطاعت سے اور مسلمانوں کی جماعت سے الگ ہوا، پھر مر گیا تو وہ جاہلیت کی موت مرا اور جو شخص کسی اندھے (نشان) کے تحت لڑائی کرے، عصبیت کے لیے غصہ دلائے یا عصبیت کے لیے بلائے یا عصبیت کے لیے مدد کرے پھر قتل کیا جائے تو وہ بھی جاہلیت کی موت مرا۔''

امام چونکہ مقتدر اعلیٰ ہستی نہیں ہوتی بلکہ وہ صرف قرآن وسنت کے نفاذ پر مامور ہوتا ہے لہٰذا اس کی اطاعت اسی حد تک واجب ہے جب تک کہ وہ قرآن وسنت کے مطابق ہو اور اگر مخالف ہو تو اس کی اطاعت قطعی واجب نہیں۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے:

لاطاعة فی معصیة انما الطاعة فی المعروف (متفق علیه)

''اللہ کی نا فرمانی میں کوئی اطاعت نہیں۔ اطاعت صرف بھلائی کے کاموں میں ہے''

۱۔ مسلم۔ کتاب الامارة باب ملازمة جماعة المسلمین۔

اسی مضمون کی دوسری حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں:

لاطاعة لمخلوق فی معصیة الخالق (شرح السنة)

''اللہ کی نافرمانی کا معاملہ ہو تو کسی مخلوق کی اطاعت نہیں ہے۔''

اس ایک بات کے علاوہ امیر کی اطاعت ہر حال میں واجب ہے۔

معرکۂ ابن زبیرؓ:

یہ تھیں وہ احادیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو کہ اس وقت خلیفہ عبدالملک بن مروانؒ، سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ اور امیر حجاج بن یوسفؒ کے پیش نظر تھیں۔ دراصل امیر یزیدؒ کے انتقال کے بعد فتنہ پردازوں کی فساد انگیزیوں کی وجہ سے عالم اسلامی میں سخت خلفشار اور لامرکزیت کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں:

''تین ماہ تک عالم اسلام بغیر کسی امام اور خلیفہ کے رہا۔''(۱)

اس لامرکزیت اور افراتفری کے عالم میں اہل حجاز نے سیدنا ابن زبیرؓ سے بیعت کرلی اور شام کے لوگوں نے سیدنا مروانؓ سے بیعت کرکے انھیں خلیفہ منتخب کرلیا۔ بیعت دونوں میں سے کس سے پہلے کی گئی اور کس سے بعد میں؟ اس کا کوئی جواب نہیں مل سکا۔ سبائیوں نے فساد پیدا کرنے کے لیے اسے اور مبہم بنادیا۔

ان سبائی مفسدین کے دو گروہ ہوگئے اور آپس میں صلاح و مشورہ کرکے دونوں طرف پہنچ گئے۔ ایک گروہ نے سیدنا ابن زبیرؓ کو باور کرادیا کہ ان کی بیعت پہلے ہوئی ہے، اس لیے سیدنا مروانؓ اور ان کے جانشین عبدالملک بن مروانؒ باغی ہیں اور حفاظتِ خلافت کے لیے ان سے قتال واجب ہے۔ دوسری طرف دوسرے گروہ نے سیدنا مروانؓ اور عبدالملک مروانؒ کو اسی طرح اولیت کا یقین دلا کر بغاوت فرو کرنے اور اس کے لیے جنگ کرنے پر آمادہ کیا۔ اس طرح یہ مفسد منافقین ان صالح مسلمانوں

۱۔ (البدایہ والنہایہ، جلد ۸، صفحہ ۳۳۹۔

کے دو ایسے گروہوں کو میدان جنگ میں ایک دوسرے کے مقابل لے آئے جو اپنے مسلمان بھائیوں سے قطعاً جنگ نہیں کرنا چاہتے تھے۔

سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ کے متعلق یہ سوئے ظن کرنا کہ انھوں نے جاہ و اقتدار حاصل کرنے کے لیے جنگ کی سخت غلطی ہے۔ آں محترم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابی ہیں۔ وہ اس ورطہ میں مبتلا نہیں ہوسکتے تھے۔ اگر وقتی طور پر ان کے دل میں یہ جذبہ پیدا بھی ہوتا تو اس کی بقاء غیر ممکن تھی کیونکہ پوری جماعت صحابہؓ کا ایک خاص وصف جمیل قرآن مجید میں یہ بیان فرمایا گیا ہے؛

وَلَمْ يُصِرُّوا عَلَىٰ مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ

وہ اپنی غلطی پر اصرار نہیں کرتے درآں حالانکہ وہ جانتے ہیں۔ (۱)

صحابہ کرام معصوم نہیں تھے۔ معصیت کا صدور ان سے بھی ممکن تھا، مگر کسی معصیت کا عادی ہوجانا یا اسے بار بار دہرانا، ان کے لیے غیر ممکن تھا۔ جنگ و جدل کا سلسلہ خاصی مدت تک جاری رہا۔ اگر اس کا محرک جذبہ حب جاہ و اقتدار ہوتا تو اتنے دن اس کی بقاء کا شمار ''اصرار علی المعصیۃ'' میں ہوتا۔ جس کا صدور ان سے ازروئے قرآن کریم غیر ممکن اور محال تھا۔ اس لیے یہ ماننا پڑے گا کہ وہ مخلص تھے اور انھوں نے اپنے اجتہاد کے بموجب اتباع شریعت ہی کے لیے جنگ کی۔

ان کے مقابلے میں عبدالملکؒ تھے۔ وہ اگرچہ صحابی نہیں تھے مگر ان کی پوزیشن بھی ازروئے شریعت اور دستور اسلامی مستحکم تھی۔ انھوں نے بھی اپنے اجتہاد کے بموجب خلوص کے ساتھ اتباع شریعت ہی کے لیے جنگ کی۔ کوئی وجہ نہیں کہ ہم انھیں حب جا و اقتدار کا مریض قرار دیں۔ وہ صحابی نہیں ہیں، اس لیے ان سے اس کی قطعی نفی کی تو کوئی دلیل شرعی ہمارے پاس نہیں۔ لیکن ازروئے شریعت اسلامیہ و دستور اسلامی ان کا موقف بھی مستحکم تھا اور جس طرح سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ کے لیے

۱۔ سورۃ آل عمران: ۱۳۵۔

حفاظت خلافت اور بغاوت ختم کرنے کے لیے قتال و جدال شرعاً جائز تھا، اسی طرح ان کے لیے بھی جائز تھا۔ دونوں کے اجتہادوں میں سے کس کا اجتہاد صحیح تھا؟ اس کا کوئی فیصلہ نہ ہوسکا اور اب اس کا فیصلہ کرنے کی کوشش کرنا بے سود ہے۔ جب تک کوئی دلیل نہ ہو اس وقت تک ان کی نیت پر بھی شبہ کرنا جائز نہیں۔ انھیں بھی مخلص ہی کہا جائے گا۔ اختلاف اجتہاد کی وجہ سے جدال وقتال ہوجانا کوئی عیب نہیں کہا جاسکتا۔ یہ طاعت ہی تھی معصیت نہیں تھی۔ اپنے اخلاص کی وجہ سے ابن زبیرؓ مرتبہ شہادت پر فائز ہوئے۔ فریق مقابل کے مقابلے میں یہ حضرات (ابن زبیرؓ و عبدالملک بن مروانؒ) دلیل شرعی کی بناء پر خود کو حق پر سمجھتے تھے اور فریق مقابل کو اسی دلیل کی بناء پر برسر باطل جانتے تھے۔ حقیقت واقعہ کے لحاظ سے ان کی رائے صحیح تھی یا غلط؟ اس سے بحث نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں معاملہ ان کی نیت کی بناء پر ہوگا۔ اپنی دانست میں انھوں نے حکم شرعی پر عمل کیا اس لیے وہ گنہگار نہیں ہوئے بلکہ ماجور ہوئے۔

سیدہ اسماء بنت ابی بکرؓ اور امیر حجاجؒ کا واقعہ:

امیر حجاج بن یوسف ثقفیؒ کو بدنام کرنے کے لیے جس روایت و واقعہ سے سب سے زیادہ استدلال کیا جاتا ہے وہ صحیح مسلم میں موجود وہ روایت ہے جس میں سیدہ اسماء بنت ابی بکرؓ اور امیر حجاجؒ کا مکالمہ ملتا ہے جو کہ ان دونوں کے درمیان اس وقت ہوتا ہے جب امیر حجاج بن یوسف ثقفیؒ سے جنگ کرتے ہوئے سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ شہید ہوجاتے ہیں۔ اس لمبی حدیث کے آخری الفاظ یہ ہیں:

فَقَالَ: كَيْفَ رَأَيْتِنِي صَنَعْتُ بِعَدُوِّ اللهِ؟ قَالَتْ: رَأَيْتُكَ أَفْسَدْتَ عَلَيْهِ دُنْيَاهُ وَأَفْسَدَ عَلَيْكَ آخِرَتَكَ بَلَغَنِي أَنَّكَ تَقُولُ لَهُ: يَا ابْنَ ذَاتِ النِّطَاقَيْنِ أَنَا وَاللهِ ذَاتُ النِّطَاقَيْنِ، أَمَّا أَحَدُهُمَا فَكُنْتُ أَرْفَعُ بِهِ طَعَامَ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ،

وَطَعَامَ أَبِي بَكْرٍ مِنَ الدَّوَابِّ، وَأَمَّا الآخَرُ فَنِطَاقُ الْمَرْأَةِ الَّتِي لَا تَسْتَغْنِي عَنْهُ، أَمَا إِنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَدَّثَنَا، »أَنَّ فِي ثَقِيفٍ كَذَّابًا وَمُبِيرًا« فَأَمَّا الْكَذَّابُ فَرَأَيْنَاهُ، وَأَمَّا الْمُبِيرُ فَلَا إِخَالُكَ إِلَّا إِيَّاهُ قَالَ: فَقَامَ عَنْهَا وَلَمْ يُرَاجِعْهَا۔ (۱)

حجاجؒ نے سیدہ اسماء بنت ابی بکرؓ سے کہا کہ آپ نے مجھے دیکھا کہ میں نے اللہ کے دشمن کے ساتھ کیا کیا؟ سیدہ اسماء بنت ابی بکرؓ نے حجاجؒ کو جواب دیا: میں نے تمھیں دیکھا ہے کہ تم نے اس پر اس کی دنیا تباہ کر دی جبکہ اس نے تمھاری آخرت برباد کر دی، مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ تو اسے دو پیٹیوں والی کا بیٹا (ابن ذات النطاقین) کہتا ہے۔ ہاں، اللہ کی قسم! میں دو پیٹیوں والی ہوں۔ ایک پیٹی کے ساتھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا کھانا سواری کے جانور پر باندھتی تھی اور دوسری پیٹی وہ ہے جس سے کوئی عورت مستغنی نہیں ہوسکتی (سب کو لباس کے لیے اس کی ضرورت ہوتی ہے۔) اور سنو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں بتایا تھا کہ بنو ثقیف میں ایک بہت بڑا کذاب ہوگا اور ایک بہت بڑا سفاک ہوگا۔ کذاب (مختار ثقفی) کو تو ہم نے دیکھ لیا اور رہا سفاک تو میں نہیں سمجھتی کہ تیرے علاوہ کوئی اور ہوگا، کہا: یہ سن کر حجاجؒ وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور انھیں کوئی جواب نہ دیا۔

سب سے پہلے تو ہم یہ واضح کر دیں کہ ہمارے نزدیک امیر حجاجؒ کا سیدہ اسماء بنت ابی بکرؓ سے اس سختی اور ترشی سے بات کرنا ان کا ایک غیر مناسب فعل تھا، جس کا دفاع کرنا کسی صاحبِ عدل کو جائز نہیں۔ تاہم اس واقعہ کے وقت ان سیاسی حالات

۱۔ (صحیح مسلم: كِتَابُ فَضَائِلِ الصَّحَابَةِ رضی اللہ عنہم :بَابُ ذِكْرِ كَذَّابِ ثَقِيفٍ وَمُبِيرِهَا، حدیث ۲۵۴۵۔

کو بھی مدِّ نظر رکھنا چاہیے جن کے تحت یہ واقعہ رونما ہوا۔ امیر حجاجؒ کے لیے سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ کی حیثیت ان کے بیعت کردہ خلیفہ کی حکومت کے ایک باغی کی تھی جن سے وہ نبرد آزما تھے اور ایک طویل کشمکش کے بعد اس بغاوت کو وہ فرو کر پائے تھے۔ ظاہر سی بات ہے جب ان حضرات میں آپس میں تلواریں چل گئیں تو پھر بقیہ ادب و احترام کے حدودوقیود متعین کرنا بہت مشکل کام ہوجاتا ہے۔ اس وقت جو کچھ ہورہا تھا، وہ حکومتی کشمکش اور سیاسی مناقشات کے رّدِعمل میں ہورہا تھا۔ اسی ردِّعمل کے نتیجے میں امیر حجاجؒ ہر حکومت مخالف باغی کے لیے" عدو اللہ" یعنی "اللہ کے دشمن" کی اصطلاح استعمال کرتے تھے اور چونکہ ان کے نزدیک سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ کی حیثیت بھی حکومت کے باغی کی تھی سو انھوں نے ان کو بھی عدو اللہ کہہ کر مخاطب کیا، اس سے یہ بات قطعی ثابت نہیں ہوتی کہ وہ حقیقتاً بھی ابن زبیرؓ کو اللہ کا دشمن جانتے تھے جیسا کہ آگے بیان کردہ ان کے ایک خطبہ سے خود واضح ہوجائیگا۔ تاہم اس بات سے ہمیں انکار نہیں کہ ایک صحابی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے اس طرح کے الفاظ سخت غیر مناسب ہیں لیکن جو لوگ مشاجرات صحابہؓ کی تاریخ پر گہری نگاہ رکھتے ہیں، وہ مابعد کے دور میں ہونے والے اس واقعہ کی نفسیات کو اچھے سے سمجھ سکتے ہیں کہ بہت سے واقعات اپنے مخصوص سیاسی ماحول میں رونما ہورہے ہوتے ہیں جو کہ صرف اُس وقت تک ہی خاص ہوتے ہیں۔ ان حالات میں پیش آمدہ واقعات کو مابعد کے زمانے میں کسی شخصیت کو مطعون کرنے کے لیے سند بنانا چنداں درست طرز عمل نہیں اور فلسفۂ تاریخ سے نافہمی کا شاخسانہ ہے۔ جبکہ ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ انہی سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ کی شہادت کے بعد امیر حجاجؒ نے ان کے بہترین آدمی ہونے کی گواہی دی۔ علامہ ابن کثیر دمشقیؒ لکھتے ہیں:

"جب حجاجؒ نے سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ کو شہید کردیا تو مکّہ میں لوگوں کے رونے کا شور بلند ہوا۔ اس پر حجاجؒ نے سب لوگوں کو مسجد میں جمع

کیا اور منبر پر چڑھ کر اللہ کی حمد و ثناء بیان کی اور کہا : یا أھل مکۃ! بلغني إكباركم قتل ابن الزبير، ألا و إن ابن الزبير كان من خيار هذه الأمة یعنی اے اہل مکہ! تم لوگوں نے ابن زبیرؓ کے قتل کرنے کو بہت بُرا جانا ہے، جان لو کہ یقیناً ابن زبیرؓ اس امت کے بہترین لوگوں میں سے ایک تھے ، یہاں تک کہ انھوں نے خلافت کی رغبت کی اور اس معاملے میں اس کے اہل افراد سے نزاع کیا ، جس کی وجہ سے وہ اطاعتِ الٰہی سے باہر نکل گئے اور انھوں نے اللہ کے حرم کی آڑ لی۔ اور اگر کوئی شے نافرمانوں کے لیے آڑ ہوسکتی تھی تو آدمؑ کے لیے جنت اللہ کی مقرر کردہ حرمت کے لیے آڑ ہوتی۔ بے شک اللہ نے آدمؑ کو اپنے ہاتھوں سے پیدا کیا، اور ان میں اپنی روح پھونکی، اور ملائکہ کو حکم دیا کہ آدمؑ کو سجدہ کریں اور ان کو جنت میں سکونت دی۔ اس کے بعد جب آدمؑ سے خطا سرزد ہوئی تو اللہ نے اُس خطا کی پاداش میں ان کو جنت سے بے دخل کردیا۔ اور اللہ کے نزدیک آدمؑ ابن زبیرؓ سے زیادہ مُکرّم تھے اور جنت کی حرمت اللہ کے نزدیک کعبہ کی حرمت سے بڑھ کر ہے۔تم اللہ کو یاد کرو، اللہ تمھیں یاد کرے گا۔"(۱)

امیر حجاجؒ کا یہ خطبہ جہاں ان کی فصاحت و بلاغت پر شہادت دیتا ہے وہیں یہ بھی واضح کردیتا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ سے ان کے جو بھی معاملات تھے وہ خالص سیاسی نوعیت کے تھے اور ان کے دل میں سیدنا ابن زبیرؓ کا ادب و احترام اور ان کی فضیلت کا اقرار بدرجہ اتم موجود تھا جس کا انھوں نے بھرے مجمع میں اقرار بھی کیا اور انتہائی لطیف پیرائے میں سیدنا ابن زبیرؓ کی خطا کو بیان کیااور اس کے لیے سیدنا آدمؑ کے قصہ کو بطور استدلال پیش کیا۔ جو کہ اس بات پر مزید ثبوت کی حیثیت رکھتا ہے

۱۔ البدایہ والنہایہ، جلد ۹ ،صفحہ ۱۲۰۔

کہ ابن زبیرؓ کو حجاجؒ کس قدر متّقی ، بلند مرتبہ اور محبِّ اللہ جانتے تھے۔ سو اس روایت سے یہ استدلال کرنا کہ امیر حجاجؒ سیدنا ابن زبیرؓ کی فضیلت کے منکر تھے یا ان کو دشمنِ خدا جانتے تھے، سخت مغالطہ انگیزی اور اس دور کے سیاسی حالات سے ناواقفیت و نافہمی ہوگی۔

بعض لوگ سیدنا اسماء بنت ابی بکرؓ کی اسی روایت کو بنیاد بنا کر امیر حجاجؒ پر سخت لعن طعن کرتے ہیں کہ انھوں نے سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ کے جسد کو ایک کھجور کے تنے سے لٹکا دیا تھا۔ روایت کے الفاظ ہیں:

أَخْبَرَنَا الْأَسْوَدُ بْنُ شَيْبَانَ، عَنْ أَبِي نَوْفَلٍ، رَأَيْتُ عَبْدَ اللهِ بْنَ الزُّبَيْرِ عَلَى عَقَبَةِ الْمَدِينَةِ

ہمیں اسود بن شیبان نے ابو نوفل سے خبر دی، کہا: میں نے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ (کے جسد خاکی) کو شہر کی گھاٹی میں (کھجور کے ایک تنے سے لٹکا ہوا) دیکھا۔

لیکن معترضین یہ نہیں دیکھتے کہ اس روایت کے آگے کے الفاظ میں سیدنا عبداللہ بن عمرؓ کا وہاں سے گزرنے کا ذکر موجود ہے جس میں وہ سیدنا ابن زبیرؓ کی شہادت پر اظہارِ افسوس ضرور کرتے ہیں لیکن ان کے جسد کو یوں لٹکا دیکھ کر حجاجؒ یا ان کی فوج کی بابت کوئی سخت لفظ نہیں کہتے یا کوئی اعتراض نہیں کرتے۔ اور سیدنا عبداللہ بن عمرؓ اعتراض کر بھی کیسے سکتے تھے جب کہ وہ خود اس وقت کے سیاسی حالات سے واقف تھے اور جانتے تھے کہ عموماً اس طرح کے سیاسی حالات میں ایسی بے اعتدالیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ان کی آنکھوں کے سامنے جنگ جمل و صفین ہوئی تھیں، واقعہ کربلا ہوا تھا، واقعہ حرّہ ہوا تھا جہاں ایک طرف جنگِ جمل کے اختتام پر سیدنا علیؓ کی فوج کا ایک آدمی انہی عبداللہ بن زبیرؓ کے والد سیدنا زبیر بن العوامؓ کا سر لے کر سیدنا علیؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہتا ہے کہ میں نے ابن العوامؓ کو قتل کیا، لائیں مجھے انعام

دیجیے، جس پر سیدنا علیؓ اس کو جہنم کی وعید سنا وہاں سے چلے جانے کا کہنے پر اکتفا کرتے ہیں: كُنْتُ جَالِسًا عِنْدَ عَلِيٍّ فَأُتِيَ بِرَأْسِ الزُّبَيْرِ وَمَعَهُ قَاتِلُهُ، فَقَالَ عَلِيٌّ: لِلْآذِنِ بَشِّرْ قَاتِلَ ابْنِ صَفِيَّةَ بِالنَّارِ، سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: ''لِكُلِّ نَبِيٍّ حَوَارِيٌّ، وَإِنَّ حَوَارِيَّ الزُّبَيْرُ''[1] تو دوسری طرف سیدنا حسین بن علیؓ کا سر سیدنا انس بن مالکؓ کے سامنے رکھا ہوتا ہے جس کو ابن زیاد چھڑی سے چھورہا ہوتا ہے (صحیح بخاری)۔ یہی وجہ تھی کہ سیدنا عبداللہ بن عمرؓ جب سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ کے جسد کو لٹکا دیکھتے ہیں تو صرف اظہار افسوس کر کے آگے گزر جاتے ہیں، جیسا کہ روایت میں آگے آیا ہے:

قَالَ: فَجَعَلَتْ قُرَيْشٌ تَمُرُّ عَلَيْهِ، وَالنَّاسُ حَتَّى مَرَّ عَلَيْهِ عَبْدُ اللهِ بْنُ عُمَرَ، فَوَقَفَ عَلَيْهِ فَقَالَ: السَّلَامُ عَلَيْكَ، أَبَا خُبَيْبٍ السَّلَامُ عَلَيْكَ أَبَا خُبَيْبٍ السَّلَامُ عَلَيْكَ أَبَا خُبَيْبٍ أَمَا وَاللهِ لَقَدْ كُنْتُ أَنْهَاكَ عَنْ هَذَا، أَمَا وَاللهِ لَقَدْ كُنْتُ أَنْهَاكَ عَنْ هَذَا، أَمَا وَاللهِ لَقَدْ كُنْتُ أَنْهَاكَ عَنْ هَذَا، أَمَا وَاللهِ إِنْ كُنْتَ، مَا عَلِمْتُ، صَوَّامًا، قَوَّامًا، وَصُولًا لِلرَّحِمِ، أَمَا وَاللهِ لَأُمَّةٌ أَنْتَ أَشَرُّهَا لَأُمَّةٌ خَيْرٌ، ثُمَّ نَفَذَ عَبْدُ اللهِ بْنُ عُمَرَ۔

کہا: تو قریش اور دوسرے لوگوں نے وہاں سے گزرنا شروع کردیا، یہاں تک کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہاں سے گزرے تو وہ ان (ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کے پاس کھڑے ہوگئے، اور (انھیں مخاطب کرتے ہوئے) کہا: ابو خبیب! آپ پر سلام! ابو خبیب! آپ پر سلام! ابو خبیب! آپ پر سلام! اللہ گواہ ہے کہ میں آپ کو اس سے روکتا تھا، اللہ گواہ ہے کہ میں آپ کو اس سے روکتا

ا۔ (مستدرک الحاکم، مسند احمد، طبقات الکبریٰ لابن سعد، معجم الکبیر الطبرانی۔

تھا، اللہ گواہ ہے کہ میں آپ کو اس سے روکتا تھا،اللہ کی قسم! آپ، جتنا مجھے علم ہے، بہت روزے رکھنے والے ،بہت قیام کرنے والے ،بہت صلہ رحمی کرنے والے تھے۔ اللہ کی قسم! وہ امت جس میں آپ سب سے بُرے ہوں،وہ امت تو پوری کی پوری بہترین ہوگی۔ پھر عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہاں سے چلے گئے۔

البتہ جب امیر حجاجؒ کو وہاں عبداللہ بن عمرؓ کی آمد کا پتہ چلتا ہے تو ان کو شرم و خجالت محسوس ہوتی ہے اور فوراً سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ کے جسد کو اتروا لیتے ہیں۔ اسی روایت میں آتا ہے:

فَبَلَغَ الْحَجَّاجَ مَوْقِفُ عَبْدِاللهِ وَقَوْلُهُ،فَأَرْسَلَ إِلَيْهِ،فَأُنْزِلَ عَنْ جِذْعِهِ فَأُلْقِيَ فِي قُبُورِ الْيَهُودِ

حجاجؒ کو عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے وہاں کھڑے ہونے کی خبر پہنچی تو انھوں نے لوگوں کو بھیج کر ،ان (کے جسد خاکی) کو کھجور کے تنے سے اتارا گیا اور ان کے جسد خاکی کو یہود کے قبرستان میں ڈلوا دیا۔

بلاشبہ اس وقت کے سیاسی حالات کچھ بھی رہے ہوں، ہم اس بابت امیر حجاجؒ کا دفاع نہیں کرتے اور ان کے اس فعل کو مذموم ہی مانتے ہیں جو کہ انھوں نے سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ کے جسد خاکی کے ساتھ کیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس وقت کی جنگی نفسیات کے تحت اگر سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ کی جگہ خود حجاج یا امیر عبدالملک بن مروانؒ ہوتے اور سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ کو ان پر فتح حاصل ہوجاتی تو ابن زبیرؓ بھی حجاجؒ و عبدالملکؒ کے ساتھ شائد ایسا ہی کرتے۔ جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ اور یزید بن معاویہ کے قضیے سے متعلق تاریخ میں ملتا ہے کہ جب یزید بن معاویہ نے سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ کے بھائی جناب عمرو بن زبیرؓ کو ان کی طرف مکّہ بھیجا تو ان دونوں کی جماعتوں میں آپس میں مڈبھیڑ ہوگئی اور سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ نے عمرو بن زبیرؓ

کو گرفتار کرلیا۔ جب یہ گرفتار ہورہے تھے تو ان کے دوسرے بھائی عبیدہ بن زبیرؓ نے انھیں اپنی پناہ میں لینا چاہا مگر عبداللہ بن زبیرؓ نے اس پناہ کا پاس نہ کیا اور اپنے بھائی عمرو بن زبیرؓ کو قید کردیا۔ متعدد روایتوں میں بیان ہوا ہے کہ ان عمرو بن زبیرؓ کو قید میں سخت سے سخت اذیتیں دی گئیں، نہایت بے رحمی سے کوڑوں سے پیٹا گیا یہاں تک کہ اس زدوکوب سے ان کی جان نکل گئی۔[۱] پھر سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ نے حکم دیا کہ ان کی لاش کو سولی پر چڑھادیا جائے۔[۲] علامہ ابن سعد اس بابت مزید لکھتے ہیں:

فأمر به عبد الله فطُرح في شِعْب الجيف وهو الموضع صُلب فيه عبد الله بن الزبير بعدُ۔[۳]

سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ نے حکم دیا کہ ان کی لاش کو (سولی سے اتار کر) شعب الجیف یعنی الجیف کی گھاٹی میں پھینک دیا جائے اور یہ وہی جگہ تھی جہاں بعد میں سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ کو سولی دی گئی تھی۔

اس حادثہ کا بہت کچھ چرچا ہوا، شاعروں نے مرثیے تک لکھے جس کے جواب میں سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ فرمایا کرتے تھے کہ اقامتِ حق اور اصلاح کے سوا میری اور کوئی غرض نہ تھی۔[۴] بعینہٖ اسی سے ملتا جلتا عذر امیر حجاج بن یوسفؒ کی طرف سے بھی آیا جیسا کہ اوپر ہم نے البدایہ و النہایہ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ سو جب سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ کے اس فعل کو جو کہ انھوں نے اپنے بھائی عمرو بن زبیرؓ کے ساتھ کیا، مذموم سمجھتے ہوئے بھی، سیاسی مصالح اور اس وقت کے حالات کو پیش نظر رکھتے

۱۔ الانساب الاشراف للبلاذری، جلد ۴ صفحہ ۳۶۔

۲۔ الانساب الاشراف، جلد ۴ صفحہ ۳۸۔

۳۔ طبقات ابن سعد، جلد ۷، تحت الترجمۃ عمرو بن الزبیر، صفحہ ۱۸۵۔

۴۔ الانساب الاشراف، جلد ۴ صفحہ ۳۸۔

ہوئے ہم سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ پر طعن کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتے تو پھر امیر حجاجؒ کو اسی کام کے لیے مطعون کرنا کیوں۔ بلاشبہ یہ افعال اپنی ذاتی حیثیت میں اپنے اندر قباحت کا پہلو رکھتے تھے لیکن جس زمانے میں یہ افعال سرزد ہورہے تھے، ان کو نظر انداز کرکے ان افعال کے تحت شخصیات کو مطعون کرنا سخت غیر درست طرزِ عمل ہوگا۔ یہی نہیں بلکہ یزید بن معاویہ کے دور میں بنو امیہ کے ایک وفادار سعد مولیٰ عتبہ بن ابوسفیان اور ان کے پچاس ساتھیوں کو سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ نے گرفتار کرواکر حرم مکی میں بلوابھیجا اور یہاں آنے پر ان کی گردنیں ماردیں:

وضرب اعناقهم في الحرم۔[1]

سیدنا عبداللہ بن عباسؓ کو اس بات کا پتہ چلا تو سخت ناراض ہوئے اور فرمایا:

وإن لقيت قاتل أبي بالحرم ماقتلته۔[2]

اگر میں اپنے والد کے قاتل کو بھی حرم کے اندر پاتا تو اس کو قتل نہ کرتا۔

اب اگر کوئی ایسے واقعات کو بنیاد بناکر سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ کو مطعون کرنا شروع کردے اور ان سیاسی حالات کو یکسر نظر انداز کردے جن میں یہ سب کچھ ہورہا تھا تو کیا اس کو درست طرزِ عمل کہا جاسکتا ہے؟ یقیناً نہیں۔ پھر یہ بھی یاد رہے کہ ایسے افعال صرف سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ یا امیر حجاجؒ سے سرزد نہیں ہوئے، بلکہ اس دور کی دوسری شخصیات سے بھی سیاسی تقاضوں اور وقتی مصالح کے تحت ایسے افعال کا صدور ملتا ہے۔ جیسے کہ امیر عمر بن عبدالعزیزؒ جن کو بنو امیہ مخالفین اس خاندان کا سب سے نیکوکار اور بعض حضرات پانچواں خلیفۂ راشد باور کرواتے ہیں، ان سے متعلق بھی تقریباً

۱۔ انساب الاشراف، جلد ۴، صفحہ ۳۰۔

۲۔ ایضاً۔

تمام قدیم کتب تاریخ میں تصریح ملتی ہے کہ انھوں نے سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ کے صاحبزادے جناب خبیب بن عبداللہ بن زبیرؓ، جن کے نام پر سیدنا ابن زبیرؓ کی کنیت ابوخبیب تھی، کو مدینہ میں سخت اذیتیں دے کر قتل کروا دیا تھا جبکہ انھیں جناب خبیب بن عبداللہؒ کو امیر حجاج بن یوسفؒ نے معرکہ ابن زبیرؓ کے وقت امان دی تھی جس پر یہ اپنے والد کا ساتھ چھوڑ کر حجاجؒ کی امان میں داخل ہوگئے تھے۔ طبری سن ۹۳ھ کے واقعات کے ذیل میں لکھتے ہیں:

وفیہا ضرب عمر بن عبدالعزیز خبیب بن عبداللہ بن الزبیر بأمر الولید إیاہ وصب علی رأسہ قربۃ من ماء بارد۔ الخ۔

اور اسی سال امیر عمر بن عبدالعزیزؒ نے ولید کے حکم پر جناب خبیب بن عبداللہ بن زبیرؒ کو خوب پٹوایا اور ان کے سر پر ٹھنڈے پانی کی پکھال چھڑوا دی۔ عمر بن عبدالعزیز نے ان خبیب کو پچاس کوڑے لگوائے اور سخت سردی کے موسم میں ان کے سر پر پانی کی پکھال چھڑوا دی اور دن بھر ان کو مسجد کے دروازے پر کھڑے رکھا اور انھیں تکالیف کے زیرِ اثر ان کی موت واقع ہوگئی۔ (۱)

گویا ان تمام تاریخی روایات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس وقت کے حالات میں اس طرح سزائیں اپنے سیاسی مخالفین کو دینا ایک معمول تھا۔ ان کے ارتکاب کے ضمن میں کسی ایک شخص کو مطعون کرنا چنداں مناسب نہیں۔ لیکن پھر بھی امیر حجاجؒ کے اس طرز عمل کو ان کے معترضین اس طرح سے پیش کرتے ہیں جیسے امیر حجاجؒ اس زمانے میں فردِ واحد ہوں جن سے یہ سارے کام سرزد ہوئے، باقی کسی حاکم یا عامل نے یہ کام نہ کیے ہوں۔ جبکہ ہم ثابت کر آئے ہیں کہ اس طرح کی سزاؤں اور سلوک کا مظاہرہ خود سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ اور امیر عمر بن عبدالعزیزؒ سے بھی ہو چکا تھا اور ان سے پیشتر

۱۔ (طبری، جلد ۶، صفحہ ۴۸۲، تحت ایام، ۹۳ ہجری۔

اور ان کے مابعد بھی عاملین اور حکمران اس طرح کی سزاؤں اور سلوک کا نفاذ کرتے رہے ہیں۔ سو امیر حجاجؒ کے اس طرح کے اقدامات کو پیش کر کے ان کو مطعون کرنا تاریخِ اسلامی کی غیر صحیح فہم کا نتیجہ قرار دیا جاسکتا ہے اور کچھ نہیں۔

تاہم اپنی جبلی و فطری سختی کے سبب امیر حجاجؒ نے ایک سن رسیدہ بزرگ صحابیہ سیدہ اسماء بنت ابی بکرؓ کے ساتھ جو سختی اور ترشی کا مظاہرہ کیا، ہم اس کو غلط جانتے ہیں اور اس بابت امیر حجاجؒ کے کسی قسم کے دفاع کے قائل نہیں۔ اللہ ان کی اس لغزش پر ان کو معاف فرمائے۔ آمین

البتہ بعض لوگ سیدہ اسماء کے الفاظ کہ

"کذاب (مختار ثقفی) کو تو ہم نے دیکھ لیا اور رہا سفاک تو میں نہیں سمجھتی کہ تیرے علاوہ کوئی اور ہوگا"

کو نقل کر کے امیر حجاجؒ کو الہامی طور سے مصدقہ ظالم و سفاک ثابت کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں، جبکہ ایسا کرتے ہوئے وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ ایک ایسی دُکھی ماں کا قول ہے جس کو ابھی ابھی اپنے بیٹے کی شہادت کی خبر ملی ہے اور اس کا سامنا اس شخص سے ہو رہا ہے جس کی فوج سے قتال کرتے ہوئے اس کا بیٹا شہید ہوا ہے سو فرطِ جذبات میں سیدہ اسماء کا ایسا کہنا ان کے غم و غصہ اور ذاتی رائے کا اظہار تو ہوسکتا ہے لیکن فرمان رسول ﷺ یا وحی الٰہی نہیں کہ اس پر لازمی ایمان لاتے ہوئے امیر حجاجؒ کو قطعیت سے ظالم و سفاک قرار دیا جائے۔ پس اوپر کے مبحث سے ثابت ہوتا ہے کہ اس روایت کو امیر حجاجؒ کو ظالم یا فاسق ثابت کرنے کے لیے پیش کرنا نہایت نامعقول سعی ہے جس کی کوئی ٹھوس علمی بنیادیں نہیں۔ امید ہے کہ ہماری اس بحث سے قارئین کے ذہن میں اس روایت سے متعلق تمام اشکالات رفع ہو گئے ہوں گے۔

فتنۂ ابن الاشعث:

جہاں تک محمد بن عبدالرحمٰن بن الاشعث کی بغاوت کی بات ہے تو حقیقت یہی

ہے کہ ابن الاشعث کی حیثیت ایک باغی سپہ سالار کی تھی جس نے حکومتِ وقت سے بغاوت کرکے کفار سے جا ملنے جیسا کریہہ گناہ کیا، یہی وجہ ہے کہ تمام مؤرخین نے ابن الاشعث کی بغاوت کو فتنۂ ابن الاشعث کی سرخی قائم کرکے اپنی کتابوں میں یاد کیا ہے۔ بعض لوگوں نے چند علماء اور کچھ قراء کے ابن الاشعث کے ساتھ ہونے کی بناء پر اس کی برپا کردہ بغاوت کو جائز قرار دینے کی کوشش کی ہے لیکن ایسا کرتے ہوئے یہ حضرات یہ بھول جاتے ہیں کہ بلاشبہ ابتداء میں ابن الاشعث کے ساتھ کچھ حفاظ و قراء بھی شامل تھے لیکن ان کی موجودگی اس کے ساتھ صرف اس وقت تک تھی جب تک وہ حکومت کی طرف سے غیر مسلم والیٔ سجستان رتبیل سے نبرد آزما تھا لیکن جیسے ہی اس نے حکومت کے خلاف بغاوت کرکے اسی کافر رتبیل سے ہاتھ ملالیا تو حفاظ وقراء آہستہ آہستہ کرکے اس کا ساتھ چھوڑ کر امیر حجاجؒ کے ساتھ ملتے گئے۔ امام عامر بن شراحیل الشعبیؒ جو کہ ابتداء میں محمد بن عبدالرحمٰن بن الاشعث کے ساتھ اس بغاوت میں امیر حجاجؒ کے خلاف شامل تھے، بعد از ناکامیٔ بغاوت امیر حجاجؒ کے دربار میں حاضر ہوکر صاف تصریح کرتے ہیں کہ

أصلح الله الأمير خبطتنا فتنة فما كنا فيها أبرارأتقياء ولا فجارأقوياء

''اللہ امیر (حجاجؒ) کی اصلاح فرمائے! محمد بن عبدالرحمٰن بن الاشعث کا ساتھ دینا میرے لیے فتنہ تھا، ہم نے اس کے ساتھ نیک اور متقی لوگوں کو نہیں پایا، وہ چند شریر لوگ تھے جو آپ سے قوی نہ تھے۔''(۱)

یہی نہیں بلکہ جب امیر حجاجؒ امام شعبیؒ سے پوچھتے ہیں کہ آپ نے ہمیں چھوڑنے کے بعد ابن الاشعث اور اس کے ساتھ کو کیسا پایا تو امام شعبیؒ جواب دیتے ہیں:

۱۔ طبقاتِ ابن سعد، جلد ۸ تحت الترجمہ عامر بن شراحیل شعبی۔

''اللہ امیر کی اصلاح فرمائے! آپ کے بعد میں چین کی نیند نہ سو سکا اور (میرے لیے) نرم زمین پر چلنا پہاڑوں پر چلنے سے زیادہ پُر مشقت ہوگیا اور گھر کا صحن بھی میرے لیے غیر محفوظ ہو گیا اور خوف میرے دل میں گھر کر گیا اور پریشانیاں میرے اوپر عام ہوگئیں ، پس میں اپنے نیکوکار بھائیوں کی رفاقت سے محروم ہوگیا اور امیر (حجاج) کا نعم البدل نہیں پا سکا۔ اس پر حجاجؒ نے امام شعبیؒ سے کہا کہ آپ تشریف لے جایئے اور وہ چلے آئے۔''(۱)

امام شعبیؒ جیسے جلیل القدر عالم ومحدث کے مذکورہ بالا اقوال یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ ابن الاشعث کی امیر حجاجؒ کے خلاف کی گئی بغاوت نہایت غلط بنیادوں پر تھی اور اس بغاوت میں اس کے ساتھ شامل ہونے والے لوگوں کی اکثریت شریر لوگوں پر مشتمل تھی جبکہ ان ہی شریر لوگوں کے پروپیگنڈے سے متاثر ہوکر کچھ نیک فطرت لوگ بھی اس کے ساتھ شامل ہوگئے تھے۔ امیر حجاجؒ کا اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے فوجی اقدام کرنا نہ صرف جائز بلکہ حالاتِ زمانہ اور حکومتِ اسلامیہ کے استحکام کے لیے نہایت مطلوب ومقصود اور احسن قدم تھا جہاں ابن الاشعث جیسا باغی مسلمانوں کی جماعت چھوڑ کر محض حصولِ اقتدار کی لالچ میں والیٔ سجستان رتبیل جو کہ ایک غیر مسلم تھا سے جا ملا تھا۔

ہوا کچھ یوں تھا کہ ۸۰ ہجری میں امیر حجاجؒ نے والیٔ سجستان رتبیل کی فساد انگیزیوں اور وقتاً فوقتاً کی جانے والی بغاوتوں کو فرو کرنے کے لیے بصرہ وکوفہ کے لوگوں پر مشتمل ایک بڑا لشکر تیار کرکے عبدالرحمٰن بن محمد بن الاشعث کی سرکردگی میں اس کی طرف بھیجا۔ مؤرخین نے تصریح کی ہے کہ امیر حجاجؒ اور ابن الاشعث کے مابین کچھ ناچاقی عرصۂ دراز سے موجود تھی اور ابن الاشعث اس کو لے کر امیر حجاجؒ

۱۔ البدایہ والنہایہ، جلد ۹ صفحہ ۴۹۔۵۰۔

کی طرف سے کبیدہ خاطر رہتا تھا۔ ان ذاتی رنجشوں کے باوجود حکومتِ وقت کے استحکام کے لیے امیر حجاجؒ نے ابن الاشعث کی صلاحیتوں پر اعتماد کرتے ہوئے پوری دیانت کے ساتھ لشکر کی امارت اس کے سپرد کردی اور ساتھ ہی اس لشکر پر ہر طرح کے نوازش و اکرام روا رکھے۔ علامہ ابن کثیر دمشقیؒ لکھتے ہیں:

''امیر حجاجؒ نے اس لشکر کو پوری طرح تیار کرنے اور اسے انعام و اکرام سے نوازنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور بہت سوچ و بچار کے بعد لشکر کی امارت و سرداری بھی عبدالرحمٰن بن محمد بن الاشعث کے سپرد کردی اور اسی کو اس لشکر کا امیر بنا دیا۔ عبدالرحمٰن بن محمد بن الاشعث کا چچا اسمٰعیل بن الاشعث حجاجؒ کے پاس آیا اور کہنے لگا: تم نے عبدالرحمٰن کو امیر تو بنادیا ہے لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ فرات کا پل عبور کرتے ہی وہ تمھاری اطاعت سے باہر نکل جائے گا۔ اس پر امیر حجاجؒ نے جواب دیا کہ اس معاملے میں وہ آپ کا نہیں میرا دوست ہے اب۔ میں کب ڈرتا ہوں کہ وہ میری اطاعت سے نکل جائے یا میری مخالفت کرے (یعنی ایسا کرنے کی صورت میں میں اس سے نپٹ لوں گا)۔ پس ابن الاشعث فوج لےکر رتبیل کے علاقہ کی طرف نکل کھڑا ہوا۔ جب رتبیل کو ابن الاشعث کی آمد کی اطلاع ہوئی تو اس نے اس کو خط لکھا جس میں اس نے گزشتہ سال اس کے ہاتھوں سے مسلمانوں کو جو زک اور نقصان پہنچا تھا، اس کی معافی مانگی اور کہا کہ اسے مجبوراً مسلمانوں سے لڑنا پڑا تھا۔ اس نے مسلمانوں کو سالانہ خراج ادا کرنے کی بھی پیش کش کی۔ لیکن ابن الاشعث نے اس کی ایک نہ سنی اور اس کے علاقوں پر علاقے فتح کرتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ رتبیل کو بھی اپنی قوت مجتمع کرکے لڑائی پر آمادہ ہونا پڑا۔ ابن الاشعث جو قلعہ فتح کرتا اس پر ایک

عامل مقرر کرتا اور علماء و فقہاء کی ایک جماعت کو اس کے ساتھ کردیتا۔ غرض ابن الاشعث نے رتبیل کے ملک کے اور بہت سے شہروں پر قبضہ کرلیا اور بہت سا مال و دولت حاصل کیا اور خلقِ کثیر کو غلام بنالیا اور پھر اپنی فوجوں کو مزید فتوحات روکنے کا حکم دے دیا تاکہ مفتوحہ علاقوں کا انتظام کارمکمل ہو اور تمام شہروں، قلعوں اور قصبات پر انتظامیہ کا پورا پورا عمل دخل ہوجائے اور اس میں کافی وقت لگ گیا۔ ابن الاشعث نے امیر حجاجؒ کو تمام واقعات اور فتح کی پوری تفصیل سے آگاہ کیا اور رتبیل اور اس کے فوجیوں کے خلاف جو مزید کاروائی کرنے کا ارادہ تھا اس سے باخبر کیا۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ امیر حجاجؒ نے ہمیان بن عدی السدوسی کو مسلح کرکے کرمان کی طرف بھیجا تاکہ وہ وہاں جاکر سجستان اور سندھ کے عاملوں کی مدد کرے لیکن ہمیان نے امیر حجاجؒ کا حکم ماننے سے انکار کردیا۔ اس پر امیر حجاجؒ نے ابن الاشعث کو ہمیان کی سرکوبی کے لیے کرمان روانہ کیا، جس نے اس کو شکست دی، اسی دوران عبیداللہ بن ابی بکرہ کا انتقال ہوگیا تو امیر حجاجؒ نے ابن الاشعث کو ابن ابی بکرہ کی جگہ سجستان کا امیر بھی بنادیا اور اس کے پاس مزید لشکر بھیجا، جس پر تحفے تحائف کے علاوہ لاکھ دینار خرچ ہوئے۔ یہ لشکر جیش الطّوویس کے نام سے مشہور ہوا، اسی لشکر نے رتبیل پر چڑھائی کی تھی جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔"(۱)

ابن کثیرؒ کے اس طویل اقتباس سے یہ بات بالکل واضح طور پر مترشح ہوجاتی ہے کہ امیر حجاج بن یوسف ثقفیؒ نے عبدالرحمٰن بن محمد بن الاشعث اور اس کے لشکریوں کی مدد اور خاطر مدارات میں کوئی کمی نہ چھوڑ رکھی تھی اور ان کو اس مہم کے دوران ہر

۱۔ البدایہ والنہایہ، جلد ۹ صفحہ ۳۱-۳۲۔

طرح کی رسد بروقت اور بہم پہنچائی۔ گویا انھوں نے ابن الاشعث اور اس کے لشکریوں پر ہر طرح سے انعام و اکرام کی بارش کر رکھی تھی اور ان کی مکمل خبر گیری خاص دربار حجاجؒ کی طرف سے ہو رہی تھی۔ لیکن اس کے باوجود جب ابن الاشعث کو پے در پے فتوحات ملتی گئیں اور رتبیل کی طرف سے انعام و اعزاز کا لالچ دیا جانے لگا تو اس نے امیر حجاجؒ کے خلاف اپنی پرانی رنجش کے سبب بغاوت کر دی۔ علامہ ابن کثیرؒ ابن الاشعث کی اس بغاوت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وكان سبب هذه الفتنة أن ابن الأشعث كان الحجاج يبغضه وكان هو يفهم ذلك ويضمر له السوء وزوال الملك عنه۔[1]

”فتنہ ابن الاشعث کا سبب یہ بنا کہ امیر حجاجؒ ابن الاشعث سے (بعض باتوں کی وجہ سے) غضبناک یعنی ناراض تھے، اور ابن الاشعث اس بات کو جانتا تھا جس کی وجہ سے وہ اپنے دل میں حجاجؒ کے لیے انتقام رکھتا تھا اور تمنا کرتا تھا کہ امیر حجاجؒ سے اقتدار چھن جائے۔“

اب جب ابن الاشعث کی فوج کو تازہ دم ہونے کے لیے کافی وقت مل گیا جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے تو امیر حجاجؒ نے ابن الاشعث کو مزید پیش قدمی کرنے کو کہا لیکن ابن الاشعث نے امیر حجاجؒ کی ہدایت پر عمل نہ کیا اور فوج کو مسلسل روکے رکھا۔ امیر حجاجؒ کو خطرہ محسوس ہوا کہ اس تاخیر سے رتبیل کو مسلمانوں کے خلاف مزید تیاری کرنے کا وقت مل جائے گا سو انھوں نے سختی سے ابن الاشعث کو لکھا کہ وہ فوری طور سے دشمن کی سرزمین میں آگے کی جانب پیش قدمی کرے اور ساتھ ہی تنبیہ کی کہ اگر اس نے مزید سستی دکھائی تو امیر حجاجؒ اس کو معزول کر کے سخت سزا دیں گے۔ امیر حجاجؒ کے اس تہدید آمیز خط سے عبدالرحمٰن بن محمد بن الاشعث سخت چراغ پا ہوا اور اس نے اپنے ماتحتوں کو صاف کہہ دیا کہ میں تو حجاجؒ کی اطاعت

۱۔ البدایہ و النہایہ، جلد ۹ ،صفحہ ۳۵۔

کر کے خود کو مصیبت میں نہیں ڈالوں گا اور کل اس بابت میری جو رائے تھی، میں اس پر آج بھی قائم ہوں، انا فلست مطیعه ولا أنقض رأیا رأیته بالأمس۔[1] البتہ تم اپنا معاملہ دیکھ لو اور پھر ان کو بھڑکانے کے لیے ایک پُر اثر لیکن جھوٹی تقریر کی جس میں امیر حجاجؒ پر بہتان باندھا کہ وہ ان کو آنے والے جاڑے کے موسم میں جنگ کا حکم دے کر اسلامی فوج کو ہلاکت میں ڈالنا چاہتے ہیں، یہاں تک کہ تمام لشکری امیر حجاجؒ کے خلاف ہوگئے۔ تاہم اس وقت ابن الاشعث کے لشکریوں نے صرف امیر حجاجؒ کے حکم سے باہر نکلنے کو ترجیح دی، خلیفہ کی بیعت میں وہ بدستور داخل تھے جیسا کہ البدایہ و النہایہ میں میں تصریح ہے:

ولم یذکر خلع عبد الملك۔[2]

یعنی اس میں عبدالملک کی بیعت سے نکلنے کا ذکر نہیں تھا لیکن جلد ہی امیر حجاجؒ کے خلاف ابن الاشعث کی باغی افواج کی فتوحات نے ان لوگوں کا دماغ مزید خراب کرنا شروع کر دیا اور ابن الاشعث اور اس کے ساتھی اس قدر خود سر اور باغی ہو چلے کہ انھوں نے بعد میں امیر المومنین عبدالملک بن مروانؒ کی بیعت بھی توڑ ڈالی۔ علامہ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ جب تستر کے معرکہ میں پہلی دفعہ ابن الاشعث کی باغی فوج کو امیر حجاجؒ کی فوج کے خلاف وقتی کامیابی ملی تو ابن الاشعث کا حوصلہ اس قدر بلند ہوگیا کہ اس نے علی الاعلان خلیفہ عبدالملک بن مروانؒ کی بیعت فسخ کرنے کا اعلان کر کے ان کے خلاف قتال کا حکم دے دیا:

ودخل ابن الأشعث البصرة فخطب الناس بهم و بایعهم و بایعوه علی خلع عبد الملك ونائبه الحجاج بن یوسف، وقال لهم ابن الأشعث: لیس الحجاج بشیء، ولکن اذهبوا بنا إلی

۱۔ البدایہ و النہایہ، جلد ۹، صفحہ ۳۵۔

۲۔ ایضاً۔

عبدالملك تقاتله۔(۱)

''اور ابن الاشعث بصرہ میں داخل ہوا اور لوگوں سے خطاب کیا۔ لوگوں نے اس کے ہاتھ پر عبدالملک اور اس کے نائب حجاج بن یوسف سے علیحدگی کی بیعت کی۔ ابن الاشعث نے لوگوں سے کہا کہ حجاج تو کسی شمار قطار ہی میں نہیں ہے، آؤ چلو ہم عبدالملک بن مروان سے جنگ کرنے چلتے ہیں۔''

اس کے بعد ابن الاشعث اور امیر حجاجؒ کے درمیان کئی معرکے ہوئے جس میں کبھی ابن الاشعث کو فتح ملتی تو کبھی امیر حجاجؒ کی فوج کو، تاہم شروع میں پلڑا ابن الاشعث کی فوج کا ہی بھاری رہا۔ جب قتال کافی بڑھا اور قریشی و غیر قریشی سارے لوگ اس سے متاثر ہونے لگے تو اہل الرائے امراء کی ایک جماعت امیر المومنین عبدالملک بن مروانؒ کے پاس پہنچی اور ان سے استدعا کی کہ اگر اہل عراق آپ سے اس بات پر راضی ہوجائیں کہ آپ امیر حجاجؒ کو معزول کردیں تو ہمارے خیال میں امیر حجاجؒ کی معزولی لوگوں کا خون بہانے اور مزید فساد سے بہتر ہے۔ خلیفہ عبدالملکؒ نے اس بابت اپنے بھائی بشر بن مروانؒ اور بیٹے عبداللہ بن عبدالملکؒ سے صلاح و مشورہ کیا اور اس کے بعد اہل عراق کی طرف ان حضرات کو خط لے کر بھیجا جس میں اہل عراق کو پیش کش کی :

''اہل عراق! اگر تم راضی ہو تو میں حجاج کو معزول کرنے کو تیار ہوں اور اہل شام کی طرح تم کو بھی عطایا دینے کو تیار ہوں اور یہ بھی اختیار دیتا ہوں کہ ابن الاشعث جس جگہ کو پسند کرے اس کو وہاں کا عامل بنادیا جائے گا اور جب تک اس کی اور میری زندگی ہے وہ امارت پر متمکن رہ سکتا ہے۔ عراق میں محمد بن مروان کو گورنر بنادیا جائے گا۔

۱۔ البدایہ و النہایہ، جلد ۹ ،صفحہ ۳۷،

اور ساتھ ہی یہ بھی تحریر کیا کہ اگر اہل عراق اس پر راضی نہ ہوئے تو حجاج اپنے عہدے پر قائم رہے گا اور امارتِ حرب بھی اسی کے پاس رہے گی اور محمد بن مروان اور عبداللہ بن عبدالملک اسی کے ماتحت رہیں گے اور جنگ و جدال کی صورت میں اس کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کرسکیں گے۔''(۱)

امیر حجاجؒ کو جب اس پیش کش کا پتہ چلا تو آپ کو سخت دکھ ہوا۔ آپ چاہتے تو مفسد ابن الاشعث کی طرح امیر عبدالملکؒ سے ناراض ہوکر ان کے خلاف بغاوت کردیتے جیسا کہ امیر حجاجؒ سے ناراض ہونے پر ابن الاشعث نے کیا کہ ان کی اطاعت سے باہر نکل گیا اور بعد میں اپنے ذاتی اقتدار کی لالچ میں خلیفہ عبدالملکؒ کی بیعت بھی توڑ دی۔ جبکہ امیر حجاجؒ کا اقتدار اس وقت پورے عراق پر تھا اور ان کے متعین کردہ عمال مشرقی سرحدوں کی توسیع میں مشغول تھے، وہ چاہتے تو نہایت آرام سے خلیفہ کے خلاف بغاوت کرسکتے تھے لیکن نہ ہی تو امیر حجاجؒ ابن الاشعث کی طرح مفسد تھے اور نہ ہی ان کو اپنے ذاتی اقتدار سے کوئی غرض تھی۔ ان کا اصل مقصد خلافتِ بنو امیہ کا استحکام تھا اور اسی میں وہ کوشاں تھے، سو اسی غرض سے انھوں نے پورے اخلاص کے ساتھ خلیفہ عبدالملکؒ کو ان کے اس ارادے سے منع کیا۔ اس متعلق امیر حجاجؒ نے امیر عبدالملک بن مروانؒ کو جو خط لکھا تھا وہ ان کی سیاسی بصیرت اور حالات و واقعات پر گہری نظر ہونے کا بین ثبوت ہے۔ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں:

''جب امیر حجاجؒ کو عبدالملک بن مروانؒ کی اس پیش کش کا پتہ چلا تو ان کو دلی رنج ہوا اور انھوں نے عبدالملک بن مروانؒ کو خط لکھا کہ اے امیر المومنین! واللہ اگر آپ نے اہل عراق کو یہ اختیار دے دیا تو میری معزولی کے بعد وہ فوراً آپ پر چڑھ دوڑیں گے اور یہ اقدام ان کی جرأت

۱۔ البدایہ النہایہ، جلد ۹ ،صفحہ ۴۱۔

میں مزید اضافہ کردے گا۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اہل عراق مالک الاشتر نخعی کے ساتھ سیدنا عثمان بن عفانؓ پر حملہ کرنے دارالخلافہ پہنچ گئے تھے اور جب انھوں نے سوال کیا کہ تم کیا چاہتے ہو تو ان کا جواب سعید بن العاص کی معزولی تھا اور جب ان کا یہ مطالبہ پورا ہوگیا تو وہ اس پر بھی قانع نہ ہوئے اور خلیفہ کی طرف چل پڑے اور ان کو قتل کر کے دم لیا۔ لوہا ہی لوہے کو کاٹتا ہے۔ آپ کا جو بھی فیصلہ ہو، اللہ کی مدد اس میں آپ کے شاملِ حال ہو۔ والسلام"(۱)

امیر حجاجؒ کے اس خط کا ایک ایک لفظ ان کی حکومتِ بنوامیہ سے وفاداری اور اس کے استحکام کے لیے ان کے اخلاص پر شاہد ہے۔ بہرحال خلیفہ عبدالملکؒ نے امیر حجاجؒ کے اس خط کو وقتی مصالح کے تحت درخوراعتناء نہ سمجھا اور ابن الاشعث اور اس کے لشکریوں کے لیے اپنی مذکورہ شرائط برقرار رکھیں۔ اب اگر ابن الاشعث اور اس کے ساتھیوں کے پیشِ نظر تھوڑی سی بھی بھلائی ہوتی تو وہ خلیفہ عبدالملک بن مروانؒ کی اس فراخدلانہ پیش کش کا خیر مقدم کرتے اور صلح کی طرف ہاتھ بڑھا کر جنگ و جدال کا خاتمہ کرتے۔ لیکن ان مفسد پردازوں کے نزدیک فساد برپا کر کے حصولِ اقتدار مقصود تھا اس لیے انھوں نے امیر عبدالملک بن مروانؒ کی ان شرائط کو حقارت سے مسترد کر دیا جبکہ خلیفہ عبدالملکؒ نے ان لوگوں کو اپنے معتمد اور کامیاب ترین جرنیل امیر حجاج بن یوسفؒ پر ترجیح دے کر یہ پیش کش کی تھی۔

ابن الاشعث کے اس پیش کش کو ٹھکرانے کے بعد عبداللہ بن عبدالملکؒ اور محمد بن مروانؒ دونوں حجاجؒ سے جا کر ملے اور ان کو کہا کہ اب معاملہ آپ پر منحصر ہے، آپ جو چاہے کریں، ہم آپ کی اطاعت کریں گے جیسا کہ پیش کش مسترد ہوجانے کی صورت میں امیرالمومنین عبدالملک

۱۔ البدایہ والنہایہ، جلد ۹، صفحہ ۴۱۔

نے ہم کو حکم دیا تھا: **فنحن طاعتك كما امرنا امير المؤمنين۔**[1]

قارئین یہاں خود ملاحظہ کر سکتے ہیں کہ ابن الاشعث اور اس کے ساتھیوں کا اصل مقصد کیا تھا۔ امیر حجاجؒ نے اس کو ایک شاندار فوج کے ساتھ رتبیل کے خلاف لشکر کشی کے لیے بھیجا تو اس فوج پر انعام و اکرام کی بارش کر رکھی اور اس کو ہر طرح کی رسد پہنچاتے رہے، اس کے بعد بھی ابن الاشعث بغاوت کرتا ہے تو خلیفہ عبدالملک بن مروانؒ اس کے خلاف کوئی تادیبی کاروائی کرنے کے بجائے اس کو منانے اور امن و امان بحال کرنے کی غرض سے امیر حجاجؒ کی معزولی اور اس کی من پسند تقرری کی شرط تک سامنے رکھ دیتے ہیں لیکن اس سب کے باوجود ابن الاشعث اس پیش کش کو ٹھکراتے ہوئے حکومت کے خلاف لشکر کشی اور بغاوت میں مشغول رہتا ہے۔ ابن الاشعث کی اس خود سری کے بعد خلیفہ عبدالملکؒ اور امیر حجاجؒ کا اس کے خلاف فوجی کارروائی کرنا ناگزیر ہوجاتا ہے۔

گویا ابن الاشعث اور اس کے لشکر کے خلاف حکومتِ بنو امیہ نے اتمام حجت کرنے کے بعد ہی مناسب فوجی کاروائی کی جس کے بعد امیر حجاجؒ اور ابن الاشعث میں کئی معرکہ ہوئے اور آخر کار امیر حجاجؒ کی افواج کو ۸۳ھ میں دیر الجماجم کے معرکہ میں ابن الاشعث کی بغاوت کے خلاف فتح نصیب ہوتی ہے۔ یہ تھی ابن الاشعث کی بغاوت اور اس کی بغاوت کے اصل محرکات جن کو فرو کرنے پر متعصب تذکرہ نویس امیر حجاجؒ کو مطعون کرتے ہیں۔ جب کہ اوپر ہم بدلائل ثابت کر آئے ہیں کہ امیر حجاجؒ، عبدالرحمٰن بن محمد ابن الاشعث اور اس کے لشکریوں کے خلاف کیے گئے اپنے اس تادیبی اقدام میں صد فیصد صائب الرائے تھے۔ امید ہے کہ جو شخص بھی ان تمام وقائع پر غیر جانبدار ہوکر نظر کرے گا وہ ہماری پیش کردہ توضیحات سے متفق ہوئے بنا نہ رہ سکے گا۔ اس واقعہ سے متعلق قارئین مزید مفصل کلام کتاب ہٰذا میں آگے

۱۔ البدایہ والنہایہ جلد ۹ صفحہ ۴۲۔

جا کر مفکر اسلام علامہ اسحٰق صدیقی سندیلوی مرحوم کے قلم سے ملاحظہ فرمائیں گے جنھوں نے اس بابت نہایت مفصل و مدلل کلام کیا ہے اور اس متعلق وہی موٴقف پیش کیا ہے جو ہم اوپر پیش کرآئے ہیں، تاہم علامہ اسحٰق صدیقی سندیلوی مرحوم نے اس سلسلے میں دلائل کا ایک انبار لگا دیا ہے جس سے ان کا پیش کردہ مقدمہ مضبوط تر ہوجاتا ہے۔ امید ہے کہ علامہ اسحٰق صدیقی سندیلوی کی پیش کردہ معروضات کے بعد قارئین کی اس موضوع سے متعلق مکمل تشفی ہوجائے گی۔

امام سعید بن جبیرؒ کا معاملہ:

امیر حجاج بن یوسف ثقفیؒ کو سب سے زیادہ بدنام سعید بن جبیرؒ کے قتل کے سلسلے میں کیا جاتا ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ الزام لگانے سے پہلے کوئی عالم، کوئی قاری ،کوئی موٴرخ ان اسباب و حالات کی طرف التفات کرنا گوارا ہی نہیں کرتا جس کی بناء پر امیر حجاجؒ کو سعید بن جبیرؒ کے خلاف یہ اقدام کرنا پڑا تھا۔ کتب تاریخ و سیر کا مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ امیر حجاجؒ کی نظروں میں سعید بن جبیرؒ کا مقام بہت بلند تھا اور انھوں نے ہمیشہ ان کی کافی اکرام وعزت کی۔ یہ امیر حجاج ہی تھے جنھوں نے سعید بن جبیرؒ کو کوفہ آمد پر وہاں کا عہدۂ قضاء سونپ دیا تھا۔ امیر حجاجؒ کے اس اقدام پر عوام معترض ہوئے کہ قاضی کو عربی النسل ہونا چاہیے جبکہ سعید بن جبیرؒ موالی ہیں۔ اس پر امیر حجاجؒ نے بحالت مجبوری سعید بن جبیرؒ کو عہدۂ قضاء سے معزول کر کے ابوبردہ بن ابو موسیٰ اشعریؒ کو قاضی بنادیا لیکن ساتھ ہی ابو بردہؒ کو خاص ہدایت کردی کہ سعید بن جبیرؒ کے مشورے کے بغیر کوئی فیصلہ نہ کریں(طبقات ابن سعد، طبری والبدایہ و النہایہ وغیرہ)۔ الغرض سعید بن جبیرؒ کو کسی عاملِ بنی امیہ نے اتنا نہیں نوازا جتنا امیر حجاجؒ نے ان پر نوازشات کیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ ابن الاشعث کی ناکامی کے بعد جب سعید بن جبیرؒ روپوش ہوگئے تو امیر حجاجؒ نے جان بوجھ کر ان کو

ڈھونڈنے میں تساہل برتا اور ان کے خلاف کسی انتقامی یا قانونی کاروائی سے حتیٰ الامکان گریز کیا۔ ابن الاشعث کی شکست کے بعد سعید بن جبیرؒ اصبہان چلے گئے، وہاں سے کچھ عرصہ بعد آذر بائیجان منتقل ہوگئے اور پھر آخر میں عمرہ کرنے کی غرض سے مکّہ آئے تو یہی کے ہورہے۔ سعید بن جبیرؒ کی مکّہ آمد کے متعلق امیر حجاجؒ کو معلوم تھا لیکن پھر بھی انھوں نے سعید بن جبیرؒ سے کوئی تعارض نہ کیا۔ سعیدؒ کی مکّہ آمد کے کچھ عرصہ بعد امیر ولید بن عبدالملکؒ نے خالد بن عبداللہ القسری کو مکّہ کا گورنر بنا کر بھیجا اور خالد کو ہدایت کی کہ مکّہ میں جو شخص بھی ایسا موجود ہو جس نے حکومت کے خلاف کسی بغاوت میں حصّہ لیا ہو تو اسے گرفتار کرکے اس کے خلاف کاروائی کی جائے۔ طبری لکھتے ہیں کہ اس حکم کی تعمیل میں خالد نے عطاءؒ، سعید بن جبیرؒ، مجاہدؒ، طلق بن حبیبؒ اور عمرو بن دینارؒ کو گرفتار کرلیا، جن میں سے عطاءؒ اور عمرو بن دینارؒ کو بعد میں چھوڑ دیا گیا جبکہ باقیوں کو حجاجؒ کے پاس عراق روانہ کردیا گیا۔ (۱)

جیسا کہ ہم نے پہلے لکھا کہ حجاجؒ کی نظروں میں سعید بن جبیرؒ کافی قدر و منزلت والے تھے، اسی لیے انھوں نے حتیٰ الامکان کوشش کی کہ ابن الاشعث کی بغاوت میں شریک ہونے کے باوجود وہ سعید بن جبیرؒ سے باز پرس ہونے کی نوبت نہ آنے دیں، اسی لیے انھوں نے ابن الاشعث کی شکست کے بعد سعید بن جبیرؒ کو ڈھونڈنے کی کوئی خاص تگ و دو نہ کی، یہاں تک کہ ان کی مکّہ میں موجودگی کو بھی نظر انداز کردیا۔ اس بات کا تذکرہ طبری نے اپنی تاریخ میں صراحت سے کیا ہے۔ طبری لکھتے ہیں:

''جب سعید بن جبیرؒ امیر حجاجؒ کے سامنے لائے گئے تو حجاجؒ نے انھیں دیکھ کر کہا کہ اللہ کی لعنت ہو نصرانیہ کے بیٹے پر، اس سے ان کی مراد خالد بن عبداللہ القسری تھا کیونکہ اس نے سعید بن جبیرؒ کو مکّہ سے

۱۔ طبری، جلد ٦ صفحہ ٤٨٨۔

گرفتار کر کے بھیجا تھا، کیا خود مجھے سعید بن جبیرؒ کی مکّہ میں سکونت کا علم نہ تھا؟ واللہ میں جانتا تھا کہ وہ مکّہ میں ہیں بلکہ جس مکان میں وہ رہتے تھے وہ بھی مجھے معلوم تھا مگر میں جان بوجھ کر ڈھیل دے رہا تھا۔"(۱)

ابن جریر طبری کی اس صراحت سے اس باطل الزام کی قطعی نفی ہوجاتی ہے جو کہ امیر حجاجؒ پر لگایا جاتا ہے کہ وہ سعید بن جبیرؒ کے قتل کے درپے تھے اور آخر کار انھوں نے سعیدؒ کو قتل کر کے چھوڑا۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ سعید بن جبیرؒ کے اپنے دربار میں پیش ہوجانے کے بعد بھی امیر حجاجؒ چاہتے تھے کہ سعیدؒ اپنے مؤقف سے رجوع کر کے ندامت کا اظہار کرلیں تاکہ وہ سعیدؒ کے ساتھ بھی اسی عفوو درگزر کا مظاہرہ کرسکیں جو انھوں نے امام شعبیؒ کے ساتھ کیا تھا کہ امام شعبیؒ نے جب ایک دن اچانک حجاجؒ کے دربار میں حاضر ہوکر ان سے اپنے خروج کی معافی مانگی تو حجاجؒ نے کمالِ عفو و درگزر کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کو معاف کردیا اور پوری عزت و اکرام کے ساتھ ان کو اپنے دربار سے رخصت کیا۔ قارئین اس واقعہ کی تفصیل ان شاءاللہ کتاب میں آگے ملاحظہ کریں گے۔ الغرض اسی لیے امیر حجاجؒ نے سعید بن جبیرؒ کے خلاف فی الفوز کوئی قدم اٹھانے سے سے پہلے ان سے ان کے حکومت مخالف اس عمل کی توضیح طلب کی۔ جس پر سعیدؒ نے کہا:

فقال: أصلح الله الأمير! إنما أنا امرؤ من المسلمين يخطي مرة ويصيب مرة۔ (۲)

"اللہ امیر کی اصلاح فرمائے! میں بھی عام مسلمانوں میں سے ایک مسلمان ہوں، کبھی مجھ سے بھی خطا ہوجاتی ہے اور کبھی میں صحیح راستہ پر چلتا ہوں۔"

طبری لکھتے ہیں:

۱۔ طبری، جلد ۶ صفحہ ۴۹۰۔ ۲۔ طبری، جلد ۶ صفحہ ۴۹۰۔

طابت نفس الحجاج، وتطلق وجههُ، ورجا أن يتخلص من أمره۔[1]

''اس جواب سے امیر حجاجؒ اتنا خوش ہوئے کہ ان کا چہرہ بشاش ہوگیا اور لوگوں کو امید بندھی کہ وہ سعید بن جبیرؒ سے درگزر سے کام لیں گے۔''

لیکن جب سعید بن جبیرؒ نے اقرار کیا کہ انھوں نے ابن الاشعث کی بغاوت میں اس کا ساتھ دیا اور امیر المومنین عبدالملک بن مروانؒ کی بیعت گلے میں ہوتے ہوئے بھی ابن الاشعث سے بیعت کی تو ازروئے شریعت اسلامیہ ان پر باغی کے احکام لاگو کرتے ہوئے امیر حجاجؒ نے ان کے قتل کا حکم دیا۔ امام ابن کثیرؒ اور طبری دونوں اس واقعہ کی تقریباً ایک ہی طرح کی تفصیل لکھتے ہیں:

''سعید بن جبیرؒ کو جب حجاجؒ کے سامنے لایا گیا تو حجاجؒ نے انھیں مخاطب کرکے استفسار کیا کہ کیا میں نے آپ کو حکومت میں شامل نہیں کیا تھا؟ کیا میں نے آپ کو عہدہ نہیں دیا تھا؟ کیا میں نے آپ پر فلاں فلاں احسان نہیں کیا تھا؟ سعید بن جبیرؒ نے حجاجؒ کے تمام سوالات کے جوابات اثبات میں دیئے۔ اس پر حجاجؒ اس قدر خوش ہوئے کہ ان کا چہرہ بشاشت سے پھول گیا اور لوگوں کو گمان ہوا کہ حجاجؒ سعید بن جبیرؒ کو معاف کر دیں گے۔ پھر حجاجؒ نے سعید بن جبیرؒ سے دوبارہ پوچھا کہ آخر کس چیز نے آپ کو امیر المومنین کی بیعت توڑنے پر آمادہ کیا۔ سعید بن جبیرؒ نے کہا کہ ابن الاشعث کی بیعت کا طوق میرے گلے میں پڑا ہوا تھا، اس لیے میں ان کا ساتھ دینے پر مجبور تھا۔ سعیدؒ کی بات سن کر حجاجؒ سخت غصہ ہوئے اور ان کا سانس پھول گیا۔ حتیٰ کہ ان کی چادر کا

۱۔ طبری، جلد ۶، صفحہ ۴۹۰۔

ایک کنارہ کندھے سے گر گیا اور انھوں نے سعید بن جبیرؒ سے غصہ میں کہا کہ مکہ آمد کے موقع پر ابن زبیرؓ کے مقتول ہوجانے کے بعد کیا میں نے آپ سے امیر المومنین (عبدالملک بن مروانؒ) کی بیعت نہیں لی تھی؟ اور کیا آپ نے بیعت نہیں کی تھی؟ پھر جب میں والی بن کر عراق آیا تو کیا وہاں میں نے آپ سے امیرالمومنین کی بیعت کی تجدید نہیں کروائی تھی؟ سعید بن جبیرؒ نے ان تمام باتوں کا جواب بھی اثبات میں دیا۔ اس پر حجاجؒ ان پر سخت ناراض ہوئے اور کہا ہلاک ہوں آپ۔ آپ نے امیر المومنین کی دو مرتبہ کی ہوئی بیعت توڑ کر جولاہے کے بیٹے جولاہے کی بیعت کی۔ آپ نے امیر المومنین عبدالملکؒ کی کی ہوئی دو بیعتوں کو پس پشت ڈال دیا اور اس جولاہے کے بیٹے کی بیعت کا اس قدر احترام کیا۔ اس کے بعد حجاجؒ نے سعید بن جبیرؒ کے قتل کا حکم دیا چنانچہ ان کو قتل کردیا گیا۔"(۱)

علامہ ابن کثیرؒ اور ابن جریر طبری کی پیش کردہ یہ تفصیلات صاف بتاتی ہیں کہ امیر عبدالملک بن مروانؒ کی دو دفعہ بیعت کرنے کے بعد اس کو توڑ کر ابن الاشعث کی بغاوت میں اس کا ساتھ دینے کے جرم میں امیر حجاجؒ نے سعید بن جبیرؒ کو قتل کیا تھا اور اس جرم کا اقرار حراست میں لیے جانے کے بعد سعید بن جبیرؒ نے خود کیا تھا، پھر امیر حجاجؒ پر ظلم کا الزام کیسا۔ ہمیں تو سخت حیرت ہوتی ہے کہ جو صاحبِ علم بھی اسلام کے قانونِ فوجداری سے واقف ہو وہ کس طور سے امیر حجاج بن یوسفؒ کے اس اقدام کو غلط ٹھہراسکتا ہے۔ کیا اسلام میں باغی کی سزا اس بات پر موقوف ہے کہ بغاوت کرنے والا یا باغیوں کا ساتھ دینے والا کوئی عامی ہے یا عالم۔ اگر وہ عامی یا کوئی غیر علمی شخصیت ہے تو اس کی سزا موت اور اگر وہ کوئی عالم ہے تو اس کا اکرام ہونا

۱۔ البدایہ والنہایہ، جلد ۹، صفحہ ۱۰۲۔ طبری، جلد ۶، صفحہ ۴۹۰۔

چاہیئے۔ فیا للعجب۔ اسلام میں اصول و قوانین سب کے لیے برابر ہیں اور حدیث رسول ﷺ کے تحت بیعت کرکے توڑ دینے والا باغی اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے بغاوت کا مرتکب ہوتا ہے، چاہے وہ کوئی بھی ہو۔ المختصر امیر حجاج بن یوسفؒ کا یہ قدم قطعی لائق مذمت یا غلط نہ تھا کہ جس کی سبائی مؤرخین کی اتباع اور پروپیگنڈے کے زیر اثر اس قدر تشہیر کی جاتی ہے۔

الغرض اوپر کے مباحث سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ ابن الاشعث کی حیثیت تو واضح طور پر ایک بھگوڑے باغی کی تھی جس نے علی الاعلان خلیفۂ وقت سے بغاوت کرکے دشمنوں سے مدد طلب کی جبکہ سعید بن جبیرؒ چونکہ پہلے عبدالملک بن مروانؒ کی بیعت کرچکے تھے جس کو بعد میں ابن الاشعث کے ورغلانے پر توڑ کر وہ اس کے ہمنوا ہوگئے تو امیر حجاجؒ کے نزدیک ان کی حیثیت ازروئے شریعتِ اسلامیہ باغی کی تھی، جن سے اس وقت تک قتال جائز تھا جب تک وہ تائب نہ ہوجائیں یا پھر مقتول۔ سعید بن جبیرؒ اور ابن الاشعث کی بغاوت سے متعلق آگے کتاب میں ہم علامہ اسحٰق صدیقی سندیلوی کی کتاب ''اظہار حقیقت جلد سوم'' سے تفاصیل نقل کررہے ہیں، ان شاءاللہ ان کے مطالعہ سے قارئین پر یہ مزید واضح ہوجائے گا کہ ابن الاشعث و سعید بن جبیرؒ سے متعلق امیر حجاج بن یوسفؒ کا موقف ہی صائب تھا اور اس بابت ان پر کسی قسم کی ملامت عائد نہیں ہوتی۔ جبکہ سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ، امیر عبدالملک بن مروانؒ اور امیر حجاجؒ کا معاملہ اجتہادی تھا جس پر عنداللہ یہ تینوں اشخاص ماجور ہیں۔

امیر حجاج بن یوسف ثقفی کی بابت علماء کے اقوال و آراء:

عموماً امیر حجاج بن یوسفؒ کی بابت تصویر کا صرف ایک ہی رخ دکھایا جاتا ہے اور سیاسی مناقشات کی بناء پر بعض علماء کی جو مذمتی آراء حجاجؒ کے خلاف قائم ہوگئی تھیں، صرف انھیں کی تشہیر کی جاتی ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کئی آراء

صرف سبائی پروپیگنڈہ کے زیر اثر تھیں جبکہ کئی سے علماء بعد میں رجوع کر چکے تھے اور کئی ایسی تھیں جن کا تعلق محض سیاسی پالیسیوں سے تھا جن کو بڑھا چڑھا کر آج پیش کیا جاتا ہے۔ علماء نے حجاج مرحوم کی منقبت میں جو کچھ نقل کیا، فی زمانہ اس کو پیش کرنے کی جرأت عموماً اہل علم نہیں کرتے۔ اس کے پیچھے کیا وجہ ہے، ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں۔ سر دست ہم علماء کے وہ اقوال اور امیر حجاجؒ کے وہ حالاتِ زندگی قارئین کے سامنے لانا چاہیں گے جن سے امیر حجاجؒ کی شخصیت کی ایک مختلف صورت سامنے آتی ہے۔

ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ حجاجؒ کافی فصیح و بلیغ تھے اور قرآن کے حافظ تھے۔ ہر شب ایک قرآن پاک ختم کرتے تھے۔ ابو عمرو بن علاءؒ کا قول ہے کہ میں نے حجاجؒ اور حسن بصریؒ سے زیادہ فصیح و بلیغ کوئی نہیں دیکھا، تاہم حسن بصریؒ ،حجاجؒ سے زیادہ فصیح تھے۔ دارقطنی نے عقبہ بن عمرو کا قول نقل کیا ہے کہ میں نے تمام لوگوں کی عقلیں ملتی جلتی پائیں لیکن حجاجؒ اور ایاس بن معاویہؒ کا معاملہ سب سے الگ ہے، ان لوگوں کو عقل کے اعتبار سے تمام لوگوں پر فوقیت حاصل ہے۔(۱) امیر حجاجؒ نے ایک روز نفس کی بابت اس طور کا پُر اثر اور رقت آمیز خطبہ دیا کہ مالک بن دینارؒ سن کر رو پڑے۔(۲)

امام شعبیؒ کہتے ہیں کہ میں نے جس بہترین انداز پر حجاجؒ کو گفتگو کرتے سنا، اس انداز پر کسی کی گفتگو نہیں سنی جیسا کہ حجاجؒ نے کہا کہ اللہ نے دنیا کو فنا کرنے اور آخرت کو باقی رکھنے کے لیے پیدا کیا ،جس کے لیے فنا ہے، اس کے لیے بقا نہیں، جس کے لیے بقا ہے اس کے لیے فنا نہیں۔ یہ دنیا تمھیں غائب (یعنی آخرت) سے

۱۔ البدایہ والنہایہ، جلد ۹ صفحہ ۱۱۶۔

۲۔ البدایہ والنہایہ، جلد ۹ صفحہ ۱۱۸۔

دھوکے میں نہ ڈالے، لمبی لمبی امیدوں کو موت کی یاد کے ذریعے ختم کرو۔ (۱)

عمر بن شیبہؒ اپنے مشائخ سے روایت کرتے ہیں کہ امیر عبدالملک بن مروانؒ نے حجاجؒ کو خط لکھا، جس میں ان کو بے جا اسراف اور سختی پر تنبیہ کی اور لکھا کہ مال تو حقیقتاً اللہ کا ہے اور ہم محض اس کے خزانچی ہیں۔ حجاجؒ نے اس خط کے جواب میں امیر عبدالملک بن مروانؒ کو لکھا کہ مجھے آپ کا خط ملا جس میں بے جا اسراف اور سختی پر تنبیہ کی گئی ہے۔ اللہ کی قسم! میں نے کبھی اہل معصیت کی سزا میں مبالغہ نہیں کیا اور نہ کبھی اہل اطاعت کی خدمت میں کوئی کمی کی، اگر اسی کا نام اسراف ہے تو امیر المومنین مجھ پر حد جاری کر سکتے ہیں۔ اس پر عبدالملکؒ نے انھیں لکھا کہ جیسے مناسب سمجھو عمل کرتے رہو۔ (۲)

زبیر کہتے ہیں کہ میں نے ایک روز ابو وائلؒ کے سامنے حجاجؒ کو برا بھلا کہا۔ انھوں نے کہا کہ اسے برا بھلا مت کہو۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اللہ سے رحم کی درخواست کرے تو اللہ اس پر رحم فرمائے۔ (۳)

امیر حجاجؒ کی بابت ہم تصریح کر آئے ہیں کہ وہ نہایت فصیح و بلیغ تھے۔ اس فصاحت و بلاغت کے ساتھ ساتھ خیالات کی ندرت اور تقویٰ وخشیت الٰہی بھی ان میں بدرجۂ اتم موجود تھی، انھی خوبیوں کی وجہ سے ان کے کئی خطبات کو علامہ ابن کثیرؒ نے اپنی کتاب میں درج کیا ہے۔ انھیں خطبات میں سے ایک خطبہ ہم یہاں نقل کر رہے ہیں، جس سے امیر حجاجؒ کے تقویٰ اور خشیت الٰہی کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

علامہ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں :

اصمعیؒ کا قول ہے کہ حجاجؒ کی بیماری میں لوگوں کو ان کی موت کا خیال پیدا ہو گیا۔ حجاجؒ کو اس بابت پتہ چلا تو وہ منبر پر چڑھے اور خطبہ دیا کہ:

۱۔ البدایہ والنہایہ، جلد ۹ صفحہ ۱۱۸۔ ۲۔ البدایہ والنہایہ، جلد ۹ صفحہ ۱۲۱۔

۳۔ البدایہ والنہایہ، جلد ۹ صفحہ ۱۲۵۔

''لوگ شیطان کے دھوکے میں آئے ہوئے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ حجاجؒ مرگیا یا مرنے والا ہے۔ کیا وہ میری بات کے بعد خیر کی توقع رکھتے ہیں۔ اللہ کی قسم! دنیاوی زندگی اور اس کا مال و متاع مجھے محبوب نہیں ہے۔ میں نے اللہ سے زندگی کی دعا ان لوگوں کو درست کرنے کے لیے کی ہے جن پر اس شیطان کا داؤ چل گیا ہے، جسے اللہ نے قیامت تک مہلت دے رکھی ہے۔ ایک مردِ صالح (یعنی سلیمانؑ) نے اللہ سے دعا کی تھی کہ اے اللہ! مجھے ایسی حکومت عطا کر جو میرے بعد کسی کو نہ ملے چنانچہ اللہ نے ان کو حکومت عطا کردی لیکن دنیا کو بقاء نہیں۔ اس لیے جب ان کا کام مکمل ہوگیا تو اللہ نے ان کو اپنے پاس بلا لیا اور انھوں نے خود بھی دعا کی کہ اے باری تعالیٰ ! مجھے ایمان کی حالت میں موت دے اور مجھے اپنے نیک بندوں میں شامل فرما۔ پس کیا بعید ہے کہ تم میں سے ہر شخص ایسا بن جائے۔ ہر انسان کو دنیا سے جانا ہے۔ ہر تر شے کو خشک ہونا ہے۔ موت کے بعد انسان کو کفنا کر تین گز زمین میں دفن کردیا جائے گا پھر زمین اس کے گوشت پوست کو کھالے گی۔ خبیث شخص دنیا میں مال کے علاوہ کوئی دوسری چیز چھوڑ کر نہیں جاتا جس میں اس کی خبیث اولاد نزاع کرتی ہے۔ جو لوگ ذی شعور ہیں، ان کو میری بات سمجھ میں آگئی ہوگی۔''

اس کے بعد امیر حجاجؒ منبر سے نیچے اتر آئے۔[1]

مغیرہ بن مسلمؒ اپنے والد کا قول نقل کرتے ہیں کہ حجاجؒ نے ہمیں خطبہ دیتے ہوئے قبر کے بارے میں کہا کہ وہ تنہائی اور غربت کا گھر ہے، یہ بات وہ مسلسل کہتے

ا۔ البدایہ والنہایہ، جلد ۹، صفحہ ۱۲۶۔

رہے حتیٰ کہ خود رو پڑے۔[1]

عمر بن عبدالعزیزؒ کہتے ہیں کہ میں نے حجاجؒ کی کسی چیز پر حسد نہیں کیا، مگر ان کی قرآن سے محبت، علم اور اہل علم پر خرچ کرنے اور وفات کے وقت ان کے الفاظ پر:

اللھم اغفرفانھم یزعمون انك لا تفعل

یعنی اے اللہ! میری مغفرت فرما، لوگوں کا خیال ہے کہ آپ ایسا نہیں کریں گے۔

محمد بن منکدر کا قول ہے کہ عمر بن عبدالعزیز حجاجؒ سے خوش نہیں تھے لیکن حجاجؒ نے جو دعا موت کے وقت کی تھی، اسے بار بار دہراتے تھے۔ اصمعیؒ کہتے ہیں کہ حجاجؒ نے موت کے وقت یہ اشعار کہے تھے:

؎ اے میرے رب! میرے دشمنوں نے قسمیں اٹھائی ہیں کہ میں جہنمی ہوں

؎ کیا وہ اپنی رعونت اور جہالت پر قسمیں اٹھاتے ہیں، شاید ان کو اللہ کی غفاری اور عفو عظیم کا یقین نہیں

علامہ ابن کثیر اپنی تاریخ البدایہ و النہایہ کی جلد ۹ میں فصل: فیمارو ی عنه الكلمات النافعة والجراءة البالغة میں امیر حجاجؒ سے متعلق مختلف اقوال لائے ہیں جن کی اکثریت امیر حجاجؒ کی مذمت و تنقیص پر مبنی ہے تاہم محسوس ہوتا ہے کہ علامہ ابن کثیرؒ کے خود کے نزدیک بھی یہ اقوال کوئی خاص قابل اعتبار نہیں تھے، اسی لیے یہ مبنی بر تنقیص اقوال نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''حجاجؒ کے بارے میں بعض روایات ایسی بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شرابی و بدافعال نہیں تھا۔ قرآن کی کثرت سے تلاوت کرتا تھا۔ محارم سے اجتناب کرتا تھا۔ جہاد کا دلدادہ تھا۔ اس کے زمانے میں فتوحات کا دائرہ دور دور تک وسیع ہوتا چلا گیا۔ اہل قرآن پر دل کھول

۱۔ البدایہ و النہایہ، جلد ۹، صفحہ ۱۱۴۔

کر خرچ کرتا تھا۔ وفات کے وقت اس نے جو ترکہ چھوڑا وہ کُل تین سو درہم تھا۔(۱)

حماد بن ابی سلیمانؒ کہتے ہیں کہ حجاجؒ نے وفات کے وقت تین سو درہم، ایک قرآن، ایک تلوار، ایک زین، ایک رحل اور ایک سو زرہیں چھوڑی تھیں۔(۲)

سبحان اللہ! یہ ہے اس مردِ مومن اور مجاہد کی کُل جمع پونجی جس کے زیرِ اقتدار پورا عراق تھا اور جس کی بھیجی گئیں افواج ہندوستان، ماوراء النہر اور ہسپانیہ میں اسلام کے جھنڈے گاڑ کر مالِ غنیمت سے لدی پھندی واپس آتی تھیں۔ یار لوگوں کو شرم نہیں آتی کہ بلا تحقیق آنکھیں بند کرکے ایسے جلیل القدر مجاہدِ کبیر کے بارے میں واہی تاریخیں روایتیں نقل کرتے ہیں اور انھیں روایتوں کے زیر اثر امیر حجاجؒ جیسے عظیم بطلِ جلیل کو مطعون و مبغوض ٹھہراتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس عظیم مجاہد و گورنر کی جیسی قدر ہونی چاہیے تھی، ہم مسلمانوں نے اس کی ویسی قدر کی ہی نہیں۔

اہل علم کے ساتھ امیر حجاجؒ کا حسن سلوک اور ادب و احترام:

مسخ شدہ تاریخی روایات سے عموماً یہ تاثر دینے کی کوشش کی جاتی ہے کہ امیر حجاج بن یوسفؒ عوام تو عوام اہل علم اور علماء کے اوپر بھی بے جا سختی کرتے تھے اور معمولی سے اختلاف پر ان کی گردنیں اتروادیتے تھے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ امیر حجاجؒ کے خلاف محض ایک پروپیگنڈہ اور بہتان ہے۔ صحیح تاریخی روایات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ امیر حجاج بن یوسفؒ میں علماء کے لیے از حد احترام پایا جاتا تھا اور وہ اکثر اہل علم کو اعزاز و اکرام سے نوازا کرتے تھے اور ان کی خطاؤں یا حکومت مخالف کاروائیوں پر ان کے تائب ہوجانے کے بعد عفو و درگزر سے کام لیتے تھے۔ اس سلسلے میں ہم تاریخ کے صفحات سے چند روایات قارئین کے سامنے رکھنا چاہیں گے۔

۱۔ البدایہ و النہایہ، جلد ۹ ،صفحہ ۱۲۳۔ ۲۔ البدایہ و النہایہ، جلد ۹ ،صفحہ ۱۲۶۔

امام شعبیؒ اور امیر حجاجؒ:

امام عامر بن شراحیل الشعبیؒ ان چند جلیل القدر علماء میں سے ہیں جنھوں نے امیر عبدالملک بن مروانؒ کے خلاف بغاوت میں ابن الاشعث کا ساتھ دیا اور حجاجؒ کی مخالفت کی۔ یہی وجہ ہے کہ امیر حجاج بن یوسفؒ کی بابت جو چند مذمتی بیانات نقل کیے جاتے ہیں ان میں سب سے مشہور امام عامر بن شراحیل الشعبیؒ کا قول ہے جس کو علامہ ابن کثیرؒ نقل کرتے ہیں:

ابن عساکرؒ نے شعبیؒ کے حوالے سے روایت کیا ہے کہ وہ کہتے تھے
کہ حجاجؒ جبت وطاغوت پر ایمان رکھتا ہے اور اللہ کا منکر ہے۔ (۱)

ہمارا نہیں خیال کہ امام شعبیؒ جیسا عالم و فقیہ و محدث لاکھ اختلاف کے باوجود حجاجؒ کے خلاف ایسی لغو بات کرسکتے ہیں۔ یہ بات تو خود امام شعبیؒ کی عدالت کو ساقط کرنے کو کافی ہوسکتی ہے کہ وہ ایک کلمہ گو کو بلا دلیل منکرِ خدا قرار دے رہے ہیں جبکہ سیدنا عبداللہ بن عمرؓ اور اس وقت حیات صحابہ رضوان اللہ اجمعین حجاج کی اقتداء میں صلوات ادا کرتے رہے ہیں۔ طاغوت پر ایمان لانے والے اور اللہ کے ساتھ کفر کرنے والے کی اقتداء میں صحابہ کا صلوٰۃ ادا کرنا۔ فیا للعجب۔ صحابہ کا یہی ایک طرزِ عمل حجاجؒ کے کافر ہونا تو دور کی بات ان کے فاسق و فاجر ہونے کے اتہامات پر بھی سوال کھڑا کردیتا ہے۔ پھر خود اپنی اسی کتاب میں چند سطریں قبل ہم امام شعبیؒ کے حوالے سے حجاج کی مدحت نقل کرآئے ہیں جہاں وہ حجاجؒ کے حسنِ کلام کی پذیرائی فرماتے نظر آتے ہیں۔

تاہم اگر اس قول کی نسبت امام شعبیؒ سے متعلق درست بھی ہے تو ہمارا خیال ہے کہ ان کا یہ قول اس زمانے کا ہے جبکہ وہ ابن الاشعث کی بغاوت میں حجاجؒ کے

۱۔ (البدایہ و النہایہ، جلد ۹ ،صفحہ ۱۲۵۔

خلاف نکلے تھے اور بہت ممکن ہے کہ اس وقت کے سیاسی جذبات کی رو میں بہہ کر ابن الاشعث کے ورغلانے پر ان کے منہ سے ایسے الفاظ نکل گئے ہوں۔ البتہ بعد کے وقائع سے پتہ چلتا ہے کہ حجاجؒ کی بابت امام شعبیؒ نے اپنے ایسے ہر مذمتی قول سے رجوع کرلیا تھا اور وہ حجاجؒ کے حسن سلوک کے معترف ہو گئے تھے۔ علامہ ابن سعدؒ لکھتے ہیں:

قال محمد بن سعد قال أصحابنا وكان الشعبي فيمن خرج مع القراء على الحجاج وشهد دير الجماجم وكان فيمن أفلت فاختفى زمانا وكان يكتب إلى يزيد بن أبي مسلم أن يكلم فيه الحجاج فأرسل إليه إني والله ما أجترىء على ذلك ولكن تحين جلوسه للعامة ثم ادخل عليه حتى تمثل بين يديه وتتكلم بعذرك وأقر بذنبك واستشهدني على ما أحببت أشهد لك قال ففعل الشعبي فلم يشعر الحجاج إلا وهو قائم بين يديه قال له الشعبي قال نعم أصلح الله الأمير قال ألم أقدم البلد وعطاؤك كذا وكذا فزدتك في عطائك ولا يزاد مثلك قال بلى أصلح الله الأمير قال ألم آمر أن تؤم قومك ولا يؤم مثلك قال بلى أصلح الله الأمير قال ألم أعرفك على قومك ولا يعرف مثلك قال بلى أصلح الله الأمير قال ألم أوفدك على أمير المؤمنين ولا يوفد مثلك قال بلى أصلح الله الأمير قال فما أخرجك مع عدو الرحمن قال أصلح الله الأمير خبطتنا فتنة فما كنا فيها بأبرار أتقياء ولا فجار أقوياء وقد كتبت إلى يزيد بن أبي مسلم أعلمه ندامتي على ما فرط مني ومعرفتي بالحق الذي خرجت منه وسألته أن يخبر بذلك

الأمیر و یأخذ لی منه أمانا فلم یفعل فالتفت الحجاج إلی یزید فقال أ کذلك یا یزید قال نعم أصلح الله الأمیر قال فما منعك أن تخبرنی بکتابه قال الشغل الذی کان فیه الأمیر فقال الحجاج أولا انصرف فانصرف الشعبی إلی منزله آمنا۔ (۱)

محمد بن سعدؒ کہتے ہیں کہ ہمارے اصحاب نے بیان کیا کہ امام شعبیؒ ان میں سے تھے جو قراء کی جماعت کے ساتھ حجاج کے خلاف نکلے تھے اور دیر الجماجم کے معرکہ کے بعد عرصہ تک روپوش رہے۔ اور انھوں نے یزید بن ابی مسلم کو خط لکھا کہ تم حجاجؒ سے میری صلح کروا دو۔ انھوں نے جواب میں لکھا کہ واللہ مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ ان کے پاس خود چلے جائیں اور جب وہ دربار عام کریں تو دفعتاً ان کے سامنے کھڑے ہوکر اپنا عذر سامنے رکھ کر اپنی غلطیوں کا اعتراف کرلیں۔ میں اس بات کا وعدہ کرتا ہوں کہ آپ مجھے اپنی بات کا گواہ بنائیں گے تو میں اس بارے میں آپ کی گواہی اور صفائی بیان کردونگا۔ امام شعبیؒ نے اس مشورے پر عمل کیا اور ایک دن دفعتاً حجاجؒ کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ انھوں نے آپ کو دیکھ کر کہا کہ اچھا آپ شعبیؒ ہیں، انھوں نے کہا اللہ امیر کی اصلاح فرمائے ،جی میں ہی شعبی ہوں۔ پھر حجاجؒ نے ان کے سامنے اپنے انعامات و احسانات بیان کیے، آپ نے ہر ہر انعام و احسان کا اعتراف کیا۔ حجاجؒ نے کہا میں نے آپ کو جو مرتبہ و اعزاز بخشا اور کسی کو نہیں بخشا۔ (شعبیؒ نے) کہا بے شک ایسا ہی ہے، اللہ آپ کی اصلاح فرمائے امیر۔ (حجاجؒ نے) کہا میں نے

۱۔ طبقات ابن سعد، جلد ۸ ،تحت الترجمۃ عامر بن شراحیل الشعبی، صفحہ ۳۶۸۔

آپ کو بڑے بڑے عہدوں پر مامور کیا، آپ کو آگے سے آگے بڑھایا۔ (شعبیؒ نے) کہا بیشک صحیح کہا آپ نے ، اللہ آپ کی اصلاح فرمائے امیر۔ پھر حجاجؒ نے کیا کہ میں نے آپ کے وظیفے میں اضافہ کیا اور آپ کی مانند کسی اور کو یہ انعام و اکرام نہیں دیا، آپ کو اپنی قوم کا امام و سردار بنایا اور کسی اور یہ اعزاز نہ بخشا، آپ کو آپ کے قبیلے کا عریف بنایا اور میں نے سرکاری وفود میں ہمیشہ امیر المومنینؒ کے پاس آپ کو بھیجا، (اسی طرح) ایک مرتبہ رتبیل والیٔ سجستان کے پاس وفد بنا کر بھیجا جہاں آپ کو انعام و اکرام ملا۔ الغرض حجاجؒ اپنے احسانات گنواتے جاتے اور امام شعبیؒ اقرار کرتے جاتے تھے۔ آخر میں حجاجؒ نے پوچھا کہ پھر آپ نے عدو الرحمٰن (یعنی عبدالرحمٰن) بن اشعث کا ساتھ کیوں دیا۔ اس پر امام شعبیؒ نے اپنی غلطی کا اعتراف کرکے ندامت کا اظہار کیا، جس پر حجاجؒ نے آپ کی خطاؤں کو معاف کردیا۔ امام شعبیؒ نے فرمایا کہ یہ خطائیں میرے لیے فتنہ تھیں، ہم نے ابن الاشعث کے ساتھ نیک اور متقی لوگوں کو نہیں پایا، وہ چند شریر لوگ تھے جو آپ سے قوی نہ تھے۔ میں نے یہ سب باتیں یزید بن ابی مسلم کو لکھ دی تھیں۔ میں نے ان باتوں پر ندامت کا اظہار کرتے ہوئے لکھ دیا تھا کہ وہ میرے اور آپ کے درمیان صلح صفائی کروادیں، مگر انھوں نے اس کی ہمت و جرأت نہ کی۔ حجاجؒ نے کہا کہ آپ نے مجھے براہ راست کیوں نہ لکھا۔ امام شعبیؒ نے فرمایا کہ کچھ ایسے عذر اور شرمندگی تھی کہ میں آپ کو خط نہ لکھ سکا۔ غرض یہ کہ (اس کے بعد) حجاجؒ اور امام شعبیؒ میں صلح و صفائی ہوگئی اور آپؒ امن و امان کے ساتھ لوٹ گئے۔''

اسی واقعہ کو علامہ ابن خلدون اپنی تاریخ میں بھی لائے ہیں۔ ابن خلدونؒ لکھتے

ہیں کہ امام شعبیؒ امیر حجاجؒ کے دربار میں پیش ہوئے اور انھوں نے اپنی بغاوت کا اقرار کرتے ہوئے حجاجؒ سے کہا:

فإن سطوت فبذنوبنا وإن عفوت فبحلمك والحجة لك علينا. فقال الحجاج: هذا والله أحب الي ممن يقول ما شهدت ولا فعلت وسيفه يقطر من دمائنا. ثم أمنه وانصرف۔[1]

''اگر آپ ہمیں سزا دیتے ہیں تو ہماری خطا کی وجہ سے اور اگر آپ ہمیں معاف کردیتے ہیں تو اپنے حلم و کرم کی وجہ سے اور آپ حق بجانب ہیں۔'' حجاج نے کہا: ''واللہ! یہ شخص مجھے اس سے زیادہ محبوب ہے جو کہتا ہے کہ میں اس معرکہ میں شامل نہ تھا اور نہ میں نے یہ فعل (یعنی خروج) کیا ہے، حالانکہ اس کی تلوار سے ہمارا خون ٹپکتا ہے۔'' اس کے بعد حجاجؒ نے ان کو امان دے دی اور وہ لوٹ آئے۔

علامہ ابن کثیرؒ اس کے بعد مزید لکھتے ہیں:

''شعبیؒ کہتے ہیں کہ اس کے بعد میں وہاں سے نکل کر جانے لگا۔ تھوڑی دور ہی چلا کہ امیر حجاجؒ نے کہا: شعبیؒ واپس آجائیں۔ میں اپنے دل میں ڈرا لیکن پھر مجھے امیر حجاجؒ کے امان دینے والے الفاظ یاد آگئے تو میں مطمئن ہوگیا اور واپس پلٹ آیا۔ امیر حجاجؒ نے مجھ سے پوچھا: ہمارے بعد آپ نے لوگوں کو اپنے ساتھ کیسا پایا شعبیؒ؟ امام شعبیؒ کہتے ہیں کہ (حجاجؒ نے مجھ سے یہ سوال اس لیے پوچھا کہ) خروج سے قبل میری امیر حجاجؒ کے ہاں کافی قدر و منزلت تھی۔ پس میں نے کہا: اللہ امیر کی اصلاح فرمائے! آپ کے بعد میں چین کی نیند نہ سو سکا اور (میرے لیے) نرم زمین پر چلنا پہاڑوں پر چلنے سے زیادہ پُر مشقت ہوگیا اور گھر کا

۱۔ تاریخ ابن خلدون، الجزء الثالث، فصل أخبار ابن الاشعث ومقتله، ص ٦٦۔

صحن بھی میرے لیے غیر محفوظ ہو گیا اور خوف میرے دل میں گھر کر گیا اور پریشانیاں میرے اوپر عام ہو گئیں، پس میں اپنے نیکوکار بھائیوں کی رفاقت سے محروم ہو گیا اور امیر (حجاج) کا نعم البدل نہیں پا سکا۔ اس پر حجاجؒ نے امام شعبیؒ سے کہا کہ آپ تشریف لے جائے اور وہ چلے آئے۔" (۱)

کیا طبقات ابن سعد، تاریخ ابن خلدون اور البدایہ و النہایہ سے پیش کیا گیا اوپر کا یہ پورا قصہ یہ ثابت نہیں کرتا کہ امام شعبیؒ نے اگر کوئی مذمتی بات امیر حجاجؒ کے متعلق کہی بھی تھی تو بعد میں وہ اس سے نہ صرف رجوع کر چکے تھے بلکہ اس بات کے قائل بھی ہو گئے تھے کہ امیر حجاجؒ سے بہتر کوئی امیر ان کو میسّر نہ ہو سکا اور حجاجؒ کا ساتھ ان کے لیے مامون تھا جبکہ ابن الاشعث اور اس کے ساتھی بُرے اور شریر لوگوں میں سے تھے۔ امام شعبیؒ جیسے عالم کے منہ سے ادا کیے ہوئے یہ الفاظ امیر حجاجؒ کی شرافت و نجابت پر شہادت کا درجہ رکھتے ہیں۔ ساتھ ہی اس بات سے یہ بھی اظہر من الشّمس ہو جاتا ہے کہ امیر حجاجؒ نے ابن الاشعث کی بغاوت میں امام شعبیؒ کا ساتھ دینے سے پہلے ان پر اعزاز و اکرام کی بارش کر رکھی تھی، جس کا اقرار خود امام شعبیؒ نے کیا اور پھر کمالِ عفو درگزر کا مظاہرہ کرتے ہوئے حجاجؒ نے امام شعبیؒ کے علمی مرتبہ کا لحاظ کرتے ہوئے ان کو معاف کر دیا۔ جبکہ وہ چاہتے تو بغاوت کے جرم میں امام شعبیؒ کو قتل بھی کروا سکتے تھے لیکن امیر حجاجؒ کا مقصد بے جا خون خرابہ نہیں بلکہ صرف معاشرے کی اصلاح اور بغاوتوں کو فرو کرنا تھا۔ سو جب امام شعبیؒ خود ہی تائب ہو کر امیر حجاجؒ کے دربار میں حاضر ہوئے تو باوجود قدرت رکھنے کے امیر حجاجؒ نے ان کو معاف کر دیا اور ان کی خطاؤں سے درگزر کیا۔ کیا پتہ کہ اگر امام سعید بن جبیرؒ بھی امام شعبیؒ والا طرزِ عمل اختیار کرتے اور اپنے خروج کی صحت پر اصرار نہ کرتے تو امیر حجاجؒ

۱۔ البدایہ و النہایہ، جلد ۹ صفحہ ۴۹-۵۰۔

ان کو بھی معاف فرمادیتے اور ان سے عفو و درگزر سے کام لیتے۔ یہ واقعہ امیر حجاجؒ کے دل میں علماء کے لیے از حد احترام ہونے اور ان کے کمالِ عفو و درگزر پر شاہد ہے اور ایسی تمام واہی روایات کا باطل ہونا ثابت کر دیتا ہے جن میں بیان کیا جاتا ہے کہ امیر حجاجؒ بات بات پر خون کی ندیاں بہادیا کرتے تھے۔

امام ابو وائل شقیق بن سلمہؒ اور امیر حجاج بن یوسفؒ:

ابن سعد کے مطابق امام ابو وائلؒ رویت کے لحاظ سے صحابی البتہ روایت کے لحاظ سے تابعی ہیں۔ طبقات میں آپ کی روایت موجود ہے جہاں آپ کم عمری میں رسول اللہ ﷺ کو دیکھنے کا واقعہ بیان فرماتے ہیں۔ تاہم حدیث رسول ﷺ میں آپ صحابہؓ سے احادیث کی روایت کرتے ہیں۔ امیر حجاج بن یوسفؒ آپ کا نہایت احترام کرتے تھے اور آپ کو حکومت کی طرف سے عامل مقرر کرنا چاہتے تھے۔ علامہ ابن سعد طبقات الکبریٰ میں حدثنا سعيد بن مصور قال حدثنا أبو عوانة قال حدثنا عاصم بن بهدلة عن أبي وائل کی سند سے روایت لائے ہیں کہ امیر حجاجؒ نے آپ کو سلسلہ کے عامل کے ساتھ مقرر کرنا چاہا لیکن آپ نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ :

إن السلسلة لا يصلحها إلا رجال يقومون عليها ويعملون عليها

"اہل سلسلہ کی اصلاح صرف ان لوگوں سے ہوسکتی ہے جو مضبوط ہوں اور ان کی نگرانی کریں۔"

جس پر امیر حجاجؒ نے ان سے فرمایا کہ:

فإنا إن لا نجد غيرك نقحمك وإن نجد غيرك لا نقحمك

ہم نے آپ کے علاوہ کسی اور کو اس کام کے لیے مناسب نہیں پایا،

تاہم اگر ہمیں کوئی اور شخص (اس کام کے لیے) مل گیا تو ہم آپ کو مقرر نہیں کریں گے (یعنی آپ کے عذر کو قبول کرکے آپ کی اس سلسلے میں خدمات نہیں لیں گے)۔

پھر فرمایا:

انطلق یرحمك الله۔[1]

اب آپ جائیے، اللہ آپ پر اپنا رحم کرے۔

طبقات میں جہاں ابن سعد ابو وائلؒ کے حالات میں یہ روایت لائے ہیں، اس کے فوراً بعد وہ ایک اور روایت لائے ہیں جس میں مذکور ہے کہ امام ابو وائلؒ حجاجؒ کے لیے بددعا کرتے ہیں کہ اے اللہ! حجاجؒ کو خاردار درخت کا کھانا کھلا جس سے آدمی نہ موٹا ہو اور نہ اس کی بھوک دور ہو۔ اس سے پہلے کہ میں ہم اس روایت کی سند پر کلام کریں، ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ لوگ کس طور سے اس طرح کی بے سر پیر کی روایات حجاجؒ کی تنقیص میں نقل کردیتے ہیں۔ ایسی روایات حجاجؒ سے زیادہ ہمارے اِن ائمہ کی تنقیص کا شائبہ پیدا کرتی ہیں اور ثابت کرتی ہیں کہ ہمارے ائمۂ حدیث و فقہ ہمہ وقت حکومت کے عمال و گورنروں کو کوسنے اور بددعائیں دینے میں مشغول رہا کرتے تھے اور ان پر تبّرے پڑھا کرتے تھے۔ ساتھ ہی یہ ائمہ معاذاللہ منافقانہ زندگی جیا کرتے تھے کہ امیر حجاجؒ اور دوسرے عمال کے سامنے جب جاتے تو ان کو ''امیر! اللہ آپ کی اصلاح فرمائے'' کہہ کر مخاطب کرتے اور عزت و اکرام سے ان سے بات کرتے، بعض دفعہ ان کی طرف سے دیئے گئے عہدے لے لیتے اور بعض دفعہ احسن طریقے سے معذرت کرلیتے لیکن جیسے ہی ان امراء سے الگ ہوتے تو ان کی پیٹھ پیچھے اپنے اصحاب اور عوام الناس کے مابین ان پر تبّرے پڑھتے اور ان کو بددعائیں دیتے ہیں فیا للعجب۔ اللہ کی قسم! ہم ان جلیل القدر ائمہ کی سیرت کو اس

۱۔ طبقات ابن سعد، جلد ۸، تحت الترجمۃ ابو وائل، صفحہ ۲۱۸۔

طرح کی لغو حرکات سے مبرّا مانتے ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کیونکہ امیر حجاجؒ اور دوسرے عمالِ بنو امیہ کی بابت اس طرح کی بیشتر روایات سنداً ثابت ہی نہیں۔ مذکورہ بالا روایت بھی ابن سعد میں اس سند کے ساتھ مروی ہے:

قال أخبرنا الفضل بن دكين قال حدثنا سفيان عن رجل قال قال أبو وائل اللهم أطعم الحجاج طعاما من ضريع لا يسمن ولا يغني من جوع إن كان أحب إليك قيل له يا أبا وائل أشككت؟ قال إني لم أشك ولكني لم أسيء۔[1]

"سفیان کہتے ہیں کہ ہم سے ایک آدمی نے بیان کیا کہ ابو وائل کہتے تھے کہ اے اللہ! حجاج کو خاردار درخت کا کھانا کھلا جس سے آدمی نہ موٹا ہو اور نہ ہی اس کی بھوک دور ہو، اگر وہ تجھے محبوب ہے، لوگوں نے کہا کہ کیا آپ کو اس کے جہنمی ہونے میں شک ہے، فرمایا شک نہیں لیکن افسوس ہے اور میں اس کے لیے برا نہیں چاہتا۔"

یہ سند ہی سخت ضعیف ہے، اس میں سفیان سے کون سا شخص بیان کررہا ہے اس کی کوئی تصریح نہیں اور محدثین کی اصطلاح میں ایسی سند جس میں کوئی راوی مجہول ہو یا اس کا نام پتہ نہ معلوم ہو، سخت ضعیف اور قابل رد ہوتی ہے۔ سو اس قسم کی ضعیف سند والی روایت کو بنیاد بنا کر حجاجؒ کی بابت غلط باتیں مشہور کرنا انتہائی نازیبا فعل اور غیر علمی عمل ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔ پھر روایات کے آخری الفاظ بھی عجیب ہیں کہ پوچھنے والے لوگ ایک کلمہ گو انسان کے جہنمی ہونے کی بابت اس قدر یقین رکھتے ہیں کہ اس متعلق امام ابو وائلؒ سے استفسار کررہے ہیں اور وہ بھی یقین دلا رہے ہیں کہ نہیں نہیں! میں اس کو جہنمی ہی مانتا ہوں۔ استغفراللہ۔ بھلا گناہ گار سے گناہ گار لیکن عقیدۂ توحید پر جان دینے والے انسان کے متعلق اس طور سے یقینی جہنمی ہونے

۱۔ طبقات ابن سعد، جلد ۸، صفحہ ۲۱۹۔

کی شہادت دینا تو صرف علم الغیب کے جاننے پر ہی منحصر ہے۔ اس کے بغیر تو یہ ممکن ہی نہیں لیکن یہاں مجہول راوی صاحب جو دل چاہے امام ابو وائل کے منہ سے ادا کروا رہے ہیں اور ہمارے تذکرہ نویس بغیر کسی تحقیق کے اس کو آگے نقل در نقل کیے جارہے ہیں۔ درآں حالیکہ اس سے اگلی روایت میں خود امام ابو وائلؒ نے تصریح کردی کہ حجاجؒ کے معاملے میں ان کی وفات کے بعد ہر دوسرے مومن کی طرح خاموش رہنا ہی بہتر ہے:

قال أخبرنا قبيصة بن عقبة قال حدثنا سفيان عن بن عون قال ذهب بي رجل إلى أبي وائل فقال يا أبا وائل أي شيء تشهد على الحجاج؟ قال أتأمرني أن أحكم على الله۔[1]

ابن عون کہتے ہیں کہ کسی شخص نے ابو وائلؒ سے پوچھا کہ آپ کی حجاجؒ کے بارے میں کیا رائے ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ تو یہ چاہتا ہے کہ میں اللہ کے فیصلے کے بارے میں حکم لگاؤں؟ (یعنی اس معاملہ میں خاموش رہنا ہی بہتر ہے)

قارئین دیکھ لیں کہ مذکورہ بالا روایت میں امام ابو وائلؒ نے حجاجؒ مرحوم کی بابت کسی قسم کی غلط رائے دینے سے صاف انکار کردیا جبکہ سائل کے سوال سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس نے سوال ہی خاص کر حجاجؒ سے متعلق کوئی غلط بات سننے کے لیے کیا تھا۔ یہ تھا ہمارے ائمہ دین کا مذہب واخلاق کہ کسی وفات شدہ کلمہ گو کی بابت بددعا کرتے تھے اور نہ ہی اس پر تبّرے پڑھا کرتے تھے۔ وہ اس کا معاملہ اللہ کے سپرد چھوڑ دیتے تھے۔ جیسا کہ علامہ ابن کثیرؒ انھیں ابو وائلؒ کا ایک اور قول امیر حجاجؒ کی بابت لکھتے ہیں:

زبیر کہتے ہیں کہ میں نے ایک روز ابو وائلؒ کے سامنے حجاجؒ کو بُرا بھلا

۱۔ طبقات ابن سعد، جلد ۸، صفحہ ۲۱۹۔

کہا۔ انھوں نے کہا کہ اسے بُرا بھلامت کہو۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اللہ سے
رحم کی درخواست کرے تو اللہ اس پر رحم فرمائے۔[۱]

جناب محمد بن علی الحنفیہؒ اور امیر حجاج بن یوسفؒ:

امیر یزید بن معاویہؒ کے انتقال کے بعد جب ایک سال کے اندر سیدنا مروانؓ بھی وفات پا گئے اور عبدالملک بن مروانؒ اور سیدنا ابن زبیرؓ کے درمیان خلافت کے لیے کشمکش شروع ہوئی تو ان دونوں اصحاب نے سیدنا حسینؓ بن علیؓ کے بھائی جناب محمد بن علیؒ کو اپنی بیعت کرنے کے لیے لکھا۔ جناب محمد بن علیؒ نے اس وقت دونوں اصحاب سے فرداً فرداً معذرت کرلی اور دونوں کو الگ الگ لکھ بھیجا کہ جب آپ کے لیے لوگ مجتمع ہوجائینگے اور آپ کی خلافت اجماعی طور پر منعقد ہوجائے گی تو میں آپ کی بیعت کرلوں گا۔[۲] کچھ عرصہ بعد سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ نے ایک بار پھر جناب محمد بن علیؒ کو اپنے بھائی عروہ بن زبیرؒ کے ذریعے اپنی بیعت کرنے کا پیغام بھیجا جس کو جناب محمد بن علیؒ نے اس دفعہ اپنا واضح سیاسی جھکاؤ دکھاتے ہوئے احسن طریقے سے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ:

عبد الملك بن مروان والله لكأنك بجيوشه قد أحاطت برقبة أخيك وإني لأحسب أن جوار عبد الملك خير لي من جوار أخيك ولقد كتب إلي يعرض علي ما قبله ويدعوني إليه قال عروة فما يمنعك من ذلك قال أستخير الله وذلك أحب إلى صاحبك قال أذكر ذلك له۔[۳]

۱۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۹ صفحہ ۱۲۵،

۲۔ طبقات ابن سعد، جلد ۷، صفحہ ۱۰۳۔

۳۔ طبقات ابن سعد، جلد ۷، صفحہ ۱۰۷۔

”عبدالملک بن مروانؒ اور ان کے لشکر کو گویا آپ بھی دیکھ رہے ہیں کہ آپ کے بھائی (یعنی ابن زبیرؓ) کی گردن کو گھیرے ہوئے ہیں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ آپ کے بھائی کے پڑوس سے زیادہ عبدالملکؒ کا پڑوس میرے لیے بہتر ہے۔ انھوں (عبدالملک) نے خط لکھ کر جو کچھ ان کے پاس ہے، میرے سامنے پیش کیا اور مجھے اپنے پاس بلایا ہے۔ عروہ بن زبیرؒ نے پوچھا کہ پھر آپ کو اس (یعنی عبدالملک کی بیعت) سے کون سا امر مانع ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں اللہ سے اس کا استخارہ کرتا ہوں، یہی تمھارے صاحب (یعنی ابن زبیرؓ) کو زیادہ پسند ہے۔ عروہؒ نے کہا کہ میں یہ ان سے بیان کردوں گا۔“

اب جب مکّہ میں امیر حجاجؒ نے سیدنا ابن زبیرؓ کا محاصرہ کیا تو انھوں نے جناب محمد بن علیؒ کو ایک دفعہ پھر امیر عبدالملک بن مروانؒ کی بیعت کرنے کو لکھا۔ بیعت کے اس دوبارہ مطالبے کی وجہ یہ ہوئی ہے کہ امیر حجاج بن یوسف ثقفیؒ کو خبر مل چکی تھی کہ سبائی مفسدین ابن زبیرؓ کی محصوری کے دور سے ہی محمد بن علیؒ کے پاس آمدورفت شروع کر چکے تھے اور ان پر بیعت لینے کے لیے زور ڈال رہے تھے، جبکہ اس سے تقریباً دس سال پیشتر ہی جب پہلی دفعہ باغیین مدینہ نے جناب محمد بن علیؒ کو امیر یزیدؒ کی بیعت توڑنے کو کہا اور انھوں نے اس بابت صاف انکار کر دیا تو باغیین نے محمد بن علیؒ کو امارت کی پیشکش کی جس کو انھوں نے اسی وقت سختی سے رد کر دیا۔ تاہم یہ مفسدین باز نہیں آئے اور گاہے بگاہے جناب محمد بن علیؒ کے پاس حاضر ہو کر ان کو بیعت لینے پر ابھارتے رہتے، یہاں تک کہ مختار ثقفی جیسا ملحد بھی جناب محمد بن علیؒ کے نام پر لوگوں سے بیعت لیتا رہا ہے، جب محمد بن علیؒ کو مختار کی اس حرکت کا معلوم ہوا تو انھوں نے سختی سے اس بات کی تردید کردی۔[۱]

۱۔ طبقات ابن سعد، جلد ۷، صفحہ ۹۹۔

ان حالات میں سیدنا ابن زبیرؓ کی محصوری کے دوران ہی امیر حجاجؒ کو خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں محمد بن علیؒ حجاز کی ولایت کے خالی ہوجانے کے بعد مفسدین کے اس بہکاوے میں نہ آجائیں جس سے اتنے سالوں سے وہ اپنے تقویٰ اور اعلیٰ ظرفی کے تحت بچتے آئے ہیں، حالانکہ جناب محمد بن علیؒ عروہ بن زبیرؒ کے سامنے امیر عبدالملک بن مروانؒ کی طرف اپنے جھکاؤ کا اظہار کر چکے تھے لیکن اس متعلق امیر حجاجؒ کو کوئی علم نہ تھا۔ اسی لیے انھوں نے ابن زبیرؓ کی محصوری کے دوران ہی جناب محمد بن علیؒ کو امیر عبدالملک بن مروانؒ کی بیعت کے لیے لکھا۔ جس پر محمد بن علیؒ نے ان کو پھر وہی جواب دیا کہ

> ''میں ابن زبیرؓ یا عبدالملکؒ میں سے کسی کی بیعت اس وقت تک نہ کروں گا جب تک کہ لوگ کسی ایک پر مجتمع نہ ہوجائیں، آپ مجھے مخالفت کرنے والوں میں سے نہ پائیں گے۔ ۔ ۔ اب اگر ابن زبیرؓ مقتول ہوجاتے ہیں اور لوگ عبدالملک پر متفق ہوجاتے ہیں تو میں عبدالملکؒ کی بیعت کرلوں گا۔ حجاجؒ (مذکورہ بالا بیان کردہ وجوہات کی بناء پر) ان کی اس بات پر راضی نہ ہوتے تھے۔ محمد بن علیؒ مسلسل انکار کرتے اور حجاجؒ اصرار کرتے یہاں تک کہ ابن زبیرؓ شہید کر دیئے گئے۔ (۱)

امیر حجاجؒ کے اس اصرار کے دوران بعض دفعہ انھوں نے جناب محمد بن علیؒ سے کچھ سختی و درشتی سے بھی بات کی جس کا اظہار جناب محمد بن علیؒ نے اس وقت کیا، جب سیدنا ابن زبیرؓ کی شہادت کے بعد انھوں نے امیر عبدالملک بن مروانؒ کی بیعت کرلی۔ امیر عبدالملک بن مروانؒ کو جب جناب محمد بن علی الحنفیہؒ کی اس شکایت کی بابت پتہ چلا تو انھوں نے حجاجؒ کو کہا کہ عبدالملک سے ملیں اور ان کی شکایت دور

۱۔ طبقات ابن سعد، جلد ۷، صفحہ ۱۱۰، ۱۱۱۔

کریں۔ علامہ ابن سعد لکھتے ہیں:

قال عبد الملك للحجاج: ادركه فسل سخيمة فادركه فقال ان امير المؤمنين ارسلني اليك لاسل سخيمتك ولا مرحباً بشي ساءك۔(۱)

”عبدالملکؒ نے حجاج سے کہا کہ تم ان (محمد بن علیؒ) سے ملو اور ان کی شکایت دور کرو۔ وہ (امیر حجاجؒ) ان سے ملے اور فرمایا کہ مجھے امیر المومنین نے آپ کے پاس بھیجا ہے تاکہ میں آپ کی شکایت دور کروں اور جو شخص بھی آپ کے ساتھ برائی کرے، اسے کامیابی نہ ہو۔“

جس پر جناب محمد بن علیؒ نے امیر حجاجؒ کو ڈانٹتے ہوئے اللہ سے ڈرنے کی تلقین کی اور عمدہ نصیحت کی۔ امیر حجاجؒ نے نہایت صبر اور خندہ پیشانی سے ان کی ڈانٹ اور نصیحت سنی اور ان کی خدمت میں عرض کیا:

فقال له الحجاج: لا تسالني شئياً الا اعطيتكه۔ فقال له محمد: وتفعل؟ قال له الحجاج: نعم۔ قال: فاني اسالك صرم الدهر۔(۲)

”حجاج نے محمد بن علیؒ سے کہا کہ آپ مجھ سے جو مانگیں گے میں وہ آپ کو باضرور دوں گا۔ محمد بن علیؒ نے پوچھا تم واقعی کروگے؟ حجاج نے کہا جی ہاں۔ محمد بن علیؒ نے کہا کہ زمانے کو چھوڑ دو (یعنی لوگوں سے تعلقات منقطع کرلو)۔“

امیر حجاجؒ اور جناب محمد بن علیؒ کی یہ پوری گفتگو ثابت کرتی ہے کہ امیر حجاجؒ

۱۔ طبقات ابن سعد، جلد ۷، صفحہ ۱۱۳۔

۲۔ ایضاً، صفحہ ۱۱۴۔

جناب محمد بن علی الحنفیہؒ کا نہایت احترام کرتے تھے اور عبدالملک بن مروانؒ کی بیعت کے سلسلے میں ان سے جو تھوڑی بہت سختی ہوگئی تھی، اس کا مداوا کرنے کو ہمہ وقت تیار تھے۔ یہاں تک کہ بلا مشروط انھوں نے جناب محمد بن علیؒ کی ہر بات ماننے کا عندیہ بھی ظاہر کردیا تھا جس پر جناب محمد بن علیؒ نے ان کو عمدہ نصیحت کرکے معاملہ رفع دفع کردیا۔ یہی نہیں بلکہ اسی طبقات ابن سعد میں قبصیہ بن عقبہ کی روایت میں آتا ہے کہ ایک دفعہ عین حرم مکّی میں جناب محمد بن علیؒ نے سب کے سامنے امیر حجاجؒ کو ڈانٹ دیا، لیکن امیر حجاجؒ کچھ نہ بولے اور اس ڈانٹ کا احترام کیا۔ ابن سعد لکھتے ہیں:

اخبرنا قبصیۃ بن عقبۃ قال: اخبرنا سفیان عن مغیرہ عن ابراھیم انّ الحجاج اراد ان یضع رجلہ علی المقام فزجرہ ابن الحنفیہ ونہاہ۔ (۱)

''ابراہیم کہتے ہیں کہ بیت اللہ میں حجاج نے اپنا پاؤں مقامِ ابراہیم پر رکھنا چاہا تو ابن الحنفیہ نے انھیں ڈانٹا اور منع کیا۔''

کہاں تو یہ کہا جاتا ہے کہ امیر حجاجؒ ذرا سی مخالفت پر علماء کے سر تن سے جدا کروادیتے تھے اور کہاں ہم دیکھتے آرہے ہیں کہ علماء و مشاہیر امیر محترم کو ڈانٹتے ہیں اور وہ خاموشی سے سن لیتے ہیں۔ تاریخ کے یہ صفحات ثابت کردیتے ہیں کہ امیر حجاج بن یوسفؒ کے اپنے وقت کے بیشتر مشاہیر اور اہل علم سے نہایت خوشگوار تعلقات تھے اور اگر کبھی کسی سے وقتی طور پر معاملات بگڑے بھی تو امیر حجاجؒ خود ان کی جناب میں حاضر ہوکر ان سے معافی مانگ لیا کرتے تھے اور ناراض احباب کی دلجوئی کرتے تھے۔ ان سطور سے چند صفحات قبل ہم سیدنا انس بن مالکؓ اور امیر حجاجؒ کا قصہ نقل کرآئے ہیں، جہاں امیر عبدالملک بن مروانؒ کے توجہ دلانے پر امیر حجاجؒ خود سیدنا انس بن مالکؓ کے گھر تشریف لے گئے اور ان سے معافی مانگی۔

۱۔ طبقات ابن سعد، جلد ۷، صفحہ ۱۱۴۔

الغرض اس طور کے تمام واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ علماء اور مشاہیر پر بے جا سختی اور ان سے بلاوجہ تعارض کے واقعات کذاب راویوں نے امیر حجاجؒ کی شخصیت کو مجروح کرنے کے لیے تاریخ میں درج کردیئے اور مابعد کے مؤرخین نے بلا تحقیق ان کو نقل در نقل آگے بڑھایا، یہاں تک کہ ان جھوٹے واقعات کو اصل تاریخ مان لیا گیا۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ہماری یہ چند سطریں اس مسخ شدہ تاریخ کی تطہیر میں کچھ کام آسکیں گی۔

امیر حجاج بن یوسف ثقفیؒ کی اپنے ماتحت عمال کو ہدایت وسچائی کی نصیحت:

امیر حجاج بن یوسفؒ کی بابت وضع و مسخ شدہ تاریخی روایات کے تحت یہ باور کروایا جاتا ہے انھوں نے حکومت و سیادت کے معاملے میں ظلم و جور اور شقاوت و بربریت کا نہ صرف خود مظاہرہ کیا بلکہ اپنے ماتحت عمال کو بھی اسی کی تاکید کی۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ صحیح تاریخی روایات کے تناظر میں یہ الزام سخت بودہ اور غیر ثابت قرار پاتا ہے۔ امیر حجاجؒ نے جہاں خود کوشش کی کہ ہر معاملے میں عدل و انصاف کا دامن تھام رکھیں وہیں انھوں نے اس متعلق اپنے عمال کو بھی خاص تاکید کر رکھی تھی۔ امیر حجاجؒ نے سیدنا مغیرہ بن شعبہؓ کے بیٹوں کو عراق میں مختلف علاقوں پر عمال مقرر کیا، اس بابت علامہ ابن جریر طبری لکھتے ہیں:

> ''حجاجؒ نے عروہ بن مغیرہ بن شعبہ کو کوفہ کا عامل مقرر کیا، مطرف بن مغیرہ بن شعبہ کو مدائن کا اور عزہ بن مغیرہ بن شعبہ کو ہمدان کا عامل مقرر کیا۔ مطرف بن مغیرہ نے مدائن پہنچ کر خطبہ دیا اور حمد و ثناء کے بعد لوگوں سے کہا:
>
> ان الامیر الحجاج صلحہ اللہ قد ولانی علیکم و امرنی بالحکم

بالحق،والعدل فی السیرۃ

یعنی امیر حجاجؒ اللہ ان کی اصلاح فرمائے، نے مجھے تمھارا حاکم مقرر کیا ہے اور مجھے ہدایت کی ہے کہ میں حق کے ساتھ حکومت کروں اور میرا طرز عمل انصاف پر مبنی ہو۔ اگر ان ہدایات پر میں نے پوری طرح عمل کیا تو میں بہترین آدمی ہوں گا اور اگر میں ان ہدایات پر عمل نہ کرسکا تو میں سمجھوں گا کہ میں نے اپنے آپ کو برباد کیا اور اپنی زندگی بیکار گزار دی۔ میں ظہر اور عصر کے درمیان مسجد میں بیٹھا کروں گا، آپ لوگ اپنی ضروریات مجھ سے بیان کیا کیجئے اور مجھے ایسی تدبیروں کا مشورہ دیا کیجئے جس سے آپ کی اور آپ کے ملک کی بھلائی اور بہتری ہو اور ان شاءاللہ میں حتی الامکان کبھی آپ لوگوں کے ساتھ نیکی کرنے سے دریغ نہیں کروں گا۔ اس خطبہ کے بعد مطرف منبر سے اتر آئے۔"(۱)

جب مطرف بن مغیرہ خطبہ دیکر نیچے اترے تو حکیم بن الحارث الازدی ، جو کہ قبیلۂ ازد کے اشراف میں سے تھے مطرف کے پاس آئے، جن کو کہ بعد میں حجاج نے بیت المال پر عامل مقرر کردیا تھا انھوں نے مطرف سے فرمایا

انہ عھد الیک،فارشد اللہ العاھد والمعھود الیہ

یعنی انھوں (حجاج) نے آپ سے انصاف و مساوات سے حکومت کرنے کا عہد لیا ہے، اللہ عہد لینے والے اور عہد دینے والے دونوں کو کامیاب کرے۔(۲)

یہاں بطور نظیر صرف ایک عامل کا خطبہ اور عہد نقل کیا گیا ہے ورنہ کتب ِ تاریخ میں امیر حجاجؒ کے ایسے کئی عمال کا تذکرہ موجود ہے جنھوں نے اپنے افتتاحی

۱۔ تاریخ طبری، جلد ۶ ،صفحہ ۲۸۴۔

۲۔ تاریخ طبری، جلد ۶ ،صفحہ ۲۸۵۔

خطبات میں امیر حجاجؒ کے اس عہد کا ذکر کیا ہے۔ اس طور کے تمام خطبات وعہد یہ ثابت کرتے ہیں کہ امیر حجاج بن یوسفؒ بھی دوسرے عاملینِ بنی امیہ کی طرح عدل و راست روی پر قائم ہوکر حکومت کرنے کے عادی تھے اور یہی عہد وہ اپنے ماتحت عمال سے بھی لیا کرتے تھے۔

امیر حجاج بن یوسف ثقفیؒ کا حلم اور عفو و درگزر:

کذّاب راویوں نے امیر حجاج بن یوسف ثقفیؒ کی انتظامی معاملات میں سخت گیری اور باغیوں کے لیے شمشیر برآں ہونے کو غلط طور سے پیش کرکے ان پر ظلم و شقاوت اور رحمدلی سے عاری ہونے کی تہمتیں اس کثرت سے عائد کیں کہ آج امیر موصوف کا نام ہی ظلم و شقاوت کی علامت بن چکا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ تاریخ کے انھیں صفحات میں جابجا ایسی روایات بھی موجود ہیں جو کہ امیر حجاجؒ کے حلم اور ان کے عفوو درگزر پر دلالت کرتی ہیں لیکن افسوس کہ مسخ شدہ ذہنیت رکھنے والے مصنّفین نے کبھی ان روایات کو سامنے نہیں آنے دیا۔ ذیل میں ہم ایسی چند روایات پیش کررہے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ امیر حجاجؒ کی شخصیت کی اصل حلم اور عفو و درگزر ہی تھی، تاہم باغیوں اور مفسدین کے لیے ان کے پاس معافی نہیں تھی جوکہ عراق جیسے بگڑے صوبے کی حالت کو سدھارنے کے لیے ایک نہایت ضروری امر بھی تھا۔ علامہ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں:

> ”اصمعیؒ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے چچا سے سنا کہ حجاجؒ جب سیدنا ابن زبیرؓ سے فارغ ہوکر مدینہ آئے تو مدینہ کے باہر ان کی ملاقات ایک بوڑھے سے ہوئی۔ حجاجؒ نے اس سے اہل مدینہ کا حال پوچھا۔ اس نے کہا کہ بُرا حال ہے، نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حواری کے بیٹے شہید کردیئے گئے ہیں۔ حجاجؒ نے کہا کہ ان کو کس نے قتل کیا؟ اس نے کہا کہ فاجر و

لعین حجاجؒ نے،اللہ کی لعنت ہو اس پر اور ہلاک ہو وہ۔ اس پر حجاجؒ شدید غصہ ہوئے اور اس سے پوچھا کہ اگر تم حجاجؒ کو دیکھو تو اس کو پہچان لوگے؟ اس نے کہا بالکل میں اسے پہچان لوں گا، اللہ اس کو ہر خیر سے دور رکھے۔ یہ سن کر حجاجؒ نے اپنے چہرہ پر پڑا نقاب الٹ دیا اور اس سے کہا کہ اے شیخ! اب تو جان لے گا کہ تیرا خون اسی ساعت بہے گا۔ جب بوڑھے کو پتہ چلا کہ یہ حجاجؒ ہیں تو اس نے کہا کہ مجھے تجھ پر بڑا تعجب ہے اے حجاجؒ-اگر تو مجھے جان لیتا تو کبھی ایسی بات نہ کرتا۔ میں عباس بن ابی داؤد ہوں، مجھے ہر روز دن میں پانچ مرتبہ مرگی کا دورہ پڑتا ہے۔ اس پر حجاجؒ نے (کمالِ عفوو درگزر کا مظاہرہ کرتے ہوئے) اس سے کہا کہ یہاں سے چلا جا، اللہ تجھے کبھی اس بیماری سے صحت یاب نہ کرے۔" (۱)

کیا یہ ایک واقعہ یہ ثابت نہیں کردیتا کہ امیر حجاجؒ میں عفوو در گزر کا جذبہ بدرجہ اتم موجود تھا، یہی وجہ تھی کہ انھوں نے ایک ایسے شخص کو اس کے عذر کی بناء پر چھوڑ دیا جو ان کے منہ پر ان کو جانے بغیر برا بھلا کہتا رہا اور یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب کہ سیدنا ابن زبیرؓ کی شہادت کے بعد حجاز کا پورا علاقہ امیر حجاجؒ کے زیر امارت آچکا تھا۔ اگر وہ چاہتے تو اسی وقت اس بوڑھے کو قتل کروادیتے یا خود اپنی تلوار سے اس کا کام تمام کردیتے لیکن انھوں نے کمالِ عفوودرگزر کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کو وہاں سے جانے کا حکم دے دیا۔ اسی طور کا ایک اور طویل واقعہ علامہ ابن کثیرؒ اپنی کتاب "البدایہ و النہایہ" میں لے کر آئے ہیں جو کہ امیر حجاجؒ کے حلم وعفو و در گزر پر شاہد ہے:

"الہیثم بن عدی نے ابن عباس کے حوالے سے نقل کیا کہ عبدالملک

۱۔ البدایہ و النہایہ، جلد ۹ صفحہ ۱۱۷۔

بن مروانؒ نے حجاجؒ کو لکھا کہ ان کو اسلم بن عبدالبکری کا سر بھیجا جائے۔ حجاجؒ نے اسلم بن عبدالبکری کو بلا بھیجا اور جب وہ حاضر ہوا تو اس نے حجاجؒ سے کہا کہ اے امیرؒ! آپ حاضر ہیں اور امیر المومنین غائب ہیں اور اللہ نے فرمایا:

يَآَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًاۢ بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ ۝

''مومنو! اگر کوئی بد کردار تمھارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو خوب تحقیق کرلیا کرو (مبادا) کہ کسی قوم کو نادانی سے نقصان پہنچا دو۔ پھر تم کو اپنے کیے پر نادم ہونا پڑے۔''(۱)

میرے متعلق امیرؒ کو جو اطلاع ملی ہے وہ غلط ہے۔ میں اکیلا چوبیس عورتوں کا کفیل ہوں اور میرے علاوہ کوئی ان کی کفالت کرنے والا نہیں ہے۔ حجاجؒ نے سب خواتین کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔ جب وہ آگئیں تو ان میں سے ایک کہنے لگی کہ میں اس کی پھوپھی ہوں، کوئی کہنے لگی میں اس کی خالہ ہوں ، کوئی کہنے لگی میں اس کی بہن ہوں، کوئی کہنے لگی میں اس کی بیوی ہوں، کوئی کہنے لگی میں اس کی بیٹی ہوں۔ اس دوران ایک لڑکی حجاجؒ کے سامنے آئی، اس کی عمر دس سال سے کم رہی ہوگی۔ حجاجؒ نے اس سے پوچھا کہ تو کون ہے؟ اس نے کہا میں اس کی بیٹی ہوں۔ پھر اس لڑکی نے کہا کہ اے امیر! گھٹنوں کے بل بیٹھ جایئے۔ پھر اس نے یہ اشعار پڑھے:

احجاج لم تشهد مقام بناته　　　و عماته يندبنه الليل اجمعا

اے حجاج! تو اس شخص کی لڑکیوں اور پھوپھیوں کا صحیح مقام نہیں پہچان سکا، وہ سب رات کے وقت نوحہ کرتی ہیں

۱۔ سورۃ الحجرات، آیت ۶۔

احجاج کم تقتل به ان قتلته ثماناً و عشراً و اثنتین و اربعا

اے حجاج! تو چوبیس عورتوں میں سے کس کس کو قتل کرے گا

احجاج من ھذا یقوم مقامه علینا فمھلاً ان تزدنا تضعضعا

اے حجاج!اس کے علاوہ ہماری کون خبر گیری کرے گا، اگر تو ہمیں
ذلیل نہیں کرنا چاہتا تو اس کی دو ہی صورتیں ہیں

احجاج اما ان تجود بنعمة علینا و اما ان تقتلنا معا

اے حجاج! یا تو اپنی فیاضی کا دروازہ کھول دے یا پھر ہم سب کو قتل
کردے۔

راوی کا قول ہے کہ یہ اشعار سن کر امیر حجاجؒ کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں اور وہ رونے لگے اور انھوں نے کہا کہ اللہ کی قسم! میں تم پر سختی نہیں کروں گا۔ اس کے بعد انھوں نے اس شخص کی ساری گفتگو اور اس لڑکی کی ساری کہانی امیر عبدالملکؒ کو لکھ بھیجی۔ امیر عبدالملکؒ نے حجاجؒ کو اس شخص کے قتل نہ کرنے اور اس کے ساتھ صلہ رحمی کرنے اور اس کی لڑکی کا خیال رکھنے کا حکم دیا۔(۱)

یہ واقعہ خواتین اور بے کسوں کی دست گیری اور رعایا پروری پر امیر حجاجؒ کے رویئے کا شاہد ہے۔ اس واقعہ سے بالکل پہلے ایک اور روایت ابن کثیرؒ اپنی تاریخ میں لائے ہیں جو کہ اسی طور سے امیر حجاجؒ کی غریب پروری اور رحمدلی پر دلالت کرتی ہے۔ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں:

''الہیثم بن عدی کہتے ہیں کہ ایک آدمی حجاجؒ کے پاس آیا اور ان سے کہا کہ میرے بھائی نے ابن الاشعث کے ساتھ خروج کیا تھا جس کی وجہ سے میرا نام عطایا و وظائف کی فہرست سے کاٹ دیا گیا ہے جبکہ میرا گھر بھی منہدم ہوگیا ہے۔ اس پر حجاجؒ نے اس سے کہا کہ کیا تو

ا۔ البدایہ والنہایہ، جلد ۹ صفحہ ۱۱۹۔

نے شاعر کا قول نہیں سنا:

؎ بعض دفعہ انسان اپنے ساتھی کی وجہ سے پکڑا جاتا ہے جبکہ اصل مجرم
بچ جاتا ہے

اس پر اس شخص نے کہا کہ اے امیر! میں نے اللہ سے اس کے علاوہ کچھ اور سنا ہے اور اللہ کی بات کا سچا ہونا ظاہر ہے۔ حجاجؒ نے اس سے پوچھا کہ اللہ کا قول کیا ہے؟ اس نے قرآن کی آیت پڑھی:

قَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الْعَزِيْزُ اِنَّ لَهٗٓ اَبًا شَيْخًا كَبِيْرًا فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ○ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗٓ ۙ اِنَّآ اِذًا لَّظٰلِمُوْنَ ○

"وہ کہنے لگے کہ اے عزیز اس کے والد بہت بوڑھے ہیں (اور اس سے بہت محبت رکھتے ہیں) تو (اس کو چھوڑ دیجیے اور) اس کی جگہ ہم میں سے کسی کو رکھ لیجیے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آپ احسان کرنے والے ہیں۔ (یوسف نے) کہا کہ خدا پناہ میں رکھے کہ جس شخص کے پاس ہم نے اپنی چیز پائی ہے اس کے سوا کسی اور کو پکڑ لیں ایسا کریں تو ہم (بڑے) بے انصاف ہیں۔"(۱)

یہ سن کر امیر حجاجؒ نے اپنے غلام کو حکم دیا کہ اس شخص کا نام واپس فہرست میں شامل کیا جائے اور اس کا گھر بھی تعمیر کیا جائے اور اس کو انعام بھی دیا جائے اور منادی کے ذریعے اعلان کیا کہ اللہ کا قول سچا ہے اور شاعر جھوٹا ہے۔"(۲)

اسی طرح امیر حجاج بن یوسفؒ کی رحمدلی اور عفو و درگزر کا ایک اور واقعہ ابن کثیرؒ اپنی تاریخ میں لائے ہیں:

۱۔ سورۃ یوسف ۷۸، ۷۹۔

۲۔ البدایہ والنہایہ، جلد ۹ صفحہ ۱۱۸۔

> ”مدائنی کہتے ہیں کہ حجاجؒ کے سامنے ابن الاشعث کے ساتھیوں میں سے دو قیدیوں کو لایا گیا۔ حجاج نے ان دونوں کے قتل کا حکم دیا۔ ان میں سے ایک حجاجؒ سے مخاطب ہوا: امیر! ذرا ٹھہریئے، میرا آپ پر ایک احسان ہے۔ حجاجؒ نے پوچھا کہ وہ کیا ہے؟ اس نے کہا کہ ایک روز ابن الاشعث نے آپ کی والدہ کے بارے میں برا بھلا کہا تھا جس پر میں نے اس کا رد کیا تھا۔ حجاجؒ نے کہا: اس پر تمھارے پاس کوئی گواہ ہے۔ اس شخص نے کہا: میرا یہ دوست گواہ ہے۔ پھر حجاجؒ نے اس کے دوست سے پوچھا تو اس نے اثبات میں جواب دیا۔ اس پر حجاجؒ نے اس کے دوست یعنی اس دوسرے شخص سے پوچھا کہ تم نے ابن الاشعث کے اس (مذموم) فعل پر نکیر کیوں نہ کی۔ اس نے جواب دیا کہ آپ سے بغض رکھنے کی وجہ سے (یعنی میں نے آپ سے بغض رکھنے کی وجہ سے ابن الاشعث کے اس فعل پر اس کی نکیر نہیں کی)۔ اس پر امیر حجاجؒ نے ان دونوں سے کہا کہ تم لوگ آزاد ہو۔ پہلا اپنے فعل کی وجہ سے اور دوسرا اپنے سچ کہنے کی وجہ سے۔“ (۱)

اب اس سے بڑھ کر حلم اور عفو و درگزر کا مظاہرہ کیا ہوگا جہاں امیر حجاج بن یوسفؒ دو باغیوں کو جن کو موت کی سزا سنائی جاچکی ہے، ان کو ان کے احسن فعل اور سچ بولنے کی بناء پر معاف کردیں۔ اور پھر یار لوگ کہتے ہیں کہ امیر حجاجؒ ظالم تھے، جابر تھے، سنگدل تھے۔ اگر یہ ظلم و سنگدلی ہوتی ہے تو پھر عفوو درگزر اور رحمدلی کس چڑیا کا نام ہے۔ اللہ برباد کرے ان کذاب راویوں کو جنھوں نے امیر حجاجؒ جیسے حلیم امیر پر ایسی واہیات و خلاف واقعہ تہمتیں اور بہتان لگائے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ امیر حجاجؒ کی ذات ان تمام بہتانوں سے بری ہے۔

۱۔ البدایہ والنہایہ، جلد ۹ صفحہ ۱۲۰۔

ہم امید کرتے ہیں کہ مذکورہ بالا روایات سے قارئین کے سامنے امیر حجاج بن یوسفؒ کے اوپر لگائے گئے ظلم و شقات کے الزامات کی اصل حقیقت واضح ہوگئی ہوگی۔ اور جہاں تک رہے امیر حجاجؒ کے بعض سخت اقدامات تو ان کی بابت ہم پیچھے بیان کر آئے ہیں کہ ان میں سے بیشتر اقدامات ظلم نہیں بلکہ حکومتی اقدام ہوتے تھے جو کہ اس وقت کی مسلم حکومت کے استحکام کے لیے از حد ضروری تھے۔ اب چونکہ امیر حجاجؒ نے ایرانیوں کے زیر اثر اٹھنے والی علویوں کی بغاوتوں کو دبا کر رکھا ہوا تھا اسی لیے ان بیچارے پر تاریخ میں سارا نزلہ گرایا گیا۔ اگر یہی اقتدار سیدنا حسنؓ کے بعد امویوں کے بجائے علویوں میں منتقل ہوا ہوتا اور امیر حجاجؒ علویوں کے ایک وفادار گورنر ہوتے تو ان ہی حجاجؒ کی تعریف اور گورنرشپ کی قابلیت سے تاریخ کے اوراق بھرے نظر آتے۔ امیر حجاجؒ کا اصل قصور ان کی نسبت تھی، یہ نسبت امویوں سے بدل کر علویوں کی طرف ہوجاتی تو ان ہی حجاجؒ میں آپ کو ہیرے جڑے ملتے کیونکہ امیر حجاجؒ نے اصل میں کام سارے احسن ہی کیے تھے اور وقت کے تقاضوں کے لحاظ سے کیے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ امیر حجاجؒ کے عراق کے دورِ ولایت میں بنو امیہ کی حکومت نے جو جہادی مساعی سرانجام دیں ان کو علامہ ابن کثیرؒ اس طور سے خراج تحسین پیش کرتے ہیں:

> ''اسی سال (۹۳ ہجری) محمد بن قاسمؒ نے بلادِ ہند میں دیبل اور دیگر شہر فتح کیے۔ امیر حجاجؒ نے جب محمد بن قاسم کو غزوۂ ہند کی مہم کا امیر بنایا تو ان کی عمر ۱۷ سال تھی۔ امیر محمد بن قاسمؒ مسلمانوں کے لشکر کو لے کر ہند پہنچے تو ہند کا بادشاہ راجہ داہر ایک بڑی فوج اور ستائیس بہترین ہاتھیوں کو ساتھ لے کر مقابلے پر آیا، دونوں طرف سے گھمسان کا رن پڑا۔ راجہ داہر اور اس کے بہت سے ساتھی مقتول ہوئے، مسلمانوں نے ہندوؤں کا تعاقب کر کے ان کو قتل کیا۔ بعدازاں محمد بن قاسمؒ نے

کبرج اور برھا وغیرہ کا رخ کیا حتیٰ کہ ان کو بھی فتح کر لیا اور بیشمار مالِ غنیمت اور جواہر و سونا لے کر لوٹے۔ اس وقت بنو امیہ کا اشتغال اور زور صرف جہاد پر تھا۔ ان کے ذریعے اللہ نے مشرق و مغرب میں اسلام کا کلمہ بلند کیا، کفر اور اہل کفر کو ذلیل و رسوا کیا، مسلمانوں کی فتوحات کی کثرت سے مشرکوں کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب گھر کر گیا، مسلمان جدھر کا رخ کرتے اللہ کی نصرت اور کامرانی سے ہمکنار ہوتے کیونکہ بنو امیہ کے بھیجے لشکروں میں صالحین، اولیاء، بڑے علماء اور کبار تابعین ہوتے تھے، ان ہی کے دین کی برکت سے اللہ مسلمانوں کو فتح یاب کرتا۔ اسی سال قتیبہ بن مسلمؒ بلادِ ترک کو فتح کرتے ہوئے چین کی سرحد تک پہنچ گئے اور چین کے بادشاہ کو اپنے پاس بلا بھیجا۔ چین کے بادشاہ نے مسلمانوں کی جاہ و حشمت سے خوفزدہ ہو کر امیر قتیبہؒ کے پاس تحفے تحائف، ہدایا اور کثیر تعداد میں قیمتی اشیاء روانہ کیں۔ غرض یہ کہ اطراف و اکناف کے تمام بادشاہ اپنی تمام تر فوجی قوّت کے باوجود امیر قتیبہؒ کا نام سنتے ہی گھبرا جاتے اور سب خوف کے مارے امیر قتیبہؒ کو جزیہ دینے پر آمادگی ظاہر کر دیتے۔ اگر امیر حجاج بن یوسف ثقفیؒ چند عرصہ اور زندہ رہ جاتے تو اسلامی افواج چین کو فتح کیے بغیر واپس نہ آتیں۔ لیکن امیر حجاجؒ کے انتقال کے بعد اسلامی افواج بغیر مزید فتوحات کیے واپس ہو گئیں اور پھر کچھ دنوں بعد قتیبہؒ بھی بعض مسلمانوں کے ہاتھوں مقتول ہو گئے۔ بہرحال ایک طرف مسلمہ بن عبدالملک بن مروانؒ، امیر ولید بن عبدالملک کے صاحبزادے اور ان کے بھائی بلادِ روم کو فتح کر رہے تھے اور شامی افواج کے ساتھ معرکوں میں لشکر کشی کرتے ہوئے قسطنطنیہ پہنچ گئے تھے اور وہاں پر مسلمہ نے مسجد بھی

> بنوائی، جس کی وجہ سے فرنگیوں کے قلوب مسلمانوں کے خوف سے مرعوب ہوگئے تو دوسری طرف محمد بن قاسمؒ بلادِ ہند میں جہاد میں مصروف تھے اور عراقی افواج کا لوہا منوا رہے تھے۔ تیسری طرف امیر موسیٰ بن نصیرؒ بلادِ مغرب میں جہاد کا غلغلہ بلند کر کے اسلام کا نام روشن کر رہے تھے۔ ان فتوحات کی وجہ سے یہ تمام علاقے شرک و بت پرستی سے پاک ہو چکے تھے اور شام، مصر، عراق، یمن، ماوراء النہر اور بلادِ مغرب میں لا الہ الا اللہ کی صدا گونج رہی تھی۔(۱)

حجاج بن یوسفؒ پر معترض حضرات کو البدایہ و النہایہ میں حجاج بن یوسفؒ کے حالات زندگی پڑھنے چاہییں جو کہ علامہ ابن کثیر نے و ھذہ ترجمۃ الحجاج بن یوسف الثقفی و ذکر وفاتہ کی سرخی قائم کر کے بیان کیے ہیں۔ علامہ ابن کثیر دمشقیؒ نے جہاں حجاجؒ کے مبینہ مظالم ایک ایک کر کے ذکر کیے ہیں اور ان کے فاسق اور منکر خدا ہونے کی بے سند و ضعیف روایات ذکر کی ہیں وہیں ان کی اللہ و رسول پر کامل ایمان، حبِّ قرآن، حبِّ جہاد فی سبیل اللہ، اہل قرآن کی خدمت اور یتیموں اور بیواؤں کی دستگیری جیسی مومنانہ صفات بھی بیان فرمائی ہیں۔ لوگ عموماً ان کے حوالے سے عمر بن عبدالعزیزؒ کا یہ قول پیش کرتے نہیں تھکتے کہ ''اگر پوری دنیا اپنے فساق کو ایک پلڑے میں رکھے اور ہم اپنا فاسق دوسرے پلڑے میں، تو ہمارا فاسق (حجاج بن یوسف) بھاری پڑ جائے گا'' جبکہ عمر بن عبدالعزیزؒ ہی سے منسوب دوسرا قول بھی موجود ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ مجھے حجاج بن یوسفؒ کے کسی کام پر رشک نہیں آیا سوائے تین کاموں کے ، ان کا قرآن سے لگاؤ، جہاد فی سبیل اللہ اور یتیموں اور بیواؤں کی دست گیری !!! ایک اور روایت میں آتا ہے کہ وہ عموماً حجاج بن یوسفؒ کو پسند نہیں کرتے تھے تاہم دورانِ موت ان کے کہے ہوئے اشعار کو بار بار دہرایا کرتے تھے۔

۱۔ البدایہ والنہایہ، جلد ۹ صفحہ ۸۷-۸۸۔

حجاج بن یوسفؒ کی آخری وصیت ان کے مومن ہونے اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر کامل ایمان رکھنے کی سب سے بڑی بین دلیل ہے۔ میں پوری جرأت کے ساتھ یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ وہ خیر القرون کے فاسق سہی لیکن آج شرالقرون کے بڑے بڑے اتقیاء اور صالح مسلمانوں سے ہزار درجہ بہتر مسلمان تھے۔ اللہ ان کی لغزشوں کی مغفرت فرمائے اور ان کو اپنے دین کی خدمت کے عوض جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین۔

امیر حجاج بن یوسف ثقفیؒ
تاریخ وتنقید کی روشنی میں

پروفیسر عبدالقیومؒ

از: پروفیسر عبدالقیومؒ

حجاج بن یوسف: تاریخ وتنقید کی روشنی میں

حجاج بنوامیہ کے عہد میں پروان چڑھا اور انہیں کی سلطنت اور حکومت کے استحکام کا باعث ہوا اور سوئے اتفاق ملاحظہ ہو کہ بنوامیہ کے عہد اور خلافت راشدہ کے زمانے میں زمانی فاصلہ تو کوئی زیادہ نہیں، لیکن حالات اور انقلابات کی برق رفتاری کو کیا کہیے کہ دونوں زمانوں کی اخلاقی قدروں میں اچھا خاصا بُعد اور تفاوت نظر آتا ہے۔

خلافت راشدہ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قُرب اور ارباب اختیار کے تقدس نے مقدس تر بنا دیا۔ اگر ہمیں بنوامیہ کے عہد میں خلفائے راشدین کا سا خلوص اور بے لوث جذبۂ خدمت مفقود نظر آتا ہے یہ چنداں تعجب کی اور حیرت کی بات نہیں جب ہم انسانی فطرت کا بنظر غائر مطالعہ کرتے ہیں، تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ جوں جوں لوگ اپنے قائد سے زمان ومکان کے اعتبار سے دور ہوتے جاتے ہیں ان کے خلوص اور عمل میں کمی واقع ہوتی جاتی ہے۔ اتفاق کی بات ہے کہ بنوامیہ کو پیش رو ایسے ملے جن کی نظیر محال ہے، ورنہ وہ کون سی خوبی ہے جو بنوامیہ میں نہ تھی اور وہ کون سی برائی تھی جو ان کے جانشینوں (بنوعباس) میں بدرجۂ اتم نہ پائی گئی، لیکن اس کے باوجود ہمیں بنوعباس سے عقیدت ہے اور بنوامیہ سے نفرت۔

بنوامیہ کی غیر ہردلعزیزی کی دوسری وجہ یہ ہوئی کہ ان کے عہد میں چند ایسے

ناخوشگوار واقعات پیش آ گئے جن کی وجہ سے وہ بدنام ہو گئے۔ اس سلسلے کی آخری کڑی کربلا کا افسوس ناک حادثہ اور المیہ تھا۔

اس ضمن میں ہم بھی مورد الزام ٹھہرتے ہیں کہ ہم نے تاریخ کو ایک آنکھ سے نہیں دیکھا، بلکہ جب ہم اسلامی تاریخ کا مطالعہ شروع کرتے ہیں تو صدر اول یعنی خلافت راشدہ کے عہد کو تقدس اور معصومیت کی عینک سے دیکھتے ہیں، حالانکہ وہاں بھی ہمیں کچھ کم افسوس ناک واقعات دکھائی نہیں دیتے۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت، جنگ جمل، جنگ صفین، واقعۂ نہروان وغیرہ اتنے ہی المناک اور کرب انگیز ہیں جتنا کوئی عہد امیہ کا بڑے سے بڑا ناخوشگوار واقعہ، لیکن ہمارا انداز اور رجحان طبیعت ملاحظہ ہو کہ جب امیر معاویہؓ کے عہد حکومت پر نگاہ پڑی تو فوراً تعصب کی عینک لگا لی اور اتنی کڑی تنقید شروع کر دی کہ گویا ہم انسانوں کی تاریخ نہیں پڑھ رہے بلکہ چند بے جان و بے روح لوگوں کی تاریخ کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ مقصد صرف یہ ہے کہ جہاں انسان بستے ہوں وہاں رائے کا اختلاف، خواہشات کا تفاوت اور لائحہ عمل کا فرق ضروری ہے۔ حصول مقصد کے لیے قربانی، خوں ریزی، جنگ اور قتل و غارت گری فطرت انسانی کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے اور یہ چیز ہمیں ہر ملک ہر خاندان اور ہر حکومت میں نظر آتی ہے۔

بنوامیہ سے نفرت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ تاریخ نویسی اور سیرت نگاری عباسیوں کے عہد حکومت میں شروع ہوئی۔ یا یوں کہیے کہ تاریخ وسیرت کی کتابیں جو ہم تک پہنچی ہیں وہ سب بنوعباس کے زمانے میں لکھی گئیں۔ بنوعباس اور بنوامیہ کی دشمنی کا تقاضا یہ تھا کہ کوئی مؤرخ اموی خلفا کی تعریف کے جرم کا مرتکب نہ ہو۔ عباسی خلفا کی ناراضگی اور عتاب مول لینا کوئی آسان کام نہ تھا۔ جب حالات یہ ہوں تو ہم کس طرح توقع کر سکتے ہیں کہ کوئی مؤرخ اموی حاکموں سے انصاف کر سکتا تھا۔

حجاج کی اہمیت:

بہرکیف حجاج بن یوسف کی تاریخ فرد واحد کی تاریخ نہیں، بلکہ اس پورے عہد کی تاریخ ہے۔ اگر حجاج جیسا بلند پایہ عسکری مدبر اور سیاسی مفکر اسلام کو نہ ملتا تو اسلامی تاریخ کے وہ اوراق جنہیں سنہری اوراق کے نام سے یاد کرتے ہیں آج ہمارے سامنے نہ ہوتے اور اسلامی فتوحات کا شاندار سلسلہ بالکل مفقود نظر آتا ہے۔ حجاج بیک وقت قائد عسکر بھی ہے اور سیاسی مفکر بھی۔ اس کی سیمابی روح، عقابی نظر، عسکری دل اور انتظامی دماغ ہر جگہ کارفرما نظر آتا ہے۔ وہ بہت بلند پایہ ادیب اور اقلیم خطابت کا تاجدار ہے۔ اس کی شعلہ مقالی اور آتش بیانی کی دھوم سارے عالم میں ہے۔ وہ اپنے زور بیان اور الفاظ کے جادو سے سامعین کو مسحور کر لیتا تھا۔ وہ ایک عادل حاکم ہے، جو باغیوں سے کسی قسم کی رعایت روا نہیں رکھتا۔ وہ شفیق فرماں روا ہے جسے اپنی رعایا کی حاجتیں اور ضرورتیں بے چین کر دیتی ہیں۔ وہ میری اور آپ کی طرح کا ایک انسان ہے جو خوش بھی ہوتا ہے اور ناراض بھی۔

آج سے ایک ہزار تین سو ساٹھ برس پہلے یعنی ۴۱ھ میں حجاز کے مشہور شہر طائف میں بنو ثقیف کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا، جس کا باپ اسکول میں بچوں کو پڑھایا کرتا تھا۔ عربی رسم و رواج کے مطابق حجاج کو تعلیم و تربیت دی گئی۔ جوان ہوا تو باپ کا پیشہ اختیار کیا اور تھوڑے عرصے میں اپنی ذہانت و قابلیت اور نظم و نسق کی وجہ سے مشہور ہو گیا۔

مذہبی اور سیاسی پس منظر کا جائزہ:

جب حجاج نے آنکھیں کھولیں تو تقریباً سارے عرب میں ایک گونا گوں سیاسی انتشار پھیلا ہوا تھا۔ حکومت کی کوتاہیاں، عوام کی بے باکیاں، اکابر کی چشم پوشی، علما کی خاموشی اور صلحا کی خود فراموشی نے عربوں کے سیاسی اور دینی اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا تھا۔ اتحاد کے خیال کے فقدان نے ذہنی انتشار اور عملی کوتاہی پیدا کر دی تھی۔ تقدس کے غلط تصور اور

حکومت کے بے جا نرمی نے حکومت کے اقتدار کو نہ صرف کم کر دیا' بلکہ حکومت کے کل پرزوں کو کمزور سے کمزور تر کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فتنوں اور سازشوں نے سر اٹھایا۔ کسی خلیفہ وقت کو گھر کی چار دیواری میں محصور کر کے شہید کر دیا اور کسی کو صبح کی تاریکی میں مسجد میں داخل ہوتے ہوئے ایسی بری طرح زخمی کیا کہ وہ ان زخموں سے جانبر نہ ہو سکا۔

ابھی حجاج کی جوانی انگڑائیاں لے رہی تھی کہ مختلف سیاسی اور مذہبی تحریکوں نے شیرازہ ملت کو کچھ اس طرح پریشان کر دیا کہ اسلامی سلطنت کا ٹمٹماتا ہوا چراغ تند و تیز جھونکوں کی تاب نہ لا کر بجھا چاہتا تھا۔ عقل محو حیرت ہو کر رہ گئی۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ عشق میدان ابتلا میں کود ے اور تمام فتنوں کو جو دین اور حقوق کے نام پر کھڑے کیے گئے تھے کچل کر رکھ دے۔

یہ غیر موزوں نہ ہوگا کہ حجاج پر کچھ کہنے سے پہلے چندان سیاسی اور مذہبی تحریکوں کا ذکر کر دیا جائے جن سے حجاج کو سابقہ پڑنے والا تھا اور اگر حجاج سے پہلے امیر معاویہؓ کی دانش مندی' تدبر اور سیاسی بصیرت آڑے نہ آتی تو شیرازہ ملت اس طرح بکھر جاتا کہ ایک ایک ورق فتنوں کی نذر ہو جاتا اور پھر حجاج کے سنبھالے بھی نہ سنبھل سکتا۔

خلیفہ عبدالملک بن مروان کی حکومت کو ایک طرف تو خارجیوں سے مقابلہ کرنا پڑا جو ایک نیم مذہبی اور نیم سیاسی گروہ تھا جو حضرت علیؓ کے زمانہ خلافت میں پیدا ہوا۔ حکومتوں کی سخت گیر پالیسی کے باوجود ان کا فتنہ فرو نہ ہو سکا۔ اس گروہ کے سیاسی عقائد میں چند چیزیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں: مثلاً (۱) دنیا میں خدا کی بادشاہی اور حکومت کا قیام ان کا مقصد اولین تھا۔ ان کا قومی نعرہ ان الحکم الا للہ یعنی صرف خدا کی حکومت، تھا۔ (۲) ان کے نزدیک خلافت قریش تک محدود نہ تھی بلکہ ہر مسلمان خواہ وہ حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو' خلیفہ منتخب ہو سکتا تھا۔ (۳) اس گروہ کی رائے تھی کہ اگر خلیفہ احکام خدا کی پابندی اور اطاعت نہ کر سکے تو اسے معزول کر دیا جائے۔

اس گروہ نے بنوامیہ اور بنوعباس کے خلاف ہمیشہ علم بغاوت بلند کیے رکھا' کیوں کہ

دونوں خاندان خارجیوں کی نظر میں خلافت اور حکومت کے حقدار نہ تھے۔ خارجیوں سے مختلف فرقے اور مدارس فکر پیدا ہوئے اور مذہبی واعتقادی امور میں بھی دخل دینے لگے ان فرقوں میں ازارقہ (اتباع نافع بن ازرق) نجدات (اتباع نجدہ بن عامر) اباضیہ (اتباع عبداللہ بن اباض تمیمی) صفریہ (اتباع زیاد بن الاصفر) اور شراۃ (ومن الناس من یشری نفسہ ابتغاء مرضات اللہ) ان لوگوں میں ایسے بھی تھے جو حضرت علی اور عثمان رضی اللہ عنہما کو کافر سمجھتے تھے۔ ان کے عقائد سے قطع نظر یہ لوگ بڑے بہادر' جانباز اور نڈر واقع ہوئے تھے۔ بڑی بے جگری سے لڑتے۔ حکومت وقت کے لیے ہر آن ایک مستقل خطرہ تھے۔

اس کے بعد دوسرا اہم سیاسی اور مذہبی گروہ' جس سے بنوامیہ کو دوچار ہونا پڑا' شیعوں کا تھا جن کا خلافت کے مسئلے میں اختلاف رائے شروع ہوا اور حادثہ کربلا اس اختلاف کی آخری کڑی ثابت ہوا۔ بنوامیہ کے خلاف یہ سب سے بڑا محاذ تھا۔ نام کے تقدس' مقصد کی جاذبیت اور رسالت سے قرابت داری نے سونے پر سہاگے کا کام دیا۔

ان تحریکوں کے علاوہ ایک سیاسی گروہ بھی اپنے حقوق کی خاطر بنوامیہ سے برسر پیکار نظر آتا ہے۔ جب غیر عربی لوگ حلقہ بگوش اسلام ہوئے تو قدرتی طور پر سوال پیدا ہوا کہ ان کے حقوق و واجبات کیا ہیں؟ عرب اپنے آپ کو سب سے بلند و بالا اور افضل و اعلیٰ سمجھتے تھے۔ اسلام کے بار بار اعلان مساوات کے باوجود عربوں میں قومی عصبیت کا جذبہ موجود رہا۔

ان جماعتوں کے علاوہ ایک اور بڑا خطرہ تھا' جس سے خلیفہ عبدالملک کو دوچار ہونا پڑا۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے حجاز میں' جو اسلامی روایات کا مرکز تھا' اپنے لیے خلافت کا اعلان کر دیا۔ حجاز کی مرکزیت اور اس کا تقدس ابن زبیرؓ کی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قرابت داری ان کے اردگرد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ہجوم، یہ سب چیزیں عبدالملک کی خلافت کو ختم کرنے کی کافی ضمانت تھیں۔

جمہور کی طبیعتیں ان اہم حوادث وواقعات کے اثرات سے کس طرح محفوظ رہ سکتی تھیں۔حکومت کے خلاف بددلی، اطاعت وفرماں برداری میں کوتاہی،خلیفہ وقت کی خفت، ذمہ داری کے احساس کا فقدان، فتنہ وفساد کی طرف میلان، سازشوں کا شوق اور حکام کی تذلیل وتوہین زندگی کا معمول بن چکا تھا۔

آپ غور فرمایئے کہ ان تمام حالات کے پیش نظر انتظام امور سلطنت،شہری امن وحفاظت اور اسلامی حکومت کی حدود کی توسیع کے لیے کس آہنی عزم اور پتھر دل منتظم کی ضرورت تھی۔کیا ایک معمولی قابلیت کے انسان کے لیے ممکن تھا کہ وہ ان تمام مخالف قوتوں سے ٹکرائے اور کامیابی اس کے قدم چومے؟ حقیقت یہ ہے کہ اگر حجاج جیسا سخت گیر اور لائق منتظم اپنی شخصی خدمات پیش نہ کرتا تو اپنوں کی سازشیں اور غیروں کی عداوتیں اسلامی سلطنت کو ہمیشہ کے لیے ختم کردیتیں۔

اس لمبی' لیکن ضروری' تمہید کے بعد اب حجاج کی زندگی کے چند پہلو بے نقاب کیے جاتے ہیں،جنہیں تعصب اور غلط ذہن نے کئی پردوں میں چھپا رکھا ہے۔

مختصر حالات زندگی:

حجاج نے درس وتدریس چھوڑ کر حکومت کی نوکری اختیار کر لی اور معمولی سپاہی کی حیثیت سے زندگی کا آغاز کیا۔تھوڑے ہی عرصے میں وہ پولیس کا ذمہ دار افسر بن کر خلیفہ عبدالملک کے بھائی ابان بن مروان کے ساتھ فلسطین چلا گیا۔ان دنوں ابان فلسطین کا گورنر تھا۔(انساب الاشراف)بعد ازاں حجاج خلیفہ عبدالملک کے وزیر روح بن زنباع کے ساتھ پولیس افسر کی حیثیت میں عرصہ تک کام کرتا رہا۔اس دوران حجاج نے اپنی دیانت داری، لیاقت، حسن انتظام، بے لوث خدمت اور اعلیٰ نظم ونسق کا ایسا شاندار ثبوت دیا کہ روح بن زنباع حجاج کی خوبیوں کا بے حد معترف اور مداح ہو گیا۔ایک دن کا ذکر ہے کہ خلیفہ عبدالملک نے اپنے وزیروں کے سامنے شکایت کی کہ بعض اوقات لشکروں کی

روانگی، سفر اور منزل پر پہنچ کر قیام کرنے میں بہت سی بے قاعدگیاں ہو رہی ہیں اور بتایا کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو لشکر کے روانہ ہو جانے کے بعد بھی خیموں میں بیٹھے نظر آتے ہیں۔ روح بن زنباع نے کہا اے امیر المومنین! میرے ماتحت ایک پولیس افسر ہے۔ جس کا نام حجاج بن یوسف ہے۔ اگر امیر المومنین لشکر کی باگ ڈور اس کے سپرد کر دیں تو وہ سب کچھ درست کر لے گا۔ خلیفہ اس بات پر رضامند ہو گیا۔ چنانچہ فوجوں کا نظم و نسق حجاج کے سپرد کر دیا گیا۔ جب فوجی سپاہیوں نے حجاج کا نام سنا تو چوکنے ہو گئے اور بے قاعدگیوں کو خیر باد کہہ دیا۔ فوج کے ایک دستے میں روح بن زنباع کے کچھ دوست احباب بھی تھے اور روح بن زنباع کی دوستی کا خیال ان کے سر پر سوار تھا۔ ایک دن حجاج نے دیکھا کہ لشکر کی روانگی کے بعد کچھ لوگ پیچھے رہ گئے ہیں۔ حجاج ان کے پاس پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ وہ کھانا کھانے میں مشغول ہیں۔ حجاج نے باز پرس کی تو انہوں نے ٹال مٹول سے کام چلانا چاہا۔ حجاج نے فوراً آنکھیں بدل لیں اور نظم و نسق اور ضبط و وقار کو قائم رکھنے کے خاطر سزا کے طور پر ان پیچھے رہ جانے والوں کو کوڑے لگوائے۔ انہیں ذلیل و رسوا کیا گیا اور سارے لشکر میں ان کی تشہیر کرائی گئی۔ ساتھ ہی روح بن زنباع اور اس کے ساتھیوں کے خیموں کو نذر آتش کر کے راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔ روح یہ دیکھ کر لال پیلا ہو گیا۔ مگر کچھ پیش نہ گئی۔ آخر خلیفہ کی خدمت میں حاضر ہو کر زار و قطار رو یا۔ خلیفہ نے پوچھا کہ کیا بات ہوئی۔ روح نے درد بھری آواز میں عرض کیا کہ ایک دن وہ بھی تھا کہ حجاج میرے نوکروں کے زمرے میں شمار ہوتا تھا۔ آج اس کو اتنی جرأت ہو گئی ہے کہ اس نے میرے خیموں کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیا ہے۔ خلیفہ عبدالملک نے حکم دیا کہ حجاج کو میری خدمت میں پیش کیا جائے۔ جب حجاج کو حاضر کیا گیا تو خلیفہ نے پوچھا کہ تم نے یہ حرکت کیوں کی؟ حجاج نے عرض کیا کہ میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ خلیفہ نے دریافت کیا کہ آخر یہ خیمے کس نے جلائے ہیں؟ حجاج نے جواب دیا، امیر المومنین نے۔ بخدا! میرا ہاتھ خلیفہ کا ہاتھ ہے اور میرا کوڑا خلیفہ کا کوڑا' پھر یہ بھی عرض کیا کہ میں نے یہ سب کچھ خلیفہ کا اقتدار اور فوجی وقار کو قائم رکھنے کی خاطر کیا ہے۔ اب امیر

المومنین کو اختیار ہے کہ روح بن زنباع کے نقصان کی تلافی کر دے اور ایک خیمہ کے بدلے دو خیمے اور ایک غلام کے بدلے دو غلام عطا کر دے۔ لیکن جو کچھ میں نے کیا ہے وہ نظم ونسق کے لیے ازبس ضروری تھا۔ (العقد الفرید)

ایک گودڑی میں سو فقیروں کے لیے گنجائش نکل سکتی ہے، لیکن ایک ملک اور ایک سلطنت میں دو بادشاہوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوسکتی۔ اوپر اشارتاً ذکر ہو چکا ہے کہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے حجاز میں اپنی خلافت قائم کر رکھی تھی۔ عبدالملک ہر وقت اسی فکر میں رہتا تھا کہ ابن زبیرؓ سے کس طرح مخلصی پائی جائے۔ حبیش بن دلجہ کی قیادت میں ایک لشکر عبداللہ بن زبیرؓ سے لڑنے کے لیے روانہ کیا گیا۔ اس لشکر میں حجاج اور اس کا باپ یوسف دونوں شریک تھے۔ جنگ شروع ہوئی۔ فریقین زور آزمانے لگے۔ ختف اور اس کے کچھ ساتھی گھات میں چھپے بیٹھے تھے۔ موقع پا کر عبدالملک کے لشکر پر پل پڑے۔ سالار حبیش کو قتل کر دیا اور اس کے لشکریوں کو بڑی بے دریغی سے قتل کرنے لگے۔ عبدالملک کے بے شمار سپاہی میدان جنگ میں کام آئے۔ پانچ سو سے زیادہ جنگی قیدی بنا لیے گئے اور تین صد کے قریب بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگ نکلے۔ ان بچ نکلنے والوں میں حجاج اور اس کا باپ یوسف بھی شامل تھا۔ باپ بیٹا ایک گھوڑے پر سوار ہو کر اسے برابر تیس میل تک سرپٹ دوڑاتے چلے گئے۔ آخر گھوڑے کی طاقت نے جواب دے دیا۔ تیس میل کا فاصلہ طے کر چکنے کے بعد بھی حجاج کے دل ودماغ پر دشمن کا بھوت سوار تھا اور اسے رہ رہ کر یہ خیال آ رہا تھا کہ دشمن کے تیر ہمارے شانوں کو زخمی کر رہے ہیں۔ حجاج کو اس ہزیمت کا بڑا قلق ہوا۔ وہ بار بار کہتا تھا کہ یہ ہزیمت کتنی شرمناک اور ذلت آمیز ہے۔

(انساب الاشراف)

اس ہزیمت نے دیر تک حجاج کو بے چین کیے رکھا۔ وہ ہر چند یہ چاہتا تھا کہ اس کا انتقام جلد از جلد لیا جائے۔ ۷۳ھ میں ایک دن حجاج نے خلیفہ عبدالملک سے کہا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں عبداللہ بن زبیرؓ کی کھال کھینچ رہا ہوں۔ میری درخواست ہے کہ

مجھے اس کے مقابلے پر روانہ کیا جائے۔ خلیفہ رضامند ہو گیا۔ حجاج ایک ہزار کا لشکر جرار لے کر طائف پہنچا۔ وہاں پہنچنے کے بعد خلیفہ کی طرف سے لڑائی شروع کرنے کا حکم بھی مل گیا۔ حجاج نے ابن زبیرؓ کا محاصرہ کر کے اسے قتل کر دیا۔ (کتاب المعارف' لابن قتیبہ)

اس فتح کے بعد حجاج تین سال تک حجاز کا گورنر رہا اور ہر سال حج کے موقع پر امامت کے فرائض انجام دیتا رہا۔

ابن قتیبہ نے کتاب المعارف میں ذکر کیا ہے کہ سب سے پہلے حجاج کو تبالہ کا والی بنا کر بھیجا گیا۔ جب حجاج وہاں پہنچا تو جگہ پسند نہ آئی' اسے چھوڑ کر واپس چلا آیا۔

ابن عبدربہ نے العقد الفرید (۲:۲۶۷) میں بیان کیا ہے کہ جب عبدالملک بن مروان کی خلافت اور بیعت کا اعلان ہو چکا تھا تو اس نے مصعب بن زبیرؓ پر حملہ کی ٹھانی۔ اہل شام کی خواہش تھی کہ وہ اس جنگ میں اپنا دامن آلودہ نہ کریں۔ حجاج کو شامیوں کا الگ تھلگ رہنا پسند نہ تھا۔ وہ اسے سیاسی مصلحت کے خلاف سمجھتا تھا۔ اس نے خلیفہ سے درخواست کی کہ مجھے وہاں بھیجا جائے۔ حجاج نے شام پہنچ کر لوگوں کو لڑائی کے لیے بھرتی کرنا شروع کیا۔ حجاج نے یہاں بھی رعب اور دبدبے سے کام لیا اور جو آدمی جنگ میں شرکت کرنے سے گریز کرتا ہوا بھاگ جاتا تو حجاج اس کے مکان کو نذر آتش کر دیتا۔

حجاج کی عمر تیس برس کی تھی کہ اسے عراق جیسے فتنہ انگیز اور شوریدہ سر علاقے کا گورنر بنا دیا گیا۔ عراق اپنے جغرافیائی محل وقوع کی وجہ سے بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ اسے مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ تمام بیرونی ممالک سے تعلقات قائم کرنے اور مخالف و برسرپیکار علاقوں سے جنگ لڑنے کے لیے موزوں اور مناسب مقام تھا۔ اسلامی سلطنت کی حدود کی توسیع یہیں بیٹھ کر سوچی جاتی اور تمام اسلامی فوجوں کی رہنمائی اور امداد اسی جگہ سے کی جاتی تھی' لیکن غیر موافق حالات نے اس اہم فوجی مرکز کو فتنوں اور سازشوں کا گھر بنا دیا تھا۔ ہر بغاوت اور ہر فتنہ اسی جگہ سے اٹھتا۔ حجاج نے اس پرآشوب اور فتنہ انگیز صوبے میں برابر بیس برس تک حکومت کی اور اس کامیابی کے ساتھ کی کہ تاریخ اس کی نظیر پیش کرنے سے

قاصر ہے۔ بیس سال کی اس طویل مدت میں حجاج نے بہترین انتظامی قابلیت کا ثبوت دیا۔ تمام داخلی فتنوں کو کچل کر رکھ دیا اور سازشوں کو اس طرح دبایا کہ ان میں پھر اٹھنے کی سکت باقی نہ رہی۔ وہ فوجی قیادت میں اتنا ماہر ثابت ہوا کہ صف اول کے قائدین میں شمار ہونے لگا۔ اس کے زمانے اور اس کی نگرانی میں بے شمار علاقے فتح ہوئے جن میں سندھ، خراسان، طالقان، نسف، فرغانہ، سمرقند، بخارا، سجستان، خوارزم، ماوراء النہر، انطاکیہ اور اندلس خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

حجاج محض ایک سیاسی مبصر اور بہترین منتظم ہی نہ تھا، بلکہ بڑا جانباز فوجی سپاہی اور عسکری مدبر بھی تھا۔ عراق میں بیٹھ کر سندھ میں لڑنے والے اسلامی لشکروں کی رہنمائی کر رہا ہے۔ محمد بن قاسمؒ کو ہدایات بھیجی جا رہی ہیں۔ اتنے فاصلے پر ہوتے ہوئے بھی سپاہیوں کی نقل وحرکت پر کڑی نگرانی ہے۔ انہیں تفصیلی احکام بھیجے جا رہے ہیں۔ داخلی فتنوں اور بغاوتوں کی سرکوبی کے لیے لشکروں کی قیادت خود کرتا ہے۔ اس کی مہموں اور معرکوں کی فہرست تو بڑی طویل ہے، لیکن چند واقعات کی طرف اشارہ ضروری ہے:

داخلی فتنے:

حجاج کو مشکلات ومصائب کے پہاڑوں کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ بڑے بڑے جلیل القدر بزرگان قوم اور عالمان دین کے عتاب سے دوچار ہوا۔ مگر تمام مخالفتوں کے باوجود اس کے عزم اور ارادے میں سرمو فرق نہ آنے پایا۔ ہر مہم کے بعد اس کی ہمت اور بلند نظر آتی ہے اور ہر معرکہ اس کے ارادے کو پہلے سے زیادہ مضبوط ومحکم بنا دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حجاج نے روز اول سے ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر جمہور اور اکابر شرافت ووفاداری اور فرماں برداری کا اظہار کریں گے تو حسن سلوک اور نظر عنایت کے حق دار ٹھہریں گے اور اگر دشمنی، سرکشی اور عناد سے کام لیں گے تو تلوار اور انتقام کے مستحق ہوں گے۔ (العقد)۔ ہم دیکھتے ہیں کہ حجاج زندگی بھر اس طریق کار پر عمل پیرا رہا اور یہی لائحہ عمل اس کی کامیابی اور

بلندی کا ضامن تھا۔

٦٦ھ میں مختار بن ابی عبید ثقفی نے سرزمین کوفہ میں علم بغاوت بلند کیا۔ حجاج گھوڑوں کو اڑاتا ہوا وہاں پہنچا اور باغیوں کو مناسب سزا دی۔ ٧١ھ میں مصعب بن زبیرؓ کی لشکر کشی کی خبر پہنچی تو حجاج وہاں بھی صف آرا نظر آتا ہے۔ ٧٥ھ میں شبیب خارجی نے ایک لشکر جرار جمع کر لیا۔ نڈر حجاج نے خبر ملتے ہی اسے جا لیا۔ کئی خوں ریز معرکوں کے بعد شبیب ہزیمت خوردہ ہو کر بھاگا اور پُل سے گر کر دریا میں ڈوب مرا۔ اسی سال عبدالرحمان بن اشعث آندھی کی طرح چھا گیا۔ برق رفتاری کے ساتھ کوفہ اور خراسان پر قبضہ کر لیا۔ ان کامیابیوں اور کامرانیوں نے ابن اشعث کو اور سرکش بنا دیا۔ متذبذب اور کمزور طبیعت لوگ، جو ہر وقت کسی موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ایک جم غفیر کی شکل میں اس کے ساتھ ہو لیے۔ بھلا حجاج کیسے خاموش تماشائی بن سکتا تھا؟ محکم ارادہ لے کر اٹھا اور اس بے جگری سے لڑا کہ چند ہی معرکوں میں ابن اشعث کے دانت کھٹے کر دیے۔ ابن اشعث شکست کھا کر جان بچاتے ہوئے ترکی کی طرف بھاگ نکلا۔ حجاج نے اسے وہاں بھی آرام سے بیٹھنے نہ دیا تو خوف کے مارے مکان کی چھت سے کود کر خودکشی کر لی۔ (ابوالفداءؒ ص ر ١٩٧)

یہ چند تاریخی اشارات ہیں اور یہی وہ واقعات ہیں جن کی بنا پر لوگوں نے حجاج کو ظالم اور سفاک کے القاب سے یاد کیا۔ ذرا ایک لمحہ کے لیے سوچیے کہ ایک حکومت ہے' باضابطہ اور باقاعدہ آئینی حکومت' بالکل اسلامی حکومت۔ امیر یا خلیفہ مسلمان' رعایا مسلمان' آئین اسلامی ہے۔ جن کی شاندار فتوحات کو یاد کر کے لوگ فخر اور سربلندی محسوس کرتے ہیں۔ اس اسلامی حکومت عہد حکومت میں حجاج ایک ذمہ دار حاکم ہے۔ وہ دنیا کی واحد اسلامی حکومت کے استحکام اور بقا کی خاطر سلطنت کے نظم ونسق کو بحال کرنے اور امن عامہ برقرار رکھنے کے لیے فتنوں کو کچلتا ہے۔ سازشوں کو دباتا ہے۔ حکومت کے باغیوں کی سرکوبی کرتا ہے۔ اندرون ملک میں امن وامان بحال کر کے اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع تر کرتا چلا جاتا ہے۔ کیا ان حالات میں آپ اس کی ان خدمات کو ظلم اور سفاکی سے تعبیر کرنے میں حق

بجانب ہو سکتے ہیں؟ ایک لمحہ کے لیے فرض کیجیے کہ وہ ان تمام فرائض سے کوتاہی اور سیاسی وملکی حالات سے چشم پوشی کرتا تو کیا عدل وانصاف اور قانون وآئین کی نظر میں وہ بے وفائی بدعہدی اور غداری کا مرتکب نہ ہوتا اور کیا وہ فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کرنے اور مجرمانہ غفلت برتنے کی پاداش میں سنگین ترین سزا کا مستوجب نہ ٹھہرتا؟ آپ اپنے ضمیر کا جائزہ لیجیے، دل کو ٹٹولیے اور خود فیصلہ فرمایئے۔

حضرت سعید بن جبیرؒ کا واقعہ:

حجاج پر سب سے بڑا یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ وہ صحابہ کرام اور اکابر ائمہ تابعین سے بدسلوکی بلکہ ظلم وستم کرتا تھا۔ اس نے بڑے بڑے علمائے دین کو بھی قتل کرنے سے دریغ نہ کیا۔ اب چند لمحوں کے لیے تاریخ کے ان حقائق پر بھی بڑے سکون اور ٹھنڈے دل کے ساتھ غور کریں۔ ہمیں نہ تو حجاج کی حمایت مقصود ہے۔ نہ بزرگان دین اور صلحا واتقیا سے عداوت وکد، ہمیں تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ وہ تاریخی واقعات جن کی بنا پر ایک فیصلہ صادر کیا گیا ہے ان کی تاریخی حقیقت واصلیت کیا ہے۔ کیا وہ فیصلہ حقائق وواقعات کی روشنی میں کیا گیا ہے یا کسی خاندانی تعصب اور نسلی عداوت کی بنا پر؟ تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ خلیفہ عبدالملک بن مروان نے بعض بزرگوں کی بابت حجاج کو خاص ہدایات دے رکھی تھیں کہ ان سے ہمیشہ بہترین سلوک اور نرمی روا رکھی جائے البتہ ایک بزرگ ہیں حضرت سعید بن جبیرؒ۔ ان کے قتل کی وجہ سے ہمارے واعظ اور صوفی منش لوگ حجاج سے بہت بگڑتے ہیں اور اسے برا بھلا کہتے ہیں، لعنتیں بھیجتے ہیں، بھری محفلوں میں تبرا کہنے سے بھی نہیں چوکتے اور خدا جانے کن کن القاب اور ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آج کی صحبت میں اس حقیقت کو ضرور بے نقاب کیا جائے اور حضرت سعید بن جبیرؒ کے طرز عمل اور حجاج کے مواخذہ کو آپ حضرات کے فیصلے پر چھوڑا جائے۔

یہ درست ہے کہ سعید بن جبیرؒ بڑے متقی اور پرہیز گار انسان تھے۔ ان کی پارسائی

اور علم میں دوسرا کوئی تابعی شریک نہیں۔ یہ بھی بجا ہے کہ انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ جیسے جلیل المرتبت بزرگوں سے علم دین حاصل کیا۔ امام احمد بن حنبلؒ کا یہ فرمان بھی سر آنکھوں پر کہ سعید بن جبیرؒ اتنا رفیع الشان عالم تھا کہ کوئی انسان اس کے علم سے بے نیاز نہیں ہوسکتا تھا، مگر اس کا کیا کیا جائے کہ وہ اپنی علمی رفعت و عظمت کے باوجود عبدالرحمان بن الاشعث کے ساتھ مل کر حکومت وقت کے خلاف بغاوت کے جرم میں گرفتار ہو کر کورٹ مارشل کے بعد ۹۵ھ میں قتل کر دیے جاتے ہیں۔

حالات یوں ہیں کہ حجاج عراق کا وائسرائے ہے۔ سندھ، خراسان اور سجستان کے صوبے بھی اسی کے زیر فرمان ہیں۔ حجاج نے سعید بن جبیرؒ کو سجستان کی فوجوں میں تنخواہیں بانٹنے کا حاکم اعلیٰ یعنی (Paymaster) بنا کر بھیجا۔ عبدالرحمان بن اشعث سجستان میں اسلامی فوجوں کی قیادت کر رہا تھا۔ ابن اشعث نے حکومت کے خلاف بغاوت کر دی۔ بغاوت کی وجوہات کچھ بھی ہوں۔ یہ جرم اتنا سنگین ہے کہ کوئی قانون اور شہری آئین اس جرم کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔ سعید بن جبیرؒ نے ابن اشعث کا ساتھ دیا۔ دونوں نے مل کر ایک متوازی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی۔ اب دیکھیے کہ دونوں بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں۔ حکومت کے ملازم ہیں۔ کفار سے جنگ ٹھنی ہوئی ہے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ان حالات میں فوجی مدبر اور انصاف پسند حکومت ایسے سنگین جرم کو معاف کرسکتی ہے؟

ابن اثیر نے اپنی تاریخ الکامل (۴:۳۰) میں بیان کیا ہے کہ جب سعید بن جبیرؒ کو گرفتار کر کے حجاج کے سامنے پیش کیا گیا تو حجاج نے سعید بن جبیرؒ کو جرم کی نوعیت سے آگاہ کرنے کے لیے چند سوالات کیے اور سعید ان سوالوں کا جواب دیتے رہے۔ یہ غیر موزوں نہ ہوگا کہ اس مکالمے کا کچھ حصہ آپ حضرات کی خدمت میں پیش کروں تاکہ آپ کو فیصلہ کرنے میں آسانی ہوسکے۔

حجاج نے سعید سے مخاطب ہو کر کہا: کیا میں نے اپنی قیادت کی ذمہ داریوں میں تمہیں شریک نہیں کیا تھا؟ کیا ایک اہم سرکاری عہدہ تفویض نہیں کیا تھا؟ سعید نے اعتراف

کیا تو حجاج نے پوچھا۔ پھر یہ بغاوت کیوں؟ سعید نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ میں مسلمانوں کا ایک فرد ہوں اور مجھ سے غلطی بھی سرزد ہو سکتی ہے۔ حجاج نے پھر پوچھا کہ سعید بھلا یہ تو بتاؤ کہ جب میں نے مکہ میں عبداللہ بن زبیرؓ کو قتل کیا اور اس کے خاندان سے خلیفہ کے لیے بیعت لی تو کیا تم نے امیر المومنین عبدالملک کی وفاداری کا حلف نہیں اٹھایا تھا؟ سعید نے حلف وفاداری اٹھانے کا اقرار کیا۔ حجاج بولا جب میں عراق کا والی ہو کر کوفے پہنچا تو کیا تم سے دوبارہ امیر المومنین عبدالملک کی بیعت نہیں لی تھی۔ جب سعید نے اس کا بھی اعتراف کیا تو حجاج نے فیصلہ سناتے ہوئے کہا کہ تم نے دو مرتبہ بیعت کرنے کے بعد بھی اسے توڑ ڈالا۔ تمہارے اس جرم کی سزا قتل کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی۔

قارئین اس تاریخی شہادت کے بعد آپ چاہیں تو سعید بن جبیرؒ کے علم وتقویٰ کا پاس کرتے ہوئے حجاج کو ظالم وسفاک قرار دیں یا جرم کی نوعیت پر غور کرتے ہوئے حجاج کو حق بجانب سمجھیں، بہرکیف فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔

نفسیاتی مطالعہ:

حجاج کے ظلم وستم کی داستانیں افسانوں سے زیادہ مشہور ہو گئیں اور ہم نے کبھی نہیں سوچا کہ اس شخص کے پہلو میں پتھر کا دل ہی تھا یا ہماری طرح گوشت اور خون کا ایک ٹکڑا۔ ہم نے کبھی غور نہ کیا کہ اس شخص کی زندگی کا کوئی اور پہلو بھی ہو سکتا ہے۔ قارئین میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ حجاج کی زندگی کے دوسرے گوشے کہیں زیادہ دلچسپ اور قابل مطالعہ ہیں۔

حجاج کو انسانی نفسیات میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ وہ بڑا مردم شناس تھا۔ اور مختلف طبقوں کے مزاج کو خوب سمجھتا تھا۔ چند لمحوں میں قوموں اور آدمیوں کے مزاج کو بھانپ لیتا تھا۔ اس کے مصاحبوں میں عراقی بھی شامل تھے اور شامی بھی۔ حجاج کی مردم شناس نگاہوں نے چند عراقیوں کو منتخب کر رکھا تھا۔ اور جو کام بھی ان عراقیوں کے سپرد کیا جاتا

وہ بڑی گرمجوشی اور تندہی سے انجام دیتے۔ مسعودی نے مروج الذہب (۸:۳۸۰ تا ۳۸۱) میں ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے جو حجاج کی بصیرت اور نفسیاتی علم کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ حجاج کے شامی مصاحبوں کو یہ بات بڑی شاق گذری کہ ہر اہم کام عراقیوں کے سپرد کردیا جاتا ہے۔ وہ باتیں بنانے لگے۔ حجاج کے اس طرز عمل پر نکتہ چینی شروع ہوگئی۔ جب حجاج کو معلوم ہوا تو اس نے دونوں گروہوں کے کچھ آدمی ساتھ لیے اور صحرا کی طرف چل نکلا۔ جب کافی دور گیا تو صحرا میں اونٹوں کے ایک قافلہ پر نظر پڑی۔ حجاج نے ایک شامی مصاحب سے مخاطب ہو کر کہا جاؤ دیکھو کہ معاملہ کیا ہے اور واپس آ کر تفصیل پیش کرو۔ تھوڑی دیر کے بعد اس شامی نے واپس آ کر اطلاع دی کہ کچھ اونٹ گزر رہے ہیں۔ حجاج نے پوچھا کہ کوئی سامان لے کر جا رہے ہیں۔ شامی نے بوکھلا کر کہا یہ تو میں نے خیال نہیں کیا۔ البتہ اب جا کر دیکھ آتا ہوں پھر حجاج نے ایک عراقی کو بھیجا اور اسے وہی الفاظ کہے جو پہلے شامی سے کہے تھے' جب عراقی واپس آیا تو حجاج نے شامیوں کے روبرو پوچھا۔ تم نے کیا دیکھا؟ عراقی نے جواب دیا۔ اونٹوں کا قافلہ تھا۔ پوچھا کتنے اونٹ تھے؟ کہا کہ تیس، پوچھا کیا لے کر جا رہے تھے؟ کہا کہ تیل۔ پھر سوال کیا، کہاں سے آئے ہیں؟ اس نے جگہ کا نام بتایا۔ پوچھا کہاں جا رہے ہیں؟ اس نے پھر جگہ بتائی۔ حجاج نے اونٹوں کے مالک کا نام پوچھا تو عراقی نے وہ بھی بتا دیا۔ اب حجاج نے شامیوں سے مخاطب ہو کر کہا اہل عراق میں اتنی خوبیاں ہیں کہ میں ان لوگوں سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

حجاج بمشکل پچیس (۲۵) برس کا تھا کہ وہ سرکاری ملازم ہو گیا اور اپنی خداداد قابلیت اور طبعی ذہانت سے عراق کی گورنری کے عہدے تک جا پہنچا۔ البلاذری نے انساب الاشراف میں لکھا ہے کہ عراق کے وائسرائے کی حیثیت میں حجاج کی سالانہ تنخواہ پانچ لاکھ درہم تھی۔ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ حجاج برابر بیس سال تک اس عہدے پر فائز رہا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ وہ بڑا مالدار' کھاتا پیتا' فارغ البال اور خوش حال آدمی تھا۔

عمدہ کھانے کا شوق:

جاحظ نے تاج' ابن عبدربہ نے العقد اور مسعودی نے مروج الذہب میں بیان کیا ہے کہ بعض مسلمانوں کو عمدہ اور نفیس کھانوں کا بڑا شوق تھا۔ وہ لوگ کھانے کا بڑا اہتمام کرتے تھے۔ کھانوں کے شوقینوں کی ایک فہرست بھی درج کی ہے، جس میں امیر معاویہؓ، حجاج، عبداللہ بن زیاد، خلیفہ سلیمان بن عبدالملک اور سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ حجاج تو صدر اول کے بہترین کھانے والوں میں شمار ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس دسترخوان پر بہترین کھانے چنے جاتے تھے۔ وہ خوب مزے سے اور پیٹ بھر کر کھاتا۔ کھانے کے دوران میں بڑی دلچسپ باتیں کرتا، لطیفے کہتا، تاریخی باتوں کا تذکرہ کرتا اور کبھی کبھی عمدہ کھانے والوں کا ذکر خیر بھی کیا کرتا تھا۔

نیکی اور خداخوفی:

حجاج کا طرز عمل اس بات کی کافی ضمانت ہے کہ وہ بنوامیہ کا بڑا وفادار اور خیر خواہ تھا۔ اس کے ثبوت کے لیے کسی مزید توضیح اور شہادت کی ضرورت نہیں۔ البتہ خلیفہ منصور کی یہ رائے بھی نظرانداز نہیں کی جاسکتی۔ مسعودی رقمطراز ہے کہ عباسی خلیفہ منصور نے ایک دن دربار میں بیٹھے ہوئے حجاج کو یوں خراج تحسین ادا کیا۔ "واللہ ما رأیت رجلا انصح من الحجاج لبنی مروان" (بخدا میں نے حجاج سے زیادہ بنومروان کا کوئی خیر خواہ نہیں دیکھا) اس وفاداری اور خیر خواہی کے باوجود حجاج نیک دل مرد مومن تھا۔

اس کے پہلو میں ایسا دل تھا۔ جس میں خوف خدا اور تقویٰ بسا تھا۔ حجاج کی زندگی کا یہ پہلو بڑا دلچسپ ہے کہ وہ بڑا خداترس اور رقیق القلب انسان تھا۔ ارکان اسلام یعنی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کا بڑا پابند تھا۔ اکثر قرآن مجید کی تلاوت کیا کرتا۔ ابن اثیر نے الکامل (۴: ۱۳۲) میں اب عوف کا قول نقل کیا ہے کہ جب میں حجاج کو قرآن پڑھتے سنتا تو خیال

کیا کرتا تھا کہ وہ ہر وقت تلاوت قرآن میں مشغول رہتا ہے۔

مسعودی نے مروج الذہب (۵۹:۹۔۶۰) میں بیان کیا ہے کہ حجاج مسلسل تین برس تک یعنی ۷۲ھ، ۷۳ھ، ۷۴ھ میں حج کے موقع پر لوگوں کی قیادت اور امامت کے فرائض انجام دیتا رہا۔

البلاذری نے انساب الاشراف (ص ر ۳۷۳) میں ذکر کیا ہے کہ جب حجاج کو عبداللہ بن زبیرؓ کے معاملے سے فراغت حاصل ہوئی تو بیت اللہ شریف کی صفائی اور مرمت کی طرف توجہ کی۔ جنگ کی وجہ سے جو جگہ پتھر یا خون وغیرہ سے آلودہ ہو چکی تھی۔ اسے صاف کرایا۔ پتھر اٹھوائے اور مسجد حرام کو ازسر نو تعمیر کرایا۔ ابولفداء نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ تعمیر نو کے وقت حجاج نے اس بات کا خیال رکھا کہ مسجد حرام کا انداز اور نمونہ بالکل وہی ہو جو کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھا۔ ابن اثیر کی روایت ہے کہ جب تک حجاج زندہ رہا، امامت کے فرائض خود ادا کرتا رہا اور جب موت کا وقت قریب آ پہنچا تو اپنے بیٹے عبداللہ کو امام نماز مقرر کر دیا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ایک روایت ہے کہ جب آپ کسی قبر کو دیکھتے یا اس کا ذکر کرتے تو دل پر اتنی رقت طاری ہو جاتی کہ آپ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے۔ یہ وہ دلی کیفیت ہے جو ہر انسان کو ہر وقت میسر نہیں آ سکتی۔ ابن اثیر نے اپنی تاریخ الکامل میں بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ حجاج تقریر کر رہا تھا دوران تقریر قبر کا ذکر آ گیا۔ حجاج بار بار قبر کا لفظ دہراتا اور کہتا رہا کہ وہ تنہائی کی جگہ ہے اور وحشت کا گھر ہے۔ وہاں آدمی بالکل غریب الوطن اور بے یار و مددگار ہوگا۔ وہاں نہ تو کوئی انیس اور دوست ہوگا نہ مونس وغمگسار۔ حجاج ان الفاظ کو بار بار دہراتا خود بھی روتا اور دوسروں کو بھی رلاتا رہا۔ اگرچہ بظاہر یہ چیز معمولی سی نظر آتی ہے۔ لیکن اس کی پہنائیوں میں حجاج کے دل مضطر اور قلب متقی کے کوائف واحوال کی بے پناہ موجیں محسوس کی جاسکتی ہیں۔

خاندان ابوطالب سے حسن سلوک:

حجاج کا سیاسی ماحول کچھ اس قسم کا تھا کہ حضرت علیؓ کے خاندان کی حمایت کر کے حکومت سے وابستگی اور خوشگوار تعلقات استوار رکھنا ممکن نہ تھا۔ اس خاندان سے عداوتیں حد سے بڑھ چکی تھیں۔ خاندان ابوطالب کے کسی فرد سے حسن سلوک یا ہمدردی کرنا مستحسن نہ سمجھا جاتا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ علویوں اور ان کے رشتہ داروں کو اذیت اور دکھ سے محفوظ رکھنا بھی بہت بڑا کارنامہ تھا۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ حجاج کی پارسائی اور تقویٰ کی سب سے بڑی شہادت یہ ہے کہ اس نے حکومتوں کے اختلاف اور عداوتوں کے باوجود اپنے سارے عہد حکومت میں ابوطالب کے خاندان کے کسی فرد کو نہیں ستایا اور نہ کسی کو دکھ دیا۔ (العقد ۲:۲۶۳)

ایک دن حجاج نے کھڑے ہوکر اعلان کیا جس نے شجاعت و بہادری کا کوئی کارنامہ سرانجام دیا ہو وہ سامنے آئے ہم اسے دلیری اور جرأت کا صلہ دیں گے۔ ایک آدمی اٹھ کر کہنے لگا کہ میں نے زندگی میں ایک بڑا شاندار کارنامہ کیا ہے۔ حجاج نے اس کی نوعیت پوچھی تو اس نے جواب دیا کہ میں نے امام حسینؓ کو قتل کیا تھا۔ میرے اس کارنامے میں کسی اور شخص کو کوئی دخل نہیں ہے۔ یہ سن کر حجاج کا خون کھولنے لگا۔ لال پیلا ہوکر حجاج نے کہا میری آنکھوں سے دور ہوجا تو اور حضرت امام حسینؓ ایک جگہ اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ یہ کہہ کر اسے مجلس سے نکال دیا اور کوڑی تک نہ دی۔ (ابن الاثیر۔ الکامل: ۴:۲:۱۳)

حضرت عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب خلیفہ عبدالملک کی بے اعتنائیوں کی وجہ سے بڑے زیر بار ہوگئے۔ انہوں نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ اپنی لخت جگر ام کلثوم کا نکاح حجاج سے کر دیا جائے۔ حجاج بھی رضامند ہوگیا۔ حجاج نے اپنے سسرال سے بڑا فیاضانہ سلوک کیا۔ ان پر لاکھوں روپے خرچ کیے۔ ان کے افلاس اور تنگدستی کو خوش حالی اور فارغ البالی سے بدل دیا۔ آٹھ ماہ گزرنے کے بعد خلیفہ عبدالملک کے بیٹے ولید نے اس نکاح پر

نکتہ چینی شروع کر دی اور محاذ جنگ یہ قرار دیا کہ عربوں کی معزز ترین خاتون اور بنو عبد مناف کی سیدہ کو بنو ثقیف کے حجاج جیسے معمولی فرد سے بیاہ دیا گیا ہے۔ اس شادی کو انمل جوڑ قرار دے کر عبدالملک کو برابر اکساتا رہا اور اس وقت تک چین نہ لیا جب تک کہ حجاج کے نام خط نہ لکھوا دیا کہ ام کلثوم کو فوراً طلاق دے دو۔ (العقد' ۱:۱۹۱)

بظاہر تو حضرت عبداللہ بن جعفر کے خاندان کی سیادت کا اعتراف اور شرافت کی حفاظت اور حمایت مقصود ہے' لیکن ہوشمند لوگ سمجھتے ہیں کہ کتنے سیاسی اور نفسیاتی محرکات اس ''نیک جذبے'' کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔

حجاج کی مجبوریاں بھی ہمارے سامنے ہیں وہ خلیفہ کی حکم عدولی نہیں کر سکتا اور اگر کرے تو صرف زندگی کی نعمتوں سے ہی نہیں' بلکہ زندگی سے بھی محروم ہوتا ہے۔ بہر حال اس نے طلاق دے دی' لیکن اس مرد مجاہد کو آفرین کہنا چاہیے کہ تعلقات منقطع کر لینے کے بعد بھی بڑی مروت ، فیاض دلی اور حسن سلوک کا ثبوت دیا۔ جب تک حجاج زندہ رہا۔ ام کلثوم کے سارے اخراجات کا کفیل رہا اور جب تک عبداللہ بن جعفر زندہ رہے۔ حجاج بڑی فیاضی اور فراخ دلی سے ان کے ساتھ حسن سلوک کرتا رہا۔ (العقد' ۱:۱۱۹)

رقت قلب:

حجاج کی خدا خوفی اور رقت قلب سے متعلق ابن اثیر (الکامل' ۴: ۱۳۳۔ ۱۳۴) نے بیان کیا کہ ایک مرتبہ خلیفہ عبدالملک نے حجاج کو لکھا کہ ایک شخص اسلم نامی کے بارے میں مجھے یہ خبر ملی ہے اور ساتھ ہی یہ حکم لکھ بھیجا کہ اسلم کو قتل کر دیا جائے۔ حجاج نے اسلم کو بلایا اس نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ امیر المومنین تو تشریف فرما نہیں ہیں' مگر آپ تشریف رکھتے ہیں اللہ کا فرمان ہے کہ اے وہ لوگوں جو ایمان لائے جب کوئی فاسق تمہارے پاس کسی قسم کی خبر لائے تو اچھی طرح تحقیق کر لو۔ مقصد یہ ہے کہ امیر المومنین کو جو اطلاع پہنچی ہے وہ غلط ہے۔ آپ امیر المومنین کی خدمت میں لکھ کر بھیجیں کہ مجھ پر چوبیس عورتوں کی روزی اور

خوراک کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور وہ عورتیں باہر دروازے پر کھڑی ہیں۔آپ انہیں بلا بھیجیں۔انہیں اندر بلایا گیا تو کوئی اس کی ماں تھی کوئی خالہ، کوئی چچی، کوئی بیوی اور کوئی بیٹی۔سب سے آخر میں دس سالہ بچی داخل ہوئی۔حجاج نے چھوٹی بچی سے پوچھا کہ تم کون ہو؟ اس نے کہا کہ اللہ آپ کا بھلا کرے میں تو اس کی بیٹی ہوں۔ پھر اس بچی نے شعروں میں چند معروضات پیش کیں، جن کا مفہوم یہ ہے:

''اے حجاج! اگر تو نے اسے قتل کر دیا تو تو محض ایک آدمی کو قتل نہیں کرے گا۔

بلکہ اس کے ساتھ خاندان کے چوبیس افراد کو بھی قتل کر دے گا۔

اے حجاج! اس کے قتل کے بعد ہمارا کون کفیل ہوگا؟

اے حجاج! یا تو ہم پر احسان وکرم کر دے یا ہم سب کو اکٹھا قتل کر دے۔''

یہ سن کر حجاج کی آنکھیں آبدیدہ ہوگئیں۔اس نے سارا ماجرا خلیفہ کو لکھ بھیجا۔خلیفہ نے جواب دیا کہ اگر یہی بات ہے تو پھر اس آدمی سے حسن سلوک کیا جائے۔

سخاوت، دیانت اور پاس عہد:

حجاج بڑا دیانت دار اور امین تھا۔اسے وعدوں کا پاس تھا۔وہ ہمیشہ کوشش کرتا کہ وہ کسی کے عہد کو نہ توڑے، اسے یہ بات بھی گوارا نہ تھی کہ کوئی دوسرا آدمی بدعہدی کرے۔ البلاذری نے انساب الاشراف میں ایک واقعہ لکھا ہے جس سے حجاج کی امانت ودیانت کا پتہ چلتا ہے۔ایک شخص حجاف نامی حجاج کے پاس آیا۔قتل وخون کے سلسلے میں حجاف کے ذمہ بہت سی رقوم واجب الادا تھیں۔اس نے حجاج سے روپے مانگے۔حجاج نے کہا کہ میرے پاس اللہ کی امانت ہے۔میں اللہ کے مال میں ایک پیسے کی بھی خیانت نہیں کرسکتا۔اس نے عرض کیا کہ آپ سرکاری خزانے سے نہیں دینا چاہتے تو نہ سہی اللہ نے آپ کو بہت کچھ دے رکھا ہے آپ کی تنخواہ بڑی معقول ہے مجھے اپنی جیب خاص سے کچھ رقم عطا کر دو۔ یہ کہہ کر اس نے حجاج کی امانت ودیانت کی تعریف شروع کر دی۔ بالآخر حجاج نے اسے ایک لاکھ

درہم اپنے پاس سے دے دیے۔

حجاج کی سخاوت کا یہ حال تھا کہ ہر روز دس غریبوں مسکینوں کو کھانا کھلایا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ حجاج نے سجستان کے حاکم رتبیل سے معاہدہ کیا کہ وہ سجستان پر سات برس تک حملہ آور نہ ہوگا اور رتبیل نے وعدہ کیا کہ وہ نو لاکھ درہم کی رقم سالانہ ادا کرے۔ یہ ادائیگی نقدی کی صورت میں نہ تھی۔ بلکہ بصورت جنس تھی۔ جب معاہدے کی میعاد ختم ہوگئی تو حجاج نے اشہب بن بشیر کلبی کو سجستان کا والی مقرر کر کے بھیجا۔ اشہب نے رتبیل کو جنس کے بارے میں تنگ کرنا شروع کیا۔ رتبیل نے حجاج سے شکایت کی، حجاج نے اشہب کو معزول کر دیا۔ (فتوح البلدان ص ر ۴۰۷)۔

جب تک حجاج زندہ رہا اس کے دبدبے اور رعب وجلال کی وجہ سے اپنے پرائے سب معاہدوں اور سیاسی فیصلوں کی پابندی کرتے رہے' لیکن حجاج کی موت کے بعد وعدوں کی پابندی چنداں ضروری نہ سمجھی گئی۔ حجاج کی ہیبت اور سختی کے باوجود غیر مسلم حکمرانوں اور جمہور کو اس بات کا اعتراف تھا کہ اسے اپنے الفاظ کا بڑا پاس ہے۔ ایک دفعہ بات منہ سے کہہ دی پھر کیا مجال جو سر مو بھی انحراف ہو جائے۔ دشمن یہ بھی خوب جانتے تھے کہ وہ لشکر کشی اور مہم کو سر کرنے کے لیے روپیہ پیسہ بڑی بے دریغی اور بے جگری سے خرچ کرنے والا حاکم ہے۔

عنان حکومت یزید عبدالملک کے ہاتھ میں تھی۔ حاکم سجستان نے زر صلح ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ جب اس سے تقاضا کیا گیا تو رتبیل نے دریافت کیا کہ ان لوگوں کو کیا ہوا جو خالی پیٹ آیا کرتے تھے۔ نمازیں پڑھنے کی وجہ سے ان کی پیشانیوں پر سیاہ رنگ کے نشان پڑ گئے تھے۔ رتبیل کو بتایا گیا وہ لوگ تو موت سے ہم آغوش ہو چکے ہیں۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ وہ لوگ تم سے زیادہ ایفائے عہد اور وعدوں کو پاس کرنے والے تھے۔ وہ تم سے زیادہ بہادر اور طاقتور تھے۔ رتبیل سے پوچھا گیا کہ کیا بات ہے کہ تم حجاج کو تو زر صلح ادا کرتے تھے، لیکن ہمیں ادا نہیں کرتے۔ اس نے جواب دیتے ہوئے بڑے پتے کی بات

کہی۔ کہا کہ حجاج بلا کا آدمی تھا جب وہ کسی چیز کے حصول میں کامرانی اور فتح مندی سے ہم کنار ہوتا تو پھر وہ بڑی سے بڑی رقم خرچ ہوجانے کی مطلق پرواہ نہ کرتا۔ خواہ مہم کے بدلے میں کچی کوڑی بھی وصول نہ ہو اور تمہاری یہ حالت ہے کہ تم ایک روپیہ خرچ کر کے اس کے بدلے میں دس روپیوں کی امید رکھتے ہو۔ چنانچہ رتبیل نے بنوامیہ اور ابومسلم خراسانی کے والیوں میں سے کسی کو بھی زرِ صلح کی ایک پائی ادا نہیں کی۔ (فتوح البلدان، ص ر ۴۰۸)

جذبہ اطاعت قرآن:

دوسری گوناگوں خوبیوں کے ساتھ حجاج میں یہ خوبی بھی بڑی نمایاں تھی کہ ایک فیصلہ صادر کردینے کے بعد جب اسے قرآنی حکم معلوم ہوجاتا تو وہ فوراً قرآن مجید کے حکم کے سامنے سرتسلیم خم کردیتا۔ ایک مرتبہ سلیک بن سلکہ حجاج کے پاس آیا اور اس نے شکایت کی کہ مجھ پر فلاں شخص نے ظلم وستم کیا ہے۔ میرا مکان منہدم کردیا ہے۔ یہ سن کر حجاج نے ایک شعر پڑھا جس کا مفہوم یہ تھا کہ دنیا میں یہی دستور رہا ہے۔ قصوروار کی جگہ بے قصور پکڑا جاتا ہے اور مجرم کے بجائے معصوم انسان مارا جاتا ہے۔ اس پر سلیک نے قرآن مجید کی یہ آیت پڑھتے ہوئے کہا کہ قرآن کا ارشاد تو کچھ اور ہے:

يَا أَيُّهَا الْعَزِيزُ إِنَّ لَهُ أَبًا شَيْخًا كَبِيرًا فَخُذْ أَحَدَنَا مَكَانَهُ الآية

یعنی اے والا جاہ! اس کا باپ بوڑھا ہے اس کی بجائے ہم میں سے کسی کو پکڑ لیجیے ہم آپ کو احسان کرنے والوں میں سے سمجھتے ہیں۔ جواب ملا کہ اللہ اس بات سے ''بچائے کہ ہم کسی اور کو پکڑیں سوائے اس شخص کے جس کے پاس ہماری چیز ملی ہے ورنہ ہم تو ظالموں میں شمار ہوں گے۔'' جب حجاج نے یہ آیت سنی تو سر جھکا دیا۔ یزید بن مسلم کو بلا کر حکم دیا کہ اس شخص کے ساتھ جو جو ظلم اور زیادتی ہوئی ہے اس کا ازالہ کیا جائے۔ ساتھ ہی یہ فیصلہ بھی صادر کردیا کہ اس کا مکان تعمیر کرادیا جائے اور اعلان کردیا جائے کہ شاعر نے جھوٹ اور غلط کہا اور اللہ کی بات سچی ہے۔ (العقد، ۱:۱۱)

امن عامہ کا خیال:

حجاج کو امن عامہ کا بڑا خیال رہتا۔ اس کی ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ چوری اور ڈکیتی کی وارداتیں نہ ہونے پائیں۔ راستے پُرامن رہیں۔ عوام کی شہری زندگی خطروں سے پاک نظر آئے اور جمہور محسوس کریں کہ ان کی زندگی امن وامان سے گزر رہی ہے۔ جب کبھی کوئی چوری یا ڈکیتی کا واقعہ پیش آتا تو حجاج سنگین ترین سزا دینے سے بھی گریز نہ کرتا۔ حجاج نے خراسان کے گورنر قتیبہ بن مسلم کو خط لکھا کہ وکیع بن حسان بصرہ میں رہتا تھا۔ پھر سجستان جا کر چوری کی وارداتیں کرنے لگا۔ اب وہ خراسان میں سکونت رکھتا ہے۔ میرا یہ خط پہنچتے ہی اس کا مکان منہدم کر دو۔ (العقد' ۱:۱۷۱)

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ حجاج کو معلوم ہوا کہ چند عربوں نے راستوں کو مسافروں کے لیے مخدوش بنا رکھا ہے تو اس نے ڈاکوؤں کو لکھ کر بھیجا کہ تم لوگوں نے سمجھ رکھا ہے کہ فتنہ وفساد کوئی معمولی چیز ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ شہسواروں کا ایک دستہ بھیج کر تمہارا مال ودولت نیست ونابود کر دوں۔ تمہاری عورتوں کو بیوہ بنا دوں اور تمہارے بچے یتیم چھوڑ دوں۔ جب انہیں یہ خط پہنچا تو انہوں نے راستوں کے امن وامان کو بحال کیا اور اپنی جان بچانے کی خاطر اپنے گھروں کی راہ لی (العقد' ۱۰:۱۷)

انسانی جذبہ:

حجاج ہماری طرح کا ایک انسان تھا جب اس کے جذبات کو اکسایا جاتا اور اس کے خاندان کی بزرگی اور اس کے عہدے کی جلالت قدر کا واسطہ دیا جاتا تو درخواست کنندہ کی درخواست پر ہمدردانہ غور کرنے کے لیے آمادہ وتیار ہو جاتا تھا۔ ایک مرتبہ امام شعبی نے حجاج سے کسی چیز کے لیے درخواست کی' لیکن حجاج نے ان کی درخواست کو درخور اعتنا نہ سمجھ کر کسی دوسری فرصت پر اٹھا رکھا۔ امام شعبی نے دوبارہ لکھا مگر اس مرتبہ علم نفسیات کی روشنی میں

معروضات پیش کیں۔ تار رگ جان کو چھیڑنا تھا کہ ساز دل بجنے لگا، امام شعبی نے لکھا کہ آپ عراق کے حاکم اعلیٰ ہیں۔ حجاج کے نامور بزرگ حضرت عروہ بن مسعود ثقفیؓ کے نواسے ہیں۔ ان حقائق کی روشنی میں آپ معذور تصور نہیں کیے جاسکتے۔ یہ الفاظ پڑھ کر حجاج کا چہرہ خوشی اور مسرت سے تمتمانے لگا اور حکم دیا کہ شعبی کی حاجت فوراً پوری کردی جائے۔

(العقد ۱: ۷۷)

بحیثیت خاوند:

حجاج کی زندگی کا یہ پہلو بھی بڑا شاندار ہے کہ وہ انسانوں اور قوموں کی نفسیات کو خوب سمجھتا تھا اور وہ ہر آدمی سے گفتگو اور سلوک کرتے وقت اس کی استعداد اور رجحانات کا خاص خیال رکھتا تھا۔ بیویوں کے معاملے میں بھی وہ اسی اصول پر کاربند تھا۔

ایک دفعہ حجاج کے ہاں محفل جمی ہوئی تھی۔ عورتوں کا ذکر خیر ہونے لگا۔ حجاج نے کہا کہ میری چار بیویاں ہیں جن کے نام یہ ہیں:

(۱) ہند بنت مہلب (۲) ہند بنت اسماء (۳) ام الجلاس بنت عبدالرحمان (۴) امت الرحمان بن جریر البجلی۔ نام بتانے کے بعد ہر بیوی سے اپنا سلوک اور معاشرتی تعلقات بیان کرتے ہوئے نہایت لطیف انداز میں ہر ایک پر نفسیاتی تنقید کی، کہنے لگا کہ جب میں ہند بن مہلب کے پاس ہوتا ہوں تو میری جذباتی کیفیت اس نوجوان بدو کی طرح ہوتی ہے جو اپنے نوجوان ساتھیوں کے ساتھ مل کر خوب کھیلے کودے۔ جب ہند بنت اسماء کے پاس ہوتا ہوں تو میں شاہانہ شان وشکوہ کا مالک ہوتا ہوں اور میری حالت اس تاجدار کی طرح ہوتی ہے جو بڑے وقار اور تمکنت کے ساتھ دوسرے بادشاہ کے ساتھ بیٹھا ہوا ہو۔ جب میں ام الجلاس کے پاس ہوتا ہوں تو میری مثال اس بدو کی طرح ہوتی ہے جو دوسرے بدوؤں کی محفل میں بیٹھ کر بڑے چٹخارے لے کر شعر وشاعری کر رہا ہو۔ قصے کہانیاں اور لطائف وظرائف کہہ سن رہا ہو۔ جب میں امت الرحمان بنت جریر کے پاس ہوتا ہوں تو علم

وفقہ کے چرچے ہوتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک عالم دوسرے علما اور فقہا کی مجلس میں بیٹھے باتیں کر رہا ہے۔ (العقد، ۳: ۳۲۳)

اصلاحات:

حجاج کے شاندار کارناموں کی فہرست بڑی طویل ہے۔ وہ بڑا مہربان اور وفادار شخص تھا۔ وہ غریبوں اور محتاجوں کا ہمیشہ خیال رکھتا۔ اس نے داخلی اور خارجی فتنوں کا سد باب کیا۔ اسلامی فتوحات کے سلسلے کو وسیع سے وسیع تر کر دیا۔ حجاج پہلا حاکم تھا جس نے درہم پر قل ھو اللہ احد لکھا۔ صحابہ کے بعد وہ پہلا آدمی تھا جس نے فوجی ضرورتوں اور عسکری مصلحتوں کے پیش نظر شہر واسط کی بنیاد رکھی۔

وہ بڑا غیرت مند اور بہادر انسان تھا۔ مسلمان عورتوں کی عصمت بچانے اور انہیں ڈاکوؤں کے پنجے سے رہائی دلوانے کی خاطر سندھ پر لشکر کشی اور ستر لاکھ درہم خرچ کر کے انہیں غیر مسلموں کے ہاتھ سے نجات دلائی۔

حجاج حسابات کی باقاعدگی کا بڑا خیال رکھتا اور پڑتال وغیرہ کے معاملے میں بڑا محتاط تھا۔ اس سلسلے میں یہ بات بڑی ضروری تھی کہ حسابات ایسی زبان میں لکھے جائیں جو ہر آدمی کے لیے قابل فہم اور آسان ہوں۔ حجاج کے وقت تک عراق کی آمد و خرچ کا حساب فارسی زبان میں لکھا جاتا تھا۔ حجاج نے عراق کے انتظامات کی باگ ڈور ہاتھ میں لیتے ہی زادان فرخ اور صالح بن عبدالرحمان کے تعاون سے دیوان عراق کو عربی زبان میں منتقل کر دیا۔

وہ عربوں کے وقار اور عربی کا بڑا حامی تھا اور عربی زبان تو اس کے احسان سے کبھی عہد برآ نہیں ہو سکتی۔ حجاج کے اپنے زمانے تک یہ رواج تھا کہ عربی لکھتے وقت نقطے اور زیر، زبر، پیش وغیرہ مفقود ہوتی تھیں لیکن حجاج نے عوام کی سہولت کو مدنظر رکھتے ہوئے قرآن مجید کے پڑھنے کو آسان بنا دیا۔ اس پر زبریں، زیریں اور پیشیں وغیرہ لگا دیں۔ نقطے لکھ دیے

اور قرآن مجید کی اشاعت میں بہت حصہ لیا۔

ملکی امن وامان قائم رکھنے کے ساتھ ساتھ حجاج کو اس بات کا بڑا شوق تھا کہ ملک ترقی کی طرف گامزن ہو۔ وہ ہر وقت جمہور کی فلاح وبہبود کی فکر میں رہتا۔ چنانچہ زراعت کی ترقی کے لیے نہریں کھودیں۔ پرانی نہروں بالخصوص نہر دجلہ وفرات کو مرمت کر کے نئے سرے سے جاری کیا۔ بہت سی نئی نہریں تیار کرائیں۔

حجاج کو زرعی ثروت اور پیداوار کو بڑھانے کا بڑا خیال رہتا تھا۔اس مقصد کے پیش نظر نہریں بنوانے کے علاوہ حجاج نے یہ حکم نافذ کر دیا کہ کوئی شخص کھیتی باڑی چھوڑ کر شہری زندگی اختیار نہ کرے، تاکہ زرعی پیداوار میں کمی نہ ہونے پائے۔

حجاج نے عراق میں نیا بندوبست جاری کیا۔ زمینوں کی پیمائش کر کے ہر شخص کی زمین کی حدود مقرر کر دیں۔

حجاج نے بہت سی بے آباد زمینوں کو آباد کر کے کھیتی باڑی شروع کرادی۔ جوہڑوں اور زیر آب زمینوں کو خشک کرانے کے بعد انہیں قابل زراعت بنا کر ملک کی پیداوار میں معتد بہ اضافہ کیا۔

عراق کے شہروں میں یہ دستور تھا کہ ہر شہر کے ناپ اور تول الگ الگ تھے۔حجاج نے حکم نافذ کر کے سارے عراق کے پیمانے، ترازو اور باٹ ایک جیسے مقرر کر دیے۔

حجاج نے شہروں کی صفائی اور لوگوں کی صحت کے لیے کئی قانون بنائے۔اس نے شہر واسط کے بازاروں اور گلی چوکوں میں پیشاب کرنے کی ممانعت کر دی اور خلاف ورزی کرنے والے کو قید کی سزادی جاتی تھی۔شہر میں آوارہ کتے قتل کرادیے گئے۔

حجاج نے فوج میں بھرتی کے لیے عمر مقرر کر دی۔ وہ عمر رسیدہ اور کمزور لوگوں کو بھرتی نہ کیا کرتا تھا۔حجاج فوج کے لیے نوعمر، تندرست اور تنومند جوانوں کو پسند کیا کرتا تھا۔ بھرتی کے وقت حجاج امیدواروں کے کپڑے اتروا کر انہیں ادھر اُدھر دوڑاتا اور جسمانی صحت کا بڑی سختی سے امتحان لیتا تھا۔

ملکی امن و امان کو بحال رکھنے کے لیے حجاج نے سرزمین عراق میں کرفیو آرڈر نافذ کرتے ہوئے یہ حکم دیا تھا کہ کوئی شخص نماز عشاء اور نماز فجر کے درمیان گھر سے باہر نہ نکلے۔ خلاف ورزی کرنے والوں کی سزا موت تھی۔

حضرت ابن زبیرؓ نے یزید کے عہد حکومت میں کعبہ کو ازسرنو تعمیر کرتے ہوئے اس کی عمارت میں توسیع کرادی۔ بڑے بڑے ستون بنائے، اس کی دیواروں کو گلکاری اور پچکاری سے مزین اور خوشنما بنا دیا۔ حجاج کے نزدیک ابن زبیرؓ کی تعمیر و توسیع اور تزئین سے کعبہ کی تاریخی اور اثری اہمیت کم ہو جاتی تھی۔ چنانچہ حجاج نے کعبہ کی عمارت کو گرا کر عہد نبوی کے طرز پر دوبارہ تعمیر کیا۔

اسی طرح حجاج نے مدینہ شریف میں بنو مسلمہ کی بستی میں ایک مسجد تعمیر کرائی۔ حجاج کی قابلیتوں اور کامیابیوں کو دیکھ کر لوگ اسے ساحر و جادوگر کہنے لگے۔ بعض لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ حجاج کو اسم اعظم معلوم ہے۔

مختصر یہ کہ حجاج کے کارنامے اتنے شاندار، اس کا کردار اتنا بلند اور اس کی خدمات اتنی زیادہ ہیں کہ اسلامی تاریخ اور عربی ادب اس کے احسانات سے کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ اس کی قابلیت، ہنرمندی اور ذہنی و انتظامی خوبیوں کا اعتراف اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ خلیفہ منصور عباسی جیسا دانشمند اور لائق حکمران یہ آرزو کرتا ہے کہ کاش مجھے حجاج جیسا انسان مل جائے جو حکمرانی اور انتظام سلطنت میں میرا ہاتھ بٹائے۔

تاریخ اسلام کا ایک عظیم مدبر:
حجاج بن یوسفؒ

شرف الدین یکتا جودھپوریؒ

از: شرف الدین یکتا جودھپوریؒ

تاریخ اسلام کا ایک عظیم مدبر: حجاج بن یوسفؒ

پہلی صدی ہجری اپنی نو دہائیاں پوری کر کے دسویں میں داخل ہو چکی تھی۔ دولت بنی امیہ کی عظمت وجلال کا آفتاب نصف النہار پر تھا کہ ظلمت کدۂ سندھ سے ملت بیضا کی ایک مظلوم بیٹی نے جو اپنے بہت سے ہم مذہب فرزندان توحید کے ساتھ قید وبند کے مصائب جھیل رہی تھی۔ ایک آواز بلند کی "اغثنی یاحجاج! اغثنی یاحجاج!"، پستی سے بلند ہونے والی یہ آواز دور، بہت دور قصر خلافت کی بلندیوں سے جا ٹکرائی اور ان کو ہلا ڈالا۔ سچ کہا ہے کسی نے ؎

بترس از آہ مظلوماں کہ ہنگام دعا کردن
اجابت از درحق بہر استقبال می آید

اس پکار پر جس فرزند توحید نے لبیک کہا اس نے برصغیر پاک وہند کی تاریخ بدل کر رکھ دی۔ یہ تھا خلافت بنی امیہ کا وہ فقید المثال مدبر جو تاریخ عالم میں حجاج بن یوسف کے نام سے مشہور ہے۔ اہل سیر نے اس عظیم مدبر کے حالات ضبط تحریر میں لاتے وقت کچھ انصاف سے کام نہیں لیا۔ اس کو محض ایک انتہا پسند سخت گیر جرنیل بلکہ ایک ظالم وجابر حکمراں کے طور پر پیش کیا ہے۔ وجہ ظاہر ہے۔ بیشتر تاریخیں ان ارباب اقتدار کے دور میں لکھی گئیں جنہوں نے اپنے اقتدار کی اساس بنی امیہ کی لاشوں پر رکھی تھی۔ مؤرخین نے اپنے

نئے آقاؤں کو خوش کرنے اور ان کی زیادتیوں کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے بنی امیہ کے اچھے لوگوں کو بھی بدنام کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ تاہم اس کے باوجود وہ ان کے محاسن کو یکسر نظر انداز بھی نہ کر سکے جو قدرت نے ان عظیم ہستیوں کو ودیعت کیے تھے۔ اگر ہم تھوڑی دیر کے لیے تعصب کی عینک اتار کر اس عہد کی تاریخ کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کریں تو پوری حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی۔ اور ہم اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ **خیر القرون** کے بعد **ثم الذین یلونھم** کے بمصداق عہد بنی امیہ تاریخ اسلام کا زریں عہد تھا۔ چنانچہ محققین تاریخ نے دقت نظر اور تجسس و تفحص سے کام لے کر تاریخ و سیر کے دفتر کو کھنگالا ہے۔ اور دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دیا ہے۔ اس سعئ مشکور میں عہد حاضر کے محققین اور دور ماضی کے مؤرخین سب ہی شامل ہیں۔ ان حالات کی روشنی میں ہم نے اس مختصر مقالے میں حجاج بن یوسف کی شخصیت پر کسی قدر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

حجاج کی زندگی کے ابتدائی حالات:

پورا نام ابو محمد الحجاج بن یوسف الثقفی ہے۔ وہ قبیلۂ بنو ثقیف کی شاخ احلاف سے تعلق رکھتا تھا۔ مؤرخ ابن اثیر نے اس کا شجرۂ نسب یوں بیان کیا ہے۔ حجاج بن یوسف بن حکم بن عقیل بن عامر بن مسعود بن معتب بن مالک بن کعب بن عمرو بن سعد بن عوف بن ثقیف۔ مشہور روایت کے مطابق یہ نامور شخص طائف میں ۴۱ھ مطابق ۶۶۱ء میں ناداری و گمنامی کی حالت میں پیدا ہوا۔ تاریخ الکامل ابن اثیر میں اس کا سال ولادت ۴۲ھ مطابق ۶۶۲ء بعہد خلافت امیر معاویہؓ لکھا ہے۔ اس کے آباواجداد بہت غریب تھے اور سنگ برداری و معماری سے کسب معاش کرتے تھے۔ ابتدائی تعلیم اس نے اپنے باپ کے سایۂ عاطفت میں رہ کر اپنے آبائی وطن طائف میں حاصل کی۔ شروع ہی سے عالی حوصلہ اور بلند ہمت تھا۔ ذکاوت و ذِیرکی میں اپنی مثال آپ تھا۔

بالائے سرش زہوشمندی

می تافت ستارۂ بلندی

ابتدائی زندگی کے حالات تاریکی میں ہیں۔ مشہور اس وقت ہوا جب امیر المومنین خلیفہ عبدالملک بن مروانؒ کے عملۂ ملازمت میں شامل ہوا۔ یہ زمانہ وہ زمانہ تھا جب خلافت اسلامیہ کو گوناگوں مخالفتوں اور فتنہ انگیزوں کی تخریب کاریوں کا مقابلہ کرنا پڑ رہا تھا۔ ایک طرف خارجی تھے۔(۱) دوسری طرف وہ سبائی فتنہ پرداز تھے جنہوں نے امیر المومنین سیدنا عثمان ذوالنورینؓ کے عہد خلافت میں سر اٹھایا تھا اور ان کی مظلومانہ شہادت کا موجب بنے تھے اور ان کے بعد سیدنا علیؓ کو بھی ایک دن چین سے نہیں بیٹھنے دیا تھا۔ ان دونوں مفسدہ پرداز گروہوں کی شورشوں کا اڈا عراق تھا۔ اُدھر سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ کی مرکز گریزی بھی کچھ کم نہیں تھی جو مکہ میں کوسِ لمن الملک بجا رہے تھے۔ بلکہ دیکھا جائے تو ان کی تحریک مرکز خلافت اور اتحاد امت کے لیے سب سے بڑا خطرہ تھی۔ یہ مشکلات تھیں جن میں عبدالملک بن مروانؒ کی خلافت گھری ہوئی تھی۔ اور جن سے بہرحال نپٹنا سیاست وقت کا اہم تقاضا تھا۔

حجاج دربار خلافت میں:

ان مشکلات پر قابو پانے کے لیے خلیفہ اسلام کو ایسے مدبر سیاست داں کی تلاش تھی

۱۔ جنگ صفین کے بعد حضرت علیؓ کی جماعت سے الگ ہو کر خود حضرت علیؓ کے درپے آزار ہو گئے تھے۔ اگرچہ حضرت علیؓ نے نہروان کی جنگ میں انہیں شکست دے کر بے حد کمزور کر دیا تھا تاہم وہ اپنی ریشہ دوانیاں جاری رکھے رہے یہاں تک کہ ایک بدبخت خارجی عبدالرحمن بن ملجم نے حضرت علیؓ کو شہید کر کے اپنا نامۂ اعمال سیاہ کیا اور خود بھی کیفر کردار کو پہنچا۔ اس حادثہ کے بعد بھی خارجیوں کی شرانگیزیوں کا سلسلہ جاری رہا۔ حضرت امیر معاویہؓ نے اپنے تدبر سے انہیں دبائے رکھا۔ لیکن ان کے بعد وہ پھر اُبھر آئے اور خلفائے بنی امیہ کے لیے دردسر بن گئے۔

جو سیاسی سوجھ بوجھ میں فرد اور عزم وثبات میں یگانہ ہو۔ ساتھ ہی عسکری مہمات کو سرانجام دینے کی اہلیت رکھتا ہو۔ حجاج میں یہ صفات بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ امیر المومنین کی مجلس شوریٰ کے ایک اہم رکن ابوزراعہ روح بن زنباع الجذامی کی وساطت سے حجاج دربار خلافت میں پہنچا۔ سب سے پہلے اس کو شرطہ (پولیس) میں ملازمت ملی۔ وہاں سے منازل ترقی طے کرکے فوج کے اہم مناصب تک جا پہنچا۔

فوجی خدمات اور فتوحات:

یہاں فوجی شعبہ میں داخل ہونے کے بعد حجاج کے جوہر کھلے۔ اس نے اپنی انتظامی صلاحیتیں بروئے کار لاکر اس فوج کے باغی اور سرکش گروہوں میں نظم وضبط بحال کیا۔ جو عراق میں مصعب بن زبیر سے لڑنے کے لیے روانہ ہونے والی تھی۔ مصعب بن زبیر حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے بھائی تھے۔ اور ان کے نکاح میں سیدہ سکینہ بن حسینؓ تھیں۔ حجاج نے اس کٹھن مہم کو اس خوش اسلوبی سے سرانجام دیا کہ اس کی شہرت کو چار چاند لگ گئے۔ ۷۲ھ مطابق ۶۹۱ء میں دُجیل پر مسکن کے مقام پر مصعب کو مکمل شکست دی۔ بعدازاں دوہزار شامیوں کو لے کر حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے مقابلے کے لیے کوفہ سے مکہ روانہ ہوا۔ اپنے مولد طائف پر بغیر کسی مزاحمت کے قبضہ کرلیا۔ پھر عبداللہ بن زبیرؓ سے گفت وشنید شروع کی تاکہ بغیر کسی تصادم کے ان کو راہ راست پر لاکر بیعت خلافت قائمہ پر آمادہ کرے مگر اس میں اس کو کامیابی نہیں ہوئی۔ مجبوراً مکہ کا محاصرہ کرنا پڑا۔ اس اثنا میں ابن زبیرؓ کے اکثر ہواخواہ اور دو بیٹے ان کا ساتھ چھوڑ کر حجاج سے آملے۔ ابن زبیرؓ کے ساتھ صرف ان کا چھوٹا بیٹا اور چند وفادار ساتھی رہ گئے۔ دونوں گروہوں کا مقابلہ ہوا۔ اس میں زبیرؓ مردانہ وار لڑتے ہوئے خانۂ کعبہ کے قریب قتل ہوگئے۔ حجاج نے اس فتح پر اپنی فوج میں اعلان کیا کہ نعرۂ تکبیر بلند کیا جائے۔ چنانچہ بروایت ابن اثیر مکہ کی گلیاں نعرۂ تکبیر سے گونج اٹھیں۔ اس پر ایک صحابیؓ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''اللہ اللہ کیا عظیم شخصیت عبداللہ

بن زبیرؓ کی تھی کہ جب پیدا ہوئے تو مدینہ کی گلیاں نعرۂ تکبیر سے گونج اٹھی تھیں۔ اور جب قتل ہوئے تو اسی صدائے تکبیر کی بازگشت مکہ کی گلیوں میں سنائی دی۔'' یہ واقعہ جمادی الاولیٰ ۷۳ھ (اکتوبر ۶۹۲ء) میں پیش آیا۔ ابن زبیرؓ کی حکومت کے خاتمہ کے بعد خلافت کی وحدت بحال ہوگئی۔ بعض مؤرخین نے ۷۳ھ کے سال کو ''وحدت کا سال'' کہا ہے۔ امیر المومنین نے اظہار تشکر کیا اور حجاج کو یمن اور یمامہ کا گورنر بنا دیا۔ ۷۳ھ اور ۷۴ھ میں حجاج نے امیر حج کی حیثیت سے حج کی قیادت کی اور خانہ کعبہ کی بحالی اس کی اصلی بنیادوں پر کی جیسی کہ ابن زبیرؓ کے تسلط سے پہلے تھی۔ حجاز میں امن وامان بحال ہوگیا۔

۷۵ھ مطابق ۶۹۴ء میں امیر المومنین کے بھائی بشر بن مروانؒ جو عراق کے گورنر تھے انتقال کر گئے۔ یہ عہدہ حجاج کو تفویض ہوا۔ خارجیوں اور سبائیوں کی مسلسل ریشہ دوانیوں کے باعث عراق کی گورنری اسلامی ریاست کا سب سے اہم اور ذمہ دارانہ انتظامی عہد تھا۔ ابن جریر طبری لکھتے ہیں کہ حجاج نے ۳۳ برس کی عمر میں ۷۵ھ کے آغاز میں یہ گورنری سنبھالی۔ اسی سال رمضان میں اس کا ورود کوفہ میں ہوا جہاں اس نے وہ خطبہ دیا جو عربی ادب میں ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ حجاج کا یہ خطبہ اس کے پیش روز یاد بن ابیہؒ کے بصرے کے مہتم بالشان خطبے سے کم مشہور نہیں۔ عراق میں حجاج کے لیے سب سے ضروری کام کوفے اور بصرے کے فوجی دستوں میں نظم وضبط بحال کرنا تھا۔ جو اس نے بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ کہیں درشتی سے کام لیا کہیں نرمی سے۔ لوگوں کو قلیل تنخواہوں کی شکایت تھی۔ اس نے بنفس نفیس امیر المومنین سے مل کر اس شکایت کا ازالہ کیا اور تنخواہیں بڑھا دی گئیں۔

عراق میں سازشی عناصر ہنوز مملکت اسلامیہ کے لیے دردسر بنے ہوئے تھے۔ ایک جگہ بغاوت کی آگ فرو ہوتی تھی تو دوسری جگہ اس کے شعلے بھڑک اٹھتے تھے۔ اب اس نے پوری توجہ ان کے استیصال کی طرف مرکوز کر دی۔ ۷۷ھ مطابق ۶۹۶ء میں ازارقہ کی بغاوت کو کچلا اور ان کے سردار قطری بن فجاۃ کو شکست دی۔ اسی سال ایک اور خارجی

سردار شبیب بن یزید نے موصل میں علم بغاوت بلند کیا۔ اس کو کئی خطرناک پسپائیوں کے بعد خوزستان میں دجیل کے مقام پر شکست دی۔ انہیں دنوں مدائن کا گونر مطرف جو مشہور صحابی رسول حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کا بیٹا تھا۔ خارجیوں کی سازش میں شریک ہو گیا اور بغاوت کردی۔ مگر بری طرح ہزیمت اٹھا کر مقتول ہوا۔ ان معرکوں میں حجاج کا ممد و معاون مہلب سا تجربہ کار سالار تھا۔

عراق میں خارجیوں اور دوسرے فتنہ پرداز عناصر کا سر کچلنے میں حجاج نے بڑا اہم کردار ادا کیا اور ان کے سرکردہ افراد کو موت کے گھاٹ اتار کر دم لیا۔ ۷۸ھ کے موسم بہار تک وہ پورے عراق کو خارجیوں اور سبائی فتنہ پردازوں سے پاک کر چکا تھا۔ اب خراسان اور سجستان کی عملداری بھی اس کو سپرد کر دی گئی خراسان کا انتظام مہلب کو سونپا سجستان کی حالت اطمینان بخش نہیں تھی وہاں کے سرکش لوگوں کو از سر نو مطیع کر کے امن و امان بحال کرنا تھا۔ اس کے لیے اس کی نظر انتخاب ایک آزمودہ کار جرنیل عبدالرحمن بن الاشعث پر پڑی۔ جو اِن دنوں کرمان میں تھا۔ اس کو کرمان سے بلا کر اور ایک مسلح فوج کا قائد بنا کر سجستان بھیجا۔ اہل سیر لکھتے ہیں کہ حجاج کا یہ اقدام ایک ایسے انقلاب کا پیش خیمہ تھا جو سابقہ انقلابوں سے کہیں زیادہ خطرناک تھا اور جو نہ صرف حجاج بلکہ اہل شام کے غلبے کے بھی خلاف تھا۔ اور اس طرح خود خلیفہ اور اموی حکومت کے خلاف تھا۔ یہ موقع ملتے ہی عبدالرحمن کے دل میں حصول اقتدار کی خواہش پرورش پانے لگی۔ اس نے یہ مہم بڑی احتیاط اور ہوشیاری سے چلائی جو علاقہ فتح ہوتا وہاں امن و امان بحال کرتا' اپنے حامیوں کی تعداد بڑھاتا اور حجاج کی جنگجوئی کے خلاف نفرت کی آگ بھڑکاتا رہا۔ حجاج کو اپنی غلطی کا احساس ہوا مگر بہت بعد کو ہوا جب کہ عبدالرحمن کی فوج کی تعداد ایک لاکھ کے لگ بھگ ہو گئی تھی۔ اب عبدالرحمن نے اس بھاری فوج کو لے کر کوفے اور بصرے پر حملہ کر دیا۔ اور بصرے کے نواح میں گورنر کا محاصرہ کر لیا۔ حجاج کی خوش قسمتی تھی کہ امیرالمومنین کے دو بیٹے ایک بھاری عسکری جمعیت کے ساتھ اس کی مدد کو پہنچ گئے۔ اور ایک خونریز معرکے کے بعد

عبدالرحمن بن الاشعث کو ۸۲ھ مطابق ۷۰۱ء میں عبرتناک شکست دی۔عراق کی یہ آخری بغاوت تھی۔جو کامیابی سے کچل دی گئی۔اور ملک میں امن وامان قائم ہو گیا۔

۸۳ھ مطابق ۷۰۲ء میں حجاج نے کوفے اور بصرے کے درمیان ایک قلعہ بند شہر واسط تعمیر کرایا۔اور یہاں خود سکونت اختیار کی۔اب حجاج پورے ممالک شرقیہ کا گورنر تھا۔

عبدالملک کی وفات اور ولید کی خلافت:

۸۶ھ مطابق ۷۰۵ء میں امیر المومنین عبدالملک کا انتقال ہو گیا۔ان کی جگہ ان کے لڑکے ولید بن عبدالملک سریر آرائے خلافت ہوئے۔یہ بھی حجاج کی بہت قدر کرتے تھے۔ اور اس کا اپنا محسن سمجھتے تھے۔کیوں کہ حجاج نے ان کی جانشینی کی حمایت کی تھی۔

امیر المومنین ولید کے دور کی ساری فتوحات حجاج بن یوسف کی مساعی کی مرہون منت ہیں۔قتیبہ بن مسلم،موسیٰ بن نصیر اور مجاعہ بن سعر اسی دور کے جرنیل تھے۔جنہوں نے خلافت اسلامیہ کو وسیع تر کرنے میں حیرت انگیز اور قابل فخر کارنامے انجام دیے جن کی مثال تاریخ عالم میں ڈھونڈنے سے نہیں ملتی۔ یہ دنیائے اسلام کے ممتاز سپہ سالار تھے جنہیں حجاج نے بڑی دانشمندی سے کام لے کر ان کی غیر معمولی صلاحیتوں اور اعلیٰ قابلیتوں کی بنا پر معین کیا تھا۔گو اس نے مہمات میں جو اُن سالاروں کے سپرد کی گئی تھیں بذات خود حصہ نہیں لیا لیکن وہ ان کے لیے بڑی احتیاط سے تیاری کرتا تھا۔اور ان کے اخراجات کے لیے سرمایہ فراہم کرنے سے دریغ نہیں کرتا تھا۔اسلامی ریاست کا استحکام اور اس کے حدود کی توسیع اس بیدار مغز جرنیل کی نظر میں وہ اعلیٰ مقاصد تھے جن کے حصول کے لیے وہ بھاری سے بھاری اخراجات کو بھی بطیب خاطر برداشت کرتا تھا اور کبھی پیچھے نہیں ہٹتا تھا۔

معرکۂ سندھ:

حجاج کے عہد میں انجام پانے والے کارناموں میں ایک عظیم کارنامہ ہندوستان پر

حملہ کر کے خطہ سندھ کو ممالک محروسہ اسلامیہ میں شامل کرنا ہے۔جس کی طرف اس مقالے کے شروع میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔ یہ معرکہ حجاج کے جواں سال ابن عم اور داماد محمد بن قاسمؒ نے انجام دیا۔اس کے محرک وہ الفاظ تھے جو ملت اسلامیہ کی ایک عظیم بیٹی کے منہ سے نکلے تھے۔ اور جو قید سے فرار ہو کر آنے والے چند قیدیوں نے حجاج کے کانوں تک پہنچائے تھے۔معاً اس کے ذہن میں ارشاد خداوندی کے یہ الفاظ گونجنے لگے:

> ''اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں ان کمزور مردوں اور عورتوں اور بچوں کے لیے جنگ نہیں کرتے جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہمیں اس بستی سے نکال جہاں کے لوگ بڑے ظالم و جفا کار ہیں اور ہمارے لیے اپنی طرف سے کسی کو حامی اور اپنی طرف سے کسی کو مددگار مقرر فرما۔''
>
> (النساء:۷۵)

ارباب سیر کا بیان ہے کہ یہ فریاد سُن کر حجاج کی آنکھیں اشک آلود ہو گئیں۔اور وہ فوراً مظلوموں کا انتقام لینے کے سندھ پر حملہ کرنے کے لیے آمادہ ہو گیا۔ایک فاضل مؤرخ نے اس مہم عظیم کے لیے محمد بن قاسمؒ کے انتخاب پر حجاج کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے۔

> ''ہند کی مہم عظیم جو محمد بن قاسمؒ کے حوالے ہوئی اس میں ہم نہیں کہہ سکتے کہ حجاج کی اس قرابت کو جو اس بہادر نوجوان کے ساتھ تھی کتنا دخل تھا۔اور اس کی فرزانگی و دلاوری کا کتنا اثر۔مگر اس تقرر میں خواہ اس کا کچھ ہی سبب ہو حجاج کے پرلے درجے کی دانائی اور روشن ضمیری معلوم ہوتی ہے۔کہ اس نے فتح ہند کے واسطے ایسا شخص منتخب کیا جو ہر طرح اس کام کے لیے موزوں تھا۔''

یہ معرکہ ۹۳ھ میں سر ہوا اور پورا سندھ مملکت اسلامیہ کا ایک حصہ قرار پایا۔

حملہ ہند کے بارے میں بشارت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم:

تاریخ الکبیر بخاری، مسند احمد اور مستدرک حاکم میں دو روایتیں منقول ہیں جن میں معرکہ ہند میں شریک ہونے والوں کو آتش دوزخ سے آزاد ہونے کی بشارت دی گئی ہے۔ وہ روایتیں یہ ہیں۔

مسند احمد اور تاریخ الکبیر بخاری میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ ہم سے جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہندوستان سے جنگ (غزوۂ ہند) برپا ہونے کا وعدہ فرمایا' چنانچہ (ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ) اگر میں اس جنگ کے زمانے میں موجود ہوا تو اس میں جان و مال کے ساتھ شرکت کروں گا۔ اگر مارا گیا تو افضل ترین شہیدوں میں میرا شمار ہوگا۔ اور اگر زندہ واپس آ گیا تو جہنم کی آگ سے آزاد ابو ہریرہؓ کہلاؤں گا۔

مستدرک حاکم میں ایک دوسری روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میری امت کی دو جماعتیں ایسی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں دوزخ کی آگ سے آزاد کر دیا ہے، ایک وہ جو اہل ہند کے ساتھ لڑائی کرے گی اور دوسری وہ جو دجال کے مقابلے میں حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کے ساتھ ہوگی۔

اس بشارت کی مستحق وہ مبارک ہستیاں تو ضرور ہیں جو بالذات اس جنگ میں شریک ہوئیں جو محمد بن قاسمؒ کی سرکردگی میں سرزمین سندھ پر لڑی گئی۔ مگر اس سعادت میں کچھ حصہ حجاج بن یوسف کا بھی ہے۔ جس کے زیر اہتمام معرکہ سندھ سر ہوا۔ حجاج نے اگرچہ براہ راست اس مہم میں حصہ نہیں لیا لیکن وہ اس کے لیے بڑی دانشمندی اور تدبر سے تیاری کرتا رہا اور مناسب ہدایات دیتا رہا۔ چنانچہ یہ کہنا خلاف واقعہ نہ ہوگا کہ وہ اس جنگ کا ہیرو تھا۔

سندھ کی مہم کے سلسلہ میں حجاج بن یوسف اسی طرح متفکر رہتا تھا جس طرح حضرت عمر فاروق اعظمؓ قادسیہ کی جنگ کے موقع پر پریشان رہتے تھے۔ اس نے یہ انتظام کر رکھا

تھا کہ ہر تیسرے چوتھے دن اسے یہاں کی خبریں ملتی رہیں۔ اس نے اپنے اوپر خورد وخواب حرام کر رکھا تھا۔ اور اس کی توجہ برابر اسی طرف رہتی تھی کہ اس مہم کا کیا انجام ہوتا ہے۔ چنانچہ جب اس کو اس سرزمین کی فتح کی اطلاعیں ملتیں تو اُس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہتا تھا۔

داخلی اصلاحی اور ترقیاتی اقدامات:

جنگی مہمات سے فارغ ہونے اور بغاوتوں کا خاتمہ کر کے ملک میں امن وامان بحال کرنے کے بعد حجاج نے ملک کی خوش حالی میں اضافے کی طرف توجہ دی جو بیس سال تک جنگ میں ملوث ہونے کی وجہ سے بری طرح متاثر ہوئی تھی۔ زراعت کو فروغ دینے کے سلسلے میں اس نے بہت سی اصلاحات کیں۔ دجلہ اور فرات پر بند بنوائے اور آبپاشی کے نظام کو بہتر بنایا۔ ممتاز عربوں کو جاگیر کے طور پر غیر مزروعہ اراضی عطا کیں۔ وہ دیہاتی لوگوں کے شہروں میں انتقال کے خلاف تھا کیوں کہ اس سے زراعت کی ترقی رک جانے کا اندیشہ تھا۔ اس کی روک تھام کے لیے اس نے مناسب اقدامات کیے۔

اب تک مملکت میں بازنطینی اور ساسانی سکے رائج تھے۔ اس نے خالص عربی سکے رائج کیے اور اس مقصد کے لیے کوفہ اور واسط میں ٹکسالیں قائم کیں۔ اس کا یہ اقدام نقود کی گردش اور اقتصادی حالات کے استحکام میں ممد و معاون ثابت ہوا۔ اس نے محاصل کے دیوان کا، جو اَب تک فارسی میں تھا، عربی میں ترجمہ کروایا تاکہ محاصل کا وہ خود مطالعہ کر سکے۔

حجاج کی وفات:

حجاج، عبدالملک بن مروان اور ان کے جانشین ولید بن عبدالملک کے عہد خلافت میں وفاداری اور جانفشانی سے امور مملکت انجام دیتا رہا۔ ہر دو جلیل القدر خلفا اس کی حسن

خدمات کے معترف وقدردان رہے۔ کثرت کار اور عظیم مہمات کی سرانجام دہی میں غیر معمولی مصروفیت نے اس کی صحت پر برا اثر ڈالا اور قبل از وقت بڑھاپے کے آثار پیدا ہونے لگے۔ باون برس کی عمر کچھ زیادہ نہیں ہوتی مگر اس سن کو پہنچ کر وہ کافی ضعیف ہو گیا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ اپنے محسن وقدرشناس خلیفہ امیر المومنین ولید کے بعد اس دنیا میں نہ رہے کیوں کہ بعد میں ہونے والے خلیفہ سلیمان بن عبدالملک سے اس کو کچھ اچھی توقعات نہیں تھیں۔ خدا نے اس کی یہ خواہش پوری کردی اور دنیائے اسلام کا یہ عظیم مدبر رمضان ۹۵ھ مطابق جون ۷۱۴ء میں امیر المومنین ولید بن عبدالملک کی وفات سے ایک سال قبل اس جہان فانی سے رخصت ہو گیا۔ جسد خاکی کو واسط میں سپرد خاک کیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ بے حرمتی سے بچانے کے لیے اس کی قبر کے نشان مٹا دیے گئے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ کام عہد عباسیہ میں ہوا ہو جو بنی امیہ کے حریف تھے۔ اور ان کے قابل رشک جرنیلوں کے کارناموں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینا چاہتے تھے۔

حجاج کی وفات کے وقت قتیبہ بن مسلم خراسان میں تھا۔ اس کی مدد کے لیے حجاج نے ایک فوج بھیجی تھی۔ جب وہ فوج اس کے پاس پہنچی تو اس کے بعد ہی حجاج کے انتقال کی خبر بھی ملی۔ قتیبہ بہت رنجیدہ ہوا۔ اور دو شعر پڑھے جو ابن اثیر نے اپنی تاریخ میں نقل کیے ہیں۔ ان کا ترجمہ یہ ہے۔

> ''قسم ہے میری زندگی کی کہ آل جعفر کا بہترین شخص حوران میں مر گیا۔ اگر وہ زندہ رہتا تو میں بھی اپنی زندگی کا فائدہ اٹھاتا۔ اور اگر تو مر گیا تو تیری زندگی بے کار ہے۔''

قتیبہ مرو واپس آ گیا اور فوجوں کو اپنی اپنی جگہ روانہ کر دیا۔ اس پر خلیفۃ المسلمین ولید نے ایک مراسلہ قتیبہ کو لکھا جس کا مضمون یہ تھا کہ امیر المومنین تمہاری جانفشانی، حسن خدمات اور اعدائے اسلام کے مقابلہ میں تمہاری مجاہدانہ کوششوں سے خوب واقف ہیں، وہ تم کو ایسا مرتبہ دیں گے جو تمہارے شایانِ شان ہو۔ تم اپنی جنگوں کے کام کو پورا کرو اور خدا کی

رحمت کے متوقع رہو۔(ابن الاثیر)

حجاج کے خصائل وخصائص:

حجاج جس دور میں برسر اقتدار آیا وہ انتہائی پر آشوب عہد تھا۔مملکت اسلامیہ بہت سے داخلی اور خارجی فتنوں میں گھری ہوئی تھی۔ پورا ملک انتشار کا شکار تھا۔ایسے دور میں ایک ایسے صاحب عزم وحوصلہ مدبر کی ضرورت تھی جو تمام رکاوٹوں کو سختی کے ساتھ دور کر کے وقت کے دھارے کو صحیح سمت موڑ دے اور حجاج نے یہ کارنامہ انجام دے دیا۔تاریخ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ اس کو حالات نے مجبور کر دیا تھا وہ سخت رویہ اختیار کرے کیوں کہ سیدھی انگلیوں سے گھی نکلنا ممکن نہ تھا ورنہ اس کی فطرت رقیق القلبی، خداترسی اور رحمدلی کے جذبات سے عاری نہ تھی۔مؤرخ ابن اثیر نے قتیبہ بن مسلم کی روایت نقل کیا ہے کہ حجاج نے ایک مرتبہ تقریر کی اور اس میں قبر کا تذکرہ کیا اور کہا کہ وہ تنہائی کا گھر ہے، غربت کی جگہ ہے۔غرض کہ اس طرح کہتا رہا۔خود بھی روتا رہا اور سامعین کو بھی رلاتا رہا۔اس کے بعد اس نے کہا کہ میں نے امیر المومنین عبدالملک سے سنا ہے اور انہوں نے اپنے والد مروان بن الحکمؒ سے سنا تھا کہ حضرت عثمان ذوالنورینؓ نے اپنے ایک خطبہ میں بیان فرمایا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب کسی قبر کو دیکھتے یا یاد کرتے تھے رونے لگتے تھے۔یہ بات اسی شخص میں ہوتی ہے جس کے دل میں خدا اور آخرت کا خوف سرایت کیے ہوئے ہو۔

حجاج کے کیریکٹر پر روشنی ڈالنے کے لیے اس کا وہ بے مثال خطبہ کافی ہے۔جو اس نے کوفہ کی مسجد میں دیا تھا۔یہ ایک ادبی شہ پارہ بھی ہے اور اس وقت کے سیاسی حالات کا مرقع بھی۔بے محل نہ ہوگا اگر اس کا اقتباس درج کر دیا جائے۔وہ عراقیوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے:

> ’’اے عراقیو! مجھے کسی چیز سے خوف زدہ نہیں کیا جاسکتا، نہ مجھ پر زور یا دباؤ ڈالا جاسکتا ہے۔میں بہت جانچ پڑتال کے بعد ہوشیار و لائق ثابت ہوا

ہوں اور بڑے بڑے تجربے کے بعد ڈھونڈ کر منتخب کیا گیا ہوں۔
امیر المومنین اطال اللہ بقاۂ نے اپنے ترکش کے تمام تیر نکالے پھر ان کی لکڑیوں کو جانچا اور مجھے سب سے زیادہ تلخ اور مضبوط لکڑی کا تیر پا کر تمہارے اوپر مسلط کر دیا۔ کیوں کہ تم فتنوں میں پیش پیش ہو۔ اور ہر گمرہیوں میں پڑے رہتے ہو۔ بخدا میں تمہیں گٹھری میں باندھ دوں گا۔ جس طرح ببول کی لکڑیوں کا گٹھا باندھا جاتا ہے اور اس طرح بے دردی سے ماروں گا جس طرح پرانے اونٹوں کو مارا جاتا ہے۔ تمہاری مثال ان بستی والوں کی سی ہے جن کو ہر جگہ سے امن واطمینان کے ساتھ رزق ملتا تھا، لیکن انہوں نے خدائے تعالیٰ کے انعامات واحسانات کی قدر نہ کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اعمال کی سزا میں انہیں بھوک اور خوف میں مبتلا کر دیا۔ بخدا میں جو کچھ کہوں گا اسے پورا کروں گا۔ جس کا میں ارادہ کروں گا اسے پورا کروں گا۔ امیر المومنین نے مجھے حکم دیا ہے کہ تمہارے وظیفے تم کو دے دوں اور تم کو تمہارے دشمنوں سے لڑائی کے لیے مہلب بن ابی صفرہ کے ساتھ بھیج دوں۔ بخدا جس کو میں وظیفہ وصول کرنے کے تین دن بعد اس کے گھر میں بیٹھا پاؤں گا اس کی گردن اڑا دوں گا۔'' (تاریخ الادب العربی از احمد حسن زیات)

مذکورہ بالا اقتباس سے بخوبی واضح ہو جائے گا کہ حجاج سخت رویہ اختیار کرنے میں حق بجانب تھا۔ اگر حالات پُر امن ہوتے تو شاید اس کا طرز عمل کچھ اور ہوتا اور اسے وہ کچھ نہ کرنا پڑتا جو اس نے مجبوراً کیا۔

یہ خیال کے حجاج کے دور میں لوگوں کو آزادی رائے کا حق حاصل نہ تھا۔ قطعاً غلط اور بے بنیاد ہے۔ وہ آزادیٔ رائے کا قائل تھا اور حق گوئی کی قدر کرتا تھا۔ البتہ تخریب پسندی کو برداشت نہیں کرتا تھا۔ ایسی آزادیٔ رائے جس سے کسی فتنے کو سر اٹھانے کا موقع ملے

بلاشک اس کے نزدیک قابل سرزنش تھی۔ تاریخ جہاں اس کے ظلم وجور کی فرضی داستانوں سے بھری پڑی ہے۔ وہاں ان حقائق سے بھی خالی نہیں ہے۔ ذیل میں چند مثالیں پیش کی جاری ہیں:

''روایت ہے کہ حجاج بن یوسف نے ایک شخص سے پوچھا۔ کیا تم محمد بن یوسف کو جانتے ہو؟ وہ کہنے لگا، ہاں کیوں نہیں جانتا۔ حجاج نے کہا، کچھ اس کے چال چلن کے بارے میں بتاؤ۔ اس نے جواب دیا، وہ تو بڑا برا آدمی ہے۔ اللہ اور اس کے احکام کی سرتابی کرتا ہے۔ حجاج کا چہرہ غصہ سے سرخ ہوگیا اور کرخت آواز میں بولا۔ کمبخت تجھے معلوم نہیں وہ میرا بھائی ہے۔ اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ ہاں جانتا ہوں، کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ میرا رب ہے اور خدا کی قسم وہ مجھے اس سے زیادہ محبوب ومطلوب ہے جتنا تجھے تیرا بھائی۔'' (بنیادی حقوق از صلاح الدین)

بعض روایتوں میں یہ واقعہ اس طرح آیا ہے یا ممکن ہے یہ دوسرا واقعہ ہو۔ حجاج کی ایک شخص سے ملاقات ہوئی۔ حجاج نے اس سے پوچھا ''تمہارا حاکم حجاج کیسا آدمی ہے؟ اس نے کہا' بڑا ظالم وجابر انسان ہے۔ حجاج نے کہا، میں ہی حجاج بن یوسف ہوں۔ اس نے کہا، یا امیر آپ جانتے ہیں میں کون ہوں؟ حجاج نے جواب دیا' نہیں۔ اس نے کہا، میں اس شہر کا مشہور پاگل ہوں۔ رات اور دن میں ایک گھڑی ایسی آتی ہے جب مجھ پر پاگل پن کا دورہ پڑتا ہے۔ اور وہ گھڑی ابھی ایک لمحہ پہلے آئی تھی۔ حجاج مسکرایا اور چل دیا۔

اردو دائرۂ معارف اسلامیہ شائع کردہ پنجاب یونیورسٹی میں اسلام کے اس مایہ ناز کیریکٹر پر بڑی وضاحت سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ لکھا ہے:

''انتظامی امور میں حجاج کی مستعدی اس کا استقلال اور نفسیات انسانی کا مطالعہ اور نازک لمحات میں اس کی فوری گرفت، یہ باتیں اس کے معاندین کو لازماً بری لگی ہوں گی۔ اس امر واقعہ نے کہ وہ رشوت کو برداشت نہیں کرتا

تھا۔ اور ناجائز ذرائع سے دولت حاصل کرنے پر سخت سزا دیتا تھا۔ اسے دیوانی افسروں کے نزدیک یقینا بہت معتوب بنا دیا ہوگا۔ جن کے ہاں دونوں چیزیں معمول بہ تھیں۔ البتہ یہ درست ہے کہ اس میں تحمل اور ضبط نفس کی کمی اور حلم کا فقدان تھا جس سے سخت بے اطمینانی پیدا ہو جاتی تھی۔ اس طرح وہ بعض اوقات اپنے ماتحتوں سے ناممکن چیز کا مطالبہ کر لیتا تھا اور اگر اس کے احکام کی فوراً تعمیل نہ ہو جاتی تو اس پر غیظ و غضب کا جنون طاری ہو جاتا تھا۔ بایں ہمہ حجاج ایک شائستہ انسان تھا۔ اس کی خطابت کا کوئی جواب نہ تھا (اور وہ خوفناک ہوتی تھی) خالص عربی زبان کو وہ بہت اہمیت دیتا تھا، ادبی ذوق رکھتا تھا۔ وہ ایک پکا مسلمان تھا۔ لیکن نہ تو متعصب تھا نہ توہم پرست۔ متکلمین کے فضول جھگڑے اسے متأثر نہ کر سکتے تھے لیکن بے تکلفی سے وہ متأثر ہوتا تھا اور عام طور پر اس کی وجہ سے سزا معاف کر دیتا تھا۔ اگر بے تعصبی سے دیکھا جائے تو حجاج دور بنی امیہ کا بڑا سیاست داں تھا۔''

تاریخ کی رطب و یابس روایات کے طومار لاطائل نے اذہان کو مسموم کر دیا ہے اور یہ غلط تاثر پیدا ہو گیا ہے کہ بنی ہاشم خصوصاً آل ابی طالب اور بنی امیہ میں عداوت تھی اور شروع ہی سے ان عرب کے معزز خانوادوں میں حریفانہ چشمک اور معاندانہ جذبات قائم تھے حالانکہ امر واقعہ اس کے خلاف ہے جس کا ثبوت وہ رشتہ مناکحت ہے جو اُن ہر دو خاندانوں میں سالہا سال تک قائم رہا۔ بنی ہاشم کی خواتین سادات بنی امیہ کے نکاح میں آتی رہیں اور اسی طرح بنی امیہ کی خواتین سادات بنی ہاشم کے کاشانوں کی زینت بنتی رہیں۔ یہ سلسلہ واقعۂ کربلا کے بعد بھی چلتا رہا۔ یہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ اس دور میں واقعۂ کربلا کا ذمہ دار خلافت بنی امیہ کو نہیں گردانا جاتا تھا۔ یہ بحث ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ مقصود صرف یہ بتلانا ہے کہ حجاج جو دولت بنی امیہ کا ایک اہم رکن تھا حضرت

حسین بن علیؓ کی عظمت کا کس قدر احساس اپنے دل میں رکھتا تھا۔ ابن اثیر جو بنی امیہ کا ہوا خواہ نہیں بلکہ اموی دشمنی میں ضرب المثل ہے' لکھتا ہے کہ عبدالملک بن عمیر سے مروی ہے حجاج نے ایک دن کہا کہ اگر کسی نے کوئی اپنا کارنامہ انجام دیا ہو تو وہ کھڑا ہو' تاکہ میں اس کی محنت کا انعام دوں۔ ایک شخص نے کھڑے ہو کر کہا کہ میں نے ایک قابل انعام کارنامہ کیا ہے۔ حجاج نے پوچھا، وہ کیا؟ اس نے کہا ''میں نے (حضرت) حسینؓ کو قتل کیا تھا۔'' حجاج نے پوچھا' کیسے قتل کیا تھا؟ اس نے کہا ''پہلے ایک نیزہ چبھویا۔ پھر ایک پوری تلوار ماری۔ اس میں میرا کوئی شریک نہ تھا۔'' حجاج غضبناک ہو کر بولا ''خدا تجھے ہلاک کرے تو اور وہ ایک جگہ جمع نہ ہوں گے (تو دوزخ میں ہوگا اور وہ جنت میں ہوں گے) دور ہو جا میرے سامنے سے۔'' یہ کہہ کر اسے نکال دیا اور کچھ نہیں دیا۔ (دائرۂ معارف اسلامیہ)

حجاج کی دینی برکتیں:

ہمارے اس بیان میں ذرہ برابر مبالغہ نہیں کہ حجاج ایک پکا مسلمان تھا' نہ صرف یہ بلکہ وہ زمرۂ تابعین میں تھا۔ کیوں کہ اس کی ملاقات بہت سے جلیل القدر صحابہؓ سے ثابت ہے۔ تاریخ میں چند بزرگ صحابہ سے حجاج کے قابل اعتراض رویہ کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ جس میں ہو سکتا ہے کہ مبالغہ ہو۔ نیز اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ایسی مبالغہ آمیز روایتیں عباسیوں کے دور میں عالم وجود میں آئی ہوں جو بنی امیہ کے حریف تھے اور اموی جرنیلوں کے قابل رشک کارناموں پر پانی پھیرنا چاہتے تھے۔ ہمارے خیال کی تائید دائرۂ معارف اسلامیہ کے حسب ذیل ریمارک سے ہوتی ہے:

> ''اسلام کے ابتدائی دور میں عربی ادب کا موضوع شاید ہی کوئی اس قدر بنا ہو جس قدر حجاج بنا۔ وہ ایک ممتاز آدمی تھا۔ ایسے قصے اور اشعار جن میں اس کے حق میں اور خلاف دلائل دیے گئے بے شمار ہیں۔ ان میں اکثر تیکھی قسم کے قصے اور حکایات ہیں۔ جن کی مدد سے خصوصی وضاحت کے ساتھ اس

کے کردار کا پتہ چلتا ہے۔ عباسی اسے نفرت کے ساتھ یاد کرتے تھے، لیکن
درحقیقت وہ بنوامیہ کے اس گورنر پر رشک کرتے تھے۔ اس میں کوئی شک
نہیں کہ ریاست کے مفادات کے لیے حجاج سخت گیر اور بے رحم ہوسکتا تھا۔
اس کے نزدیک ہر قسم کی حکم عدولی ریاست کے خلاف ایک جرم تھی۔ لیکن
عوام کو سزائیں اور دوسرے مظالم جو اس سے منسوب کیے گئے اس کے
دشمنوں کی ایجاد ہیں۔"

تاہم تاریخ میں ایسے شواہد کی بھی کمی نہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ احساس ہونے پر اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتا تھا اور اپنے قصور کی معافی مانگ لیتا تھا۔ جیسا کہ حضرت انس بن مالک ؓ صحابی کے معاملے میں ہوا۔ حضرت انس ؓ نے اس کی کچھ بے جا زیادتیوں سے ناراض ہو کر بارگاہ خلافت میں شکایت کر دی تھی جس پر امیر المومنین نے حجاج کو ایک تہدید آمیز خط لکھا۔ حجاج فوراً حضرت انس ؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی غلطی کی معافی چاہی۔

ابن اثیر نے حجاج کو راوی حدیث بھی لکھا ہے۔ اس کی روایت کردہ ایک حدیث تو اوپر درج کی جا چکی ہے جو اس نے عبدالملک سے روایت کی۔ انہوں نے اپنے والد مروان ؓ سے اور مروان ؓ نے حضرت عثمان بن عفان ؓ سے روایت کی۔ اس قسم کی حدیثیں اس نے انس بن مالک ؓ اور عبداللہ بن مسعود ؓ سے بھی روایت کی ہیں۔ (ابن اثیر)

ابن عوف کا بیان ہے کہ جب میں حجاج کو قرآن پڑھتے سنتا تھا تو سمجھتا تھا کہ وہ قرآن پڑھنے کا عادی ہے۔

حجاج کا سب سے بڑا دینی کارنامہ قرآن کریم کے نسخوں میں یکسانیت پیدا کرنا، مختلف قرأتوں کے بارے میں متکلمین کے جھگڑوں کو ختم کر کے ایک ہی متن مقرر کرنا اور حروف قرآن پر نقطے اور اعراب لگانا ہے یہ اتنا بڑا دینی احسان ہے جس سے ملت اسلامیہ رہتی دنیا تک عہدہ برآ نہیں ہوسکتی۔ مشہور مستشرق نولدیکی (NOLDEKE) کا خیال ہے

کہ قرآن مجید کے علیٰحدہ علیٰحدہ اجزا یعنی تیس پاروں کی تقسیم بھی اسی کا کارنامہ ہے۔ بہرکیف حجاج نے اس مستند متن کا اعلان کیا جس کی تلاوت ہم آج تک کر رہے ہیں۔ اور نقاط واعراب کی موجودگی میں صحیح تلفظ کے ساتھ کر رہے ہیں۔ جب تک قرآن پڑھا جائے گا۔ اس کے محسن ملت بیضا کی روح اس ثواب جاریہ میں برابر کی شریک ہوتی رہے گی۔

حجاج احکام مذہبی کا پوری طرح پابندی کرتا تھا اور اپنے ماتحتوں کو بھی پابندی کی ہدایت کرتا رہتا تھا' چنانچہ محمد بن قاسمؒ جب فتح سندھ کی مہم پر معرکہ آرائی میں مصروف تھا' حجاج نے اس کو مکتوب ارسال کیا جس میں وہ اس جواں سال سالار کو ہدایت کرتا ہے:

> ''پنج وقتہ نماز پڑھنے میں سستی نہ کرو۔ تکبیر وقرأت، قیام وقعود اور رکوع وسجود میں خدائے تعالیٰ کے روبرو تضرع وزاری کیا کرو۔ زبان پر ہر وقت ذکر الٰہی جاری رکھو۔ کسی شخص کو شوکت وقوت خدائے تعالیٰ کی مہربانی کے بغیر میسر نہیں ہوسکتی۔ اگر تم خدا کے فضل وکرم پر بھروسہ رکھو گے تو یقینا مظفر ومنصور ہوگے۔'' (آئینہ حقیقت نما از اکبر شاہ خاں نجیب آبادی)

ایک اور خط جو راجہ داہر کے مارے جانے کی اطلاع ملنے پر لکھا گیا وہ بھی قابل ملاحظہ ہے۔ لکھتا ہے:

> ''تمہارا اہتمام وانتظام اور ہر ایک کام شرع کے موافق ہے۔ مگر ہر خاص وعام کو امان دینے اور دوست دشمن میں تمیز نہ کرنے سے ایسا نہ ہو کہ کام بگڑ جائے۔ جو لوگ بزرگ اور ذی وقعت ہوں ان کو ضرور امان دو۔ لیکن شریر اور بدمعاشوں کو دیکھ بھال کر آزاد کرو۔ اپنے عہد وپیمان کا ہمیشہ لحاظ رکھو۔ امن پسند رعایا کی استمالت کرو۔'' (آئینہ حقیقت نما)

سوچنے کا مقام ہے کہ جو شخص اپنے ماتحتوں کو امور مذہبی کی پابندی کی ہدایت کرتا ہو' بزرگوں کی توقیر اور حق العباد کی پاسداری کی تلقین کرتا ہو کیا وہ خود ان کا پابند نہ ہوگا۔ ہوگا اور یقینا ہوگا۔ وہ مشہور تابعی بزرگ سعید بن المسیبؒ کی محض اس بنا پر عزت کرتا تھا کہ انہوں

نے ایک مرتبہ کنکریاں مار کر اس کی نماز کی غلطیاں درست کی تھیں۔ (طبقات ابن سعد)

اس کے تدین، عدل، رحمدلی، شفقت اور حق العباد کی پاسداری کا اندازہ ذیل کے واقعہ سے ہوتا ہے:

امیر المومنین عبدالملک کو ایک شخص اسلم بن عبدالبکری کے کسی سنگین جرم کا علم ہوا تو حجاج کو اس کے قتل کا حکم دیا۔ حجاج نے اسلم کو بلا کر دریافت حال کیا۔ اس نے حجاج کی توجہ اس آیت قرآنی کی طرف مبذول کرائی۔ يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوٓاْ إِن جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوٓاْ الخ (اے مومنو اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو اس کی تحقیق کر لیا کرو۔) اور کہا کہ امیر المومنین تو غائب ہیں اور آپ موجود ہیں۔ بخدا میرے متعلق جو اُڑایا گیا ہے وہ سرتاپا غلط اور بے بنیاد ہے۔ آپ امیر المومنین کو لکھیے کہ میرے پاس ۲۴ عورتیں ہیں جن کا نان ونفقہ میرے ذمہ ہے۔ وہ سب دروازے پر کھڑی ہیں۔'' حجاج نے ان کو بلایا تو معلوم ہوا کہ کوئی اس کی ماں ہے کوئی بیوی اور کوئی بیٹی' غرض سب اس کے اقربا تھے۔ ان میں سے ایک کم سن لڑکی آگے بڑھی اور چند درد انگیز اشعار پڑھے جن میں اس خاندان کی بے کسی اور زبوں حالی کا بیان تھا۔ یہ سن کر حجاج کی آنکھیں اشک آلود ہوگئیں۔ اس نے تمام حال امیر المومنین کو لکھ بھیجا۔ بارگاہ خلافت سے جواب آیا کہ اگر ایسا ہے تو انعام واکرام سے ان کو نوازو اور کم سن لڑکی کے ساتھ شفقت کا برتاؤ کرو۔ حجاج نے ایسا ہی کیا۔'' (تاریخ الکامل ابن اثیر)

ڈاکٹر مصطفی السباعی اپنی کتاب **السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی** میں حجاج کے تدین کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ

> '' حجاج اور بعض علما کے درمیان جو کچھ ہوا اس کا سبب دولت امویہ کے مخالفین کے دبانے میں اس کا سخت رویہ تھا نہ کہ اس کا فسق وضلال میں مبتلا ہونا۔ یہ کس طرح ہوسکتا تھا۔ جب کہ اس کو حروف قرآن پر نقطے اور اعراب اور شکل کلمات کا شرف حاصل ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ اس کو کتاب

اللہ کے ساتھ بہت شغف تھا۔ یہ شغف صرف اسی شخص کو حاصل ہو سکتا ہے جس کے اندر دین داری کی جڑیں بڑی گہری ہوں۔''

حجاج کی انتظامی صلاحیتیں:

اوپر کی مندرجہ سطور کے مطالعے سے واضح ہو گیا ہوگا کہ حجاج حیرت انگیز انتظامی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ مؤرخ ولہاوزن حجاج کا موازنہ مشہور سیاسی مدبر زیاد بن ابیہؒ سے کرتا ہے۔ جو سیدنا علیؓ کے معتمد علیہ اور سیدنا امیر معاویہؓ کے لائق و فائق گورنر تھے۔ ولہاوزن لکھتا ہے

''وہ دونوں (حجاج اور زیاد) اپنے آپ کو کسی منفعت بخش عہدے کے حامل نہیں سمجھتے تھے۔ اور جن حکمرانوں نے انہیں بڑے اختیارات عطا کیے اور ان کی موت تک انہیں عہدوں پر فائز رکھا وہ ان کے اس اعتماد کا صلہ وفاداری سے اپنے فرائض کی انجام دہی کی صورت میں دیتے تھے اور اس ضمن میں قطعاً یہ پرواہ نہ کرتے کہ رائے عامہ ان کے حق میں ہے یا نہیں۔''

حجاج کے تدبر اور انتظامی قابلیت کا اندازہ اس کے ان خطوط سے بھی ہوتا ہے جو اس نے اپنے ماتحت عاملوں اور سالاروں کو لکھے اور جو تاریخ میں محفوظ ہیں۔ خصوصاً وہ خطوط جو فتح سندھ کی مہم کے دوران میں محمد بن قاسمؒ کو لکھے گئے۔ ان میں سے چند کا اقتباس اوپر دیا جا چکا ہے۔ اور کچھ کا درج ذیل کیا جاتا ہے۔ فتح دیبل کی خوشخبری جب حجاج کو پہنچی تو اس نے محمد بن قاسمؒ کو لکھا:

''جب ملک پر قابض ہو جاؤ تو قلعوں کی استواری اور لشکر کی رفعِ احتیاج کے بعد تمام اموال و خزائن کو بہبود رعایا اور رفاہ خلق میں خرچ کرو۔ اور یاد رکھو کہ کاشتکاروں، کاریگروں، سوداگروں اور پیشہ وروں کی خوش حالی و فارغ البالی سے ملک آباد و سرسبز ہوتا ہے۔ رعایا کے ساتھ ہمیشہ رعایت کرو تا کہ وہ

تمہاری طرف محبت کے ساتھ راغب ہوں۔''

جب محمد بن قاسمؒ نیرون میں مقیم تھا اور تو اس کے پاس حجاج کا یہ خط پہنچا:

''اہل نیرون کے ساتھ نہایت نرمی اور دل دہی کا سلوک کرو۔ ان کی بہبود کے لیے کوشش کرو۔ لڑنے والوں میں جو تم سے امان طلب کرے اس کو ضرور امان دو۔ کسی مقام کے اکابر و سردار تمہاری ملاقات کو آئیں تو ان کو قیمتی خلعت اور انعام واکرام سے سرفراز کرو۔ عقل و دانائی کو اپنا رہبر بناؤ۔ جو وعدہ کسی سے کرو اس کو ضرور پورا کرو تاکہ قول و فعل پر اہل سندھ کو پورا پورا اعتماد و اطمینان ہو۔''

فتح سیوستان کے بعد محمد بن قاسمؒ کو حجاج کا یہ خط ملا:

''جو کوئی تم سے جاگیر و ریاست طلب کرے تم اس کو ناامید نہ کرو۔ التجاؤں کو قبول کرو۔ امان و عفو سے رعایا کو مطمئن کرو۔ سلطنت کے چار ارکان ہیں۔ اول: مدارات و درگزر و محبت۔ دوم: سخاوت و انعام۔ سوم: دشمنوں کی مزاج پرسی اور ان کی مخالفت میں عقل کو ہاتھ سے نہ جانے دینا۔ چہارم: قوت و شہامت۔

تم راجاؤں سے جو عہد کرو اس پر قائم رہو۔ جب وہ مالگزاری دینے کا اقرار کر لیں تو ہر طرح ان کی اعانت و امداد کرو۔ جب کسی کو سفیر بنا کر بھیجو تو اس کی عقل و امانت کو جانچ لو۔ اور جو شخص توحید الٰہی کا اقرار اور تمہاری اطاعت کرے اس کے تمام مال و اسباب اور ننگ و ناموس کو برقرار رکھو لیکن جو اسلام قبول نہ کرے اس کو صرف اس قدر مجبور کرو کہ وہ تمہارا مطیع ہو جائے۔ جو شخص بغاوت و سرکشی اختیار کرے اس سے لڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ شریف اور رذیل میں امتیاز کرو۔ ایسا بھی نہ ہو کہ تمہاری صلح جوئی کو دشمن تمہاری کمزوری محسوس کریں۔''

فتح برہمن آباد کے بعد وہاں کے پروہتوں اور پجاریوں نے ان شکستہ مندروں کی، جن کو دوران جنگ نقصان پہنچا تھا۔ مرمت کے لیے محمد بن قاسمؒ کی خدمت میں درخواست کی۔ محمد بن قاسمؒ نے برہمنوں کے مطالبے کی پوری تفصیل لکھ کر حجاج سے مشورہ طلب کیا۔ اس کے جواب میں حجاج نے لکھا:

''تمہارے خط سے معلوم ہوا کہ برہمن آباد کے ہندو اپنے مندروں کی عمارت درست کرنا چاہتے ہیں چونکہ انہوں نے اطاعت قبول کرلی ہے۔ لہٰذا ان کو اپنے معبود کی عبادت میں آزادی ہونی چاہیے اور کسی قسم کا جبر کسی پر مناسب نہیں۔''

اس کے بعد ایک دوسرے خط میں حجاج نے لکھا:

''میں تمہارے ملکی انتظام سے بہت خوش ہوا ہوں۔ تم ایسے کام کرو کہ تمہارا نام روشن ہو۔ اور تمہارے دشمن عاجز و پریشان ہوں۔ تمہارا ہر ایک کام میں مجھ صلاح پوچھنا تمہارے حزم و احتیاط کی دلیل ہے۔ مگر فاصلہ اس قدر دراز ہے کہ خط جواب پہنچنے میں دیر ہوتی ہے اور اس سے کاموں میں التوا ہوتا ہے۔ لہٰذا تم اب بطور خود رعیت نوازی اور عدل گستری کے طریقوں پر آزادانہ عمل درآمد کرو۔''

ایک اور مقام کو فتح کرنے پر حجاج نے لکھا:

''جو لوگ اہل حرب ہیں ان کو قتل کرو۔ جو مطیع ہوں ان کو امان دو۔ صناع و تاجر پر کوئی محصول یا ٹیکس عائد نہ کرو۔ جو شخص زراعت میں زیادہ توجہ اور جانفشانی سے کام لیتا ہے۔ اس کی مدد کرو۔ اور اس کو تقادی دو۔ جو لوگ اسلام سے مشرف ہوں اور ان سے زمین کی پیداوار کا عشر یعنی دسواں حصہ وصول کرو اور جو لوگ اپنے مذہب پر قائم ہیں ان سے وہی مالگزاری وصول کرو جو وہ اپنے راجاؤں کو دیا کرتے تھے۔''

یہ حجاج کے چند خطوط کے اقتباسات ہیں جو آئینہ حقیقت نما (مولفہ اکبر شاہ خاں نجیب آبادی) سے پیش کیے گئے ہیں۔ان سے اس عظیم مدبر کی حیرت انگیز انتظامی قابلیت اور سیاسی تدبر کا اظہار ہوتا ہے۔علاوہ ازیں دولت بنی امیہ کو تمام تخریب کار عناصر سے پاک کر کے اس کو استحکام سے ہمکنار کیا اور اندرون ملک مفید اصلاحات نافذ کیں۔جن کی توضیح اوپر کے صفحات میں کی جا چکی ہے۔ یہ بھی اس کا اتنا بڑا انتظامی کارنامہ ہے جس کو سب مؤرخین نے سراہا ہے اور باوجود اختلاف راہے کے اس کو زبردست خراج تحسین پیش کیا ہے۔

حجاج کا مقام ادب عالیہ میں:

ابوعمرو علا سے مروی ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ میں نے حجاج بن یوسف اور حسن (غالباً حسن بصریؒ) سے بڑھ کر فصیح اللسان کسی کو نہیں دیکھا۔لیکن حسنؒ حجاج سے زیادہ فصیح تھے۔ (ابن اثیر) حجاج ایک فصیح البیان شاعر، بلند پایہ ادیب اور اعلیٰ درجہ کا خطیب تھا۔اس کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اندازہ اس کے ان منظوم خطوط سے ہوتا ہے جو امیر المومنین عبدالملک بن مروان کے جواب طلب خطوط کے جواب میں بڑے مؤثر پیرائے میں لکھے گئے۔ جواب میں امیر المومنین کو لاجواب ہو کر اس کے سوا کچھ نہ کہتے بن پڑا کہ ''جو مناسب سمجھو کرو''۔لیکن جس چیز نے اس کو ادبی دنیا میں ایک بلند مقام عطا کیا وہ اس کا خطبہ جو اس نے کوفہ میں دیا تھا جس کا تھوڑا سا اقتباس اوپر درج کیا جا چکا ہے۔ ماہرین ادبیات نے اس کا مقابلہ اس کے پیش روز یاد بن ابیہؒ کے اس مہتم بالشان خطبہ سے کیا ہے جو انہوں نے حضرت معاویہؓ کے عہد خلافت میں بصرے میں دیا تھا۔علماء ادب ونقادانِ فن کی رائے ہے کہ حجاج کا خطبہ کسی حیثیت سے زیادؒ کے خطبے سے کم نہیں۔حجاج کے وہ خطوط بھی ادبی شہ پاروں میں جگہ پانے کے مستحق ہیں جو اس نے محمد بن قاسمؒ اور دیگر عمال ریاست کو وقتاً فوقتاً مناسب اقدامات پر مبنی لکھے اور جو تاریخ کے صفحات پر محفوظ ہیں اور عربی ادب کے شاہکار سمجھے

جاتے ہیں۔

خاتمہ:

متذکرہ بالا حقائق وشواہد جو ہماری تاریخ کا قیمتی سرمایہ ہیں یہ حقیقت ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ حجاج بن یوسف الثقفیؒ ایک تجربہ کار سیاست داں، امن پسند، خدا پرست وخدا ترس دیندار اور زبردست انتظامی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ ایک طرف ظالموں، باغیوں اور فتنہ انگیز عناصر کے لیے قہر خداوندی تھا تو دوسری طرف مظلوموں کا فریادرس، اور امن پسندوں کے لیے پیکر شفقت ورافت تھا۔ وہ کوئی کام ایسا نہیں کرتا تھا جو اس کی دانست میں شریعت نمرہ کے خلاف ہو۔ ہوسکتا ہے کہ ابن الزبیرؓ جیسی قابل احترام ہستی کے خلاف حجاج اقدام اور ان کا قتل بعض علما کے نزدیک قابل معافی نہ ہو لیکن اس قسم کی رائے قائم کرنے سے پیشتر یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ حجاج اپنے پیش روزیادؒ کی طرح خلافت قائمہ کا سچا وفادار خادم تھا۔ اور حکومت کے خلاف کسی اقدام کو برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ خواہ وہ کتنی ہی محترم ہستی کی طرف سے کیوں نہ ہو۔ اور یہ حقیقت بھی مسلمہ ہے کہ ابن الزبیرؓ کی حکومت کو امت مسلمہ کے سواد اعظم نے کبھی خلافت کا درجہ نہیں دیا۔ تاریخ وادب کی کتابوں میں جس قدر مواد حجاج کے خلاف ملتا ہے اس کی حیثیت کہانیوں اور افسانوں سے زیادہ نہیں جو بقول دائرۂ معارف اسلامیہ اس کے دشمنوں کے بطن دماغ کی پیداوار ہیں۔

کور ذوقاں داستانہا ساختند

وسعت ادراک او نشناختند

امیر حجاجؒ بن یوسف اور موالی

ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر صاحبہ

از ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر صاحبہ

سابق چیئر پرسن کلیہ شعبۂ تاریخ اسلامی ،جامعہ کراچی پاکستان

امیر حجاجؒ بن یوسف اور موالی

ڈاکٹر پروفیسر نگار سجاد ظہیر صاحبہ نے اپنی مشہور تالیف ''عرب اور موالی'' کے باب ششم میں ''موالی۔ ۔ ۔حکومتی ردِّ عمل کی زد میں'' کی سرخی قائم کرکے امیر حجاج بن یوسف ثقفیؒ سے متعلق موالیوں کے ساتھ بدسلوکی پر ایک مضمون رقم کیا تھا جس میں ڈاکٹر صاحب نے ان تمام اعتراضات کا نہایت مدلّل اور جامع جواب دیا ہے جو عموماً امیر حجاجؒ پر موالیوں کی سماجی حیثیت پر ضرب لگانے کے سلسلے میں عائد کیے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر صاحبہ کا یہ مضمون نہ صرف اپنے اندر نہایت اعلیٰ اور بیش قیمت معلومات رکھتا ہے بلکہ مطالعۂ تاریخ کے ساتھ ساتھ فلسفۂ تاریخ پر ڈاکٹر صاحبہ کی دقّتِ نظری پر بھی شاہد ہے۔ کتاب ہٰذا کے مرکزی خیال سے مماثلت رکھنے کی وجہ سے ڈاکٹر صاحبہ کی اجازت سے ہم ''اس مضمون کے خلاصہ کو اپنے الفاظ میں'' شاملِ کتاب کررہے ہیں، تاہم اس مضمون کی تحقیق کا سہرا ڈاکٹر صاحبہ کے سر ہی جاتا ہے۔ اس بابت ہم ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر صاحبہ کے تہہ دل سے شکر گزار ہیں کہ انھوں نے ہماری درخواست پر اپنے قیمتی وقت میں سے چند لمحات نکال کر ہمیں اپنا یہ مضمون ارسال کیا۔ اللہ اس کے لیے ڈاکٹر صاحبہ کو جزائے خیر سے نوازے اور ان

سے یوں ہی تاریخ کی تطہیر کا کام لیتا رہے۔ آمین

موالی۔ ۔ ۔ حکومتی ردِّ عمل کی زد میں

ایک عام خیال یہ ہے کہ موالی کی سماجی حیثیت پر اصل ضرب لگانے والا حجاج بن یوسفؒ تھا اور یہ اپنے شدید تعصب کی وجہ سے موالی کا براہ راست دشمن تھا۔ تاریخ کا یہ کوئی صحیح جائزہ اور حجاج بن یوسفؒ کی ذات اور حکمتِ عملیوں کا یہ کوئی درست تجزیہ نہیں ہے۔ اس بات کو اگر یوں کہا جائے تو تاریخی طور پر زیادہ مناسب ہوگا کہ حجاج بن یوسفؒ اموی حکومت کا وفادار ساتھی اور ان کا انتہائی قابلِ اعتماد دست راست تھا۔ اپنے بیس سالہ دور ولایت میں اس نے ہر اس مخالف پر گرفت کی جس نے امویوں کے خلاف صف آرائی کی کوشش کی، خواہ وہ عربی ہو یا موالی، خراسانی ہوں یا عراقی، عام آدمی ہو یا کوئی محترم شخصیت جیسے صحابیٔ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (سیدنا ابن زبیرؓ) و تابعی (سعید بن جبیرؒ)، اموی اقتدار کے خلاف جس کو حجاجؒ نے خطرہ سمجھا اس کے خلاف کارروائی کی۔

معرکۂ ابن زبیرؓ کے بعد امیر عبدالملک بن مروانؒ نے اسے حجاز، یمن اور یمامہ کی گورنری سونپی تھی جہاں وہ دو سال بحیثیت گورنر مقرر رہا اور جب یہاں اس نے خود کو ایک منجھے ہوئے منتظم کے طور پر منوا لیا تو امیر عبدالملک بن مروانؒ نے اس وقت کا سب سے مشکل صوبہ یعنی کوفہ اس کی گورنری میں دینے کا فیصلہ کیا۔ اگرچہ اس تبدیلی کا فوری سبب اسی سال خلیفہ کے بھائی بشر بن مروانؒ، جو کہ حجاجؒ سے پہلے کوفہ کا گورنر تھا، کی موت بھی تھی۔ خارجیوں کی مسلسل سازشوں کے باعث عراق کی گورنری اسلامی ریاست کا سب سے اہم انتظامی شعبہ تھا۔ حجاجؒ نے تیئس ۲۳ برس کی عمر میں ۷۵ھ/ ۶۹۴ء میں یہ گورنری سنبھالی۔ اس کے تین سال بعد ۷۸ھ میں مشرقی اضلاع بھی جن میں کرمان، خراسان اور سجستان کے علاقے بھی شامل تھے، حجاجؒ

کی بہترین انتظامی قابلیت کے سبب اس کی گورنری کے تحت کردیئے گئے(۱) اور فی الواقع وہ مملکت کے نصف سے زائد رقبے پر حکمران ہوگیا۔

تین سال تک حجاج بن یوسفؒ کو عراق میں آزمانے کے بعد امیر عبدالملک بن مروانؒ نے اسے خراسان اور سیستان جیسے مشکل صوبے بھی سونپ دیئے۔ چنانچہ ۷۸ھ تا ۹۵ھ تک وہ عراق اور مشرقی اضلاع کا مضبوط اور کامیاب ترین گورنر رہا، اس کا ماتحت علاقہ، کل اسلامی مملکت کے نصف علاقہ سے زائد تھا۔ اسے عبدالملک بن مروانؒ اور ولید بن عبدالملکؒ کی مکمل تائید حاصل رہی۔ عبدالملکؒ اسے اچھی طرح آزما چکا تھا اور اسے اموی حکومت کا انتہائی وفادار پانے کے بعد اپنے جانشین ولید کو وصیت کی تھی کہ

> ''حجاجؒ کی عزت کرو، اس نے منبروں کو تمھاری جلوہ افروزی کے لیے خالی کیا، تمام ممالک اور بلاد پر تمھارا علَم نصب کیا اور تمھارے دشمنوں کو تمھارے لیے زیر نگیں کر دیا۔''(۲)

اس طرح حجاجؒ کو دونوں خلفاء کی مکمل تائید وحمایت حاصل رہی اور اس کی مدد کرنے کے لیے شامی فوج بھی موجود تھی، جسے پہلے اس نے عراق میں اتارا تھا مگر بعدازاں اپنی اس مددگار شامی فوج کے پڑاؤ کے لیے اس نے واسط کا نیا شہر آباد کیا جو کوفہ اور بصرہ کے درمیان تھا اور دونوں شہروں کے باغی عناصر کے لیے مسلسل ڈر اور سر پر لٹکتی ہوئی تلوار تھی۔

اپنے بیس سالہ دور ولایت کے دوران حجاجؒ نے جو حکمتِ عملی اختیار کی وہ براہ راست موالی کے خلاف نہیں تھی، جیسا کہ بعض مؤرخین نے خیال کیا ہے۔ اس کے نزدیک اس بات کی زیادہ اہمیت نہیں تھی کہ کون عرب ہے اور کون مولیٰ، یہ محض

۱۔ الکامل فی التاریخ، جلد ۴، صفحہ ۴۴۸۔

۲۔ ابن اثیر، الکامل، جلد ۴، صفحہ ۵۱۸۔

ثانوی سوال ہوسکتا تھا اور اس کا ثبوت یہ تھا کہ اشرافِ عراق کے مزاج سے کماحقہ واقفیت رکھنے کے باوجود اس نے ان پر سعید بن جبیرؒ کو قاضی مقرر کیا جو کہ ایک مولیٰ تھے اور جب اشرافِ عراق نے اس تقرر پر اعتراض کیا کہ کوئی غیر عرب ان پر امام نہیں بن سکتا تو اس نے سعید بن جبیرؒ کو معزول کر کے ابو بردہ بن ابو موسیٰ اشعریؓ کو قاضی بنادیا لیکن ساتھ ہی ابو بردہؒ کو حکم دیا کہ وہ سعید بن جبیرؒ سے مشورہ لیے بغیر کوئی فیصلہ نہ کریں۔ یہی نہیں بلکہ حجاجؒ نے سعید بن جبیرؒ کو اپنا مقرب بنایا اور ضرورتمندوں میں مال تقسیم کرنے کے لیے مال کا امین بھی بنایا۔(۱)

امیر حجاجؒ کے نزدیک اصل اہمیت اس بات کی تھی کہ کون اموی حکومت کا وفادار ہے اور کون غدار۔ وفاداروں کے لیے، خواہ عرب ہوں یا مولیٰ، اس کے پاس عزت و احترام بھی تھا اور وظائف و عہدے بھی۔ غداروں کے لیے، خواہ وہ عرب ہوں یا مولیٰ، اس کے پاس صرف ایک چیز تھی اور وہ اس کی تلوار یا اس کا کوڑا۔ ابن الاشعث کی بغاوت (۸۲ھ/ ۷۰۱ء) اور دیر جماجم کے فیصلہ کن معرکہ کے بعد اس نے عراقیوں کو مخاطب کر کے جو تقریر کی تھی، اس کا آخری حصہ ملاحظہ ہو:

> ”۔۔۔ اے عراقیو! میں تم سے کس چیز کی امید رکھوں اور کس بات کی توقع کروں، میں تم پر کس وجہ سے رحم کھاؤں اور تمھیں کس چیز کے لیے سنبھال کر رکھوں۔ کیا عداوتوں کے بعد جھوٹی باتیں بنانے کے لیے۔ میں تمھاری کس بات کو دیکھوں اور تمھاری کس چیز کا انتظار کروں، تم امن میں ہو یا خوف میں، دونوں صورتوں میں منافقت کرتے ہو، نہ تم کسی نیکی کی جزا دیتے ہو اور نہ کسی نعمت کا شکر ادا کرتے ہو۔“

دوسری طرف یہی حجاجؒ شامی فوج کے لیے ایک پدر مہربان نظر آتا ہے۔ اپنی

۱۔ المعارف، صفحہ ۱۹۷۔

اس شامی فوج کو، جس کی مدد سے اس نے ابن الاشعث کی بغاوت فرو کی تھی، مخاطب کر کے کہتا ہے:

> ''اے شامیو! میں تمھارے لیے اس شتر مرغ کی طرح ہوں جو اپنے بچوں کی حفاظت کرتا ہے اور ان سے گندگی کو دور کرتا ہے اور انھیں بارش سے پناہ دیتا ہے اور انھیں بھیڑیوں اور دیگر جانوروں سے بچاتا ہے، اس کی موجودگی میں نہ ان کی طرف گند آسکتا ہے، نہ ہلاکت اور نہ انھیں تکلیف ہوسکتی ہے۔''(۱)

چنانچہ جہاں حجاجؒ نے ان عراقیوں کو قتل کیا جو ابن الاشعث کی بغاوت میں پیش پیش تھے، اس میں عرب یا موالی کی کوئی تمیز روا نہیں رکھی۔ وہیں حکومت کی وفادار شامی فوج کو خوب وظائف سے نوازا اور اس سلسلے میں بھی عرب و موالی کی کوئی تمیز روا نہیں رکھی۔ حجاجؒ کے نزدیک اصل معیار حکومت سے وفاداری تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ رعایا کے تمام طبقوں کی غیر مشروط اطاعت، صرف حکومتِ بنو امیہ کی ہی بنیادی ضرورت نہیں تھی بلکہ ہر دور میں، ہر حکومت کی ضرورت رہی ہے۔ ماضیٔ قریب میں موالی، خصوصاً عراق میں آباد ایرانی موالی ایک جارح عنصر کے طور پر ابھرے تھے، چنانچہ وہ بھی حجاجؒ کی حکمتِ عملی کے تحت کچلے گئے، جس پر یہ کہا گیا کہ حجاجؒ نے موالی کو ذلیل و کمتر سمجھا اور ان کے خلاف اقدامات کیے، حالانکہ اصل واقعہ یہ تھا کہ اس نے مملکت کے باغیوں کے خلاف اقدامات کیے، خواہ وہ عرب ہو یا موالی۔

یہ بات اب بخوبی واضح ہوچکی ہے کہ مؤرخین میں ایک گروہ ایسا موجود تھا جس نے نہایت منظّم طریقے سے بنو امیہ، خصوصاً ان کے ممتاز ترین منتظمین و مدبّرین کے تمام کارناموں کو بُری طرح مسخ کیا ہے۔ یہ دبستانِ عراق تھا جس کا سب سے بڑا

۱۔ مروج الذہب، جلد ۲، صفحہ ۱۰۶۔ البیان والتبیین، جلد ۱، صفحہ ۲۷۔

نمائندہ سیف بن عمر ہے۔ تعصب کو نظر انداز کر کے اگر تاریخی تحقیق سے کام لیا جائے تو حجاج کی خوبیاں بھی منظر عام پر آئیں گے۔

حجاج اور نبطی عرب:

حجاج کے اس عمل کو ، کہ اس نے نبطیوں کے ہاتھوں پر حقارت سے مہریں لگوائیں اور بصرے سے موالی کا وسیع پیمانے پر اخراج کیا، اس کی ''موالی دشمنی'' سے تعبیر کیا جاتا ہے، جبکہ ایسا نہیں تھا۔ اس سلسلے میں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ نبطی عرب تھے اور یہ سیدنا اسمٰعیلؑ کے سب سے بڑے بیٹے نابت کے حوالے سے نبطی، نابت اور نیابوط کہلاتے تھے۔ سیدنا اسمٰعیلؑ کے بعد خانہ کعبہ کی تولیّت نابت کے حصہ میں آئی۔ اہل عرب عموماً نبط کو قوماً و اصلاً غیر عرب سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک عرب و عجم جس طرح دو متقابل نام ہیں، اسی طرح نبطی و عربی کو بھی باہم متقابل سمجھتے ہیں۔ اس کا سبب معاشرت، طرز زندگی اور زبان کا اختلاف ہے ورنہ درحقیقت نبط بھی اسمٰعیلی عرب ہیں جو عراق میں پھیلے ہوئے تھے۔(۱) چونکہ انھوں نے عموماً حدودِ عرب سے باہر غیر قوموں میں اپنا مسکن بنایا اس لیے وہ اپنا نسب محفوظ نہ رکھ سکے۔ سیدنا عمرؓ کہتے ہیں:

> تعلموا النسب ولا تکونوا کنبیط السواد اذا سئل احدھم عن اصلہ قال: من قریہ کذا او کذا۔(۲)
>
> ''نسب نامہ سیکھو، عراق کے نبط کی طرح نہ بن جاؤ کہ جب ان سے ان کے خاندان کی بابت پوچھا جائے تو جواب دیتے ہیں کہ ہم فلاں شہر کے ہیں۔''

۱۔ تاریخ ارض القرآن از سید سلیمان ندوی، صفحہ ۳۶۳تا۳۶۵۔

۲۔ العقد الفرید، جلد ۳ ،صفحہ ۳۱۲۔

اہلِ عرب انباط کو عربوں سے الگ ایک بیرونی قوم سمجھتے تھے، جو درحقیقت ایک مدت تک ان کے عرب سے باہر عراق میں آباد ہونے کا نتیجہ تھا، ورنہ اصلاً وہ عرب ہی تھے، شمالی عرب کے بعض قبائل جو غلطی سے قحطانی کہلاتے ہیں، دراصل نبطی ہی ہیں۔ من جملہ دیگر قبائل کے غسان اور اوس و خزرج کے متعلق تو بتصریح ثابت ہے کہ وہ قحطانی نہیں بلکہ نبطی ہیں۔(۱) شام و عراق کے نبطیوں کی بیشتر آبادی اپنی قومی حیثیت کھو کر یہودیوں، یونانیوں، ایرانیوں اور رومیوں میں اس طرح گھل مل گئی تھی کہ عہدِ اسلام میں ان اطراف میں جب عرب پھیلے تو کوئی ایک دوسرے کو پہچان نہ سکا۔ عربوں نے ہمیشہ ان کو ایک اجنبی قوم سمجھا اور یہ خود بھی اپنے آپ کو نبطی کہتے تھے۔(۲)

حجاجؒ جب واسط آیا تو اس نے تمام نبطیوں کو واسط سے شہر بدر کردیا اور بصرہ میں اپنے عامل حکم بن ایوب کو تحریری حکم بھیجا کہ بصرہ میں جتنے نبطی آباد ہوں، ان کو شہر سے نکال دو کیونکہ یہ لوگ دین اور دنیا میں فساد ڈالنے والے ہیں چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ اس اقدام کی وجہ یہ تھی کہ جب ابن الاشعث اور عبداللہ بن جارود نے حجاجؒ سے بغاوت کی تو عراق کے قراء بھی ان کے ساتھ تھے۔ نیز بصرہ کے موالی بھی حجاجؒ کے خلاف تھے چنانچہ ان لوگوں کی یک جہتی کو ختم کرنے کے لیے اس نے انھیں متفرق کردیا تاکہ آئندہ وہ اس کے خلاف بغاوت نہ کرسکیں ۔ جن علاقوں کی طرف ان کو شہر بدر کیا گیا تھا، ان علاقوں کے نام ان کے ہاتھوں پر کھدوایئے۔(۳)

حجاجؒ کی یہ موالی دشمنی نہیں تھی بلکہ یہ ایک انتظامی معاملہ تھا۔ اگر ایک گورنر یہ محسوس کررہا ہے کہ دیہاتوں اور دیگر علاقوں سے لوگ بڑے پیمانے پر بڑے

۱۔ تاریخ ارض القرآن، صفحہ ۳۶۵،۳۷۹۔

۲۔ ایضاً، صفحہ ۳۸۰۔

۳۔ العقد الفرید، جلد ۳، صفحہ ۴۱۶۔

شہروں کی طرف ہجرت کر رہے ہیں جس کی وجہ سے امن و امان کی صورتحال بگڑ رہی ہے اور فتنہ و فساد بڑھ رہا ہے تو آخر ان مسائل سے نپٹنے کے لیے اقدامات تو کیے ہی جائیں گے۔ حجاجؒ نے یہ کاروائی اس زمانے میں کی تھی جب ابن الاشعث کی بغاوت ہوئی تھی۔ اس طور سے یہ ایک قطعی انتظامی معاملہ تھا، اس سے موالی کی تحقیر کا پہلو نکالنا کسی طور درست تجزیہ نہیں۔ حجاجؒ سے پہلے یہی انتظامی اقدام عراق میں زیاد بن ابی سفیانؒ نے بھی کیا تھا جس کے نتیجے میں انھوں نے کوفہ کے پچاس ہزار عربوں کو خراسان کی طرف منتقل کر دیا تھا۔

امیر حجاجؒ اور موالی سے قبولِ اسلام کے بعد جزیہ اور خراج کی وصولی:

موالی سے جزیہ کی وصولی:

حجاج بن یوسفؒ کا ایک اور اقدام جس پر اسے موردِ الزام ٹھہرایا جاتا ہے، وہ موالی سے قبولِ اسلام کے بعد جزیہ اور خراج کی وصولی ہے۔ اس اعتراض کا جواب دینے سے قبل سب سے پہلے تو جزیہ اور خراج کی تعریف متعین کر لینی چاہیے کہ حجاج بن یوسفؒ کے معترضین نے یہیں بنیادی غلطی کی ہے۔ جزیہ (جمع جزیٰ) کی اصل کے بارے میں دو خیالات ہیں:

۱۔ ایک تو یہ لفظ خالص عربی ہے اور جزاء سے مشتق ہے۔ اس خیال کے حامل ابن منظور (لسان العرب)، امام راغب (مفردات القرآن)، زمخشری (الکشاف)، البیضاوی (انوار التنزیل و اسرار التاویل) اور آلوسی (روح المعانی) ہیں۔

۲۔ دوسری رائے الخوارزمی وغیرہ کی یہ ہے کہ لفظ جزیہ فارسی لفظ ''گزیت'' یا ''گزیہ'' کا معرّب ہے، جس کے معنی فارسی میں خراج کے ہیں اور اس کی جمع جزیٰ ہے۔

اسلام کے ابتدائی زمانوں میں خراج اور جزیہ کے الفاظ ایک دوسرے کے

مترادف رہے ہیں۔ لسان العرب میں ابن منظور نے جزیہ کا لفظ ''زمین کا مالیہ'' یعنی خراج کے لیے بھی استعمال کیا ہے (لسان العرب، مادہ: جزیہ)۔ اسی طرح بلاذری نے فتوح البلدان میں ارضاعلیھاالجزیہمن ارض الاعاجم یعنی عجم کی زمین پر جزیہ کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ابن عبدالحکم جزیہمن ارض یعنی زمین کا جزیہ کے الفاظ کو استعمال کرتے ہیں۔[۱] دوسری طرف بہت سے ابتدائی فقہاء و مؤرخین نے جزیہ کے لیے خراج کا لفظ استعمال کیا ہے مثلاً امام ابو یوسف ''خراج وسھم'' کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔[۲] اسی طرح یعقوبی اپنی تاریخ میں خراج وسھم کا اور ابن عبدالحکم لفظ خراج کو ''محصول سر'' کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

الغرض اسلام کے ابتدائی زمانوں میں جزیہ اور خراج کے الفاظ ایک دوسرے کے مترادف رہے ہیں۔ ان کے درمیان فرق صرف مضاف الیہ سے متعین ہوتا ہے۔ مثلاً ''جزیہ علی الارض'' یا ''خراج علی الارض'' کا مفہوم ہمیشہ خراج یا مالیہ زمین (لینڈ ریونیو) تھا جبکہ ''خراج علی الروس'' یا ''جزیہ علی الروس'' کامطلب ہمیشہ جزیہ یا ''محصول سر'' (پول ٹیکس) کے معنی میں ہی مستعمل تھا۔ ان حقائق کو ذہن میں نہ رکھنے کی وجہ سے اکثر مؤرخین و معترضین نے خاصی غلطیاں کی ہیں۔ جزیہ وہ مالیہ فرد یا محصول سر (پول ٹیکس) ہے جو اسلامی حکومت اپنی غیر مسلم رعایا پر عائد کرتی ہے اور جس کے عوض وہ ان کے جان، مال، عزت و آبرو کی حفاظت کرتی ہے۔ نبی ﷺ نے یہود و نصاریٰ اور مجوس پر جزیہ عائد فرمایا اور انھیں مذہبی آزادی عطا کی۔[۳] اسی طرح غزوہ تبوک سے واپسی پر جب آپ ﷺ مدینے تشریف لائے تو مدینے، خیبر، یمن اور نجران کے تمام اہل الذمہ پر جزیہ عائد کیا اور اس مد میں نقدی کے علاوہ اسلحہ اور دیگر

۱۔ فتوح مصر، صفحہ ۵۵۔

۲۔ کتاب الخراج، صفحہ ۷۰۔

۳۔ موطا مالک، صفحہ ۲۵۲۔

سامان ادا کرنے کی بھی اجازت دی۔ جزیہ کتنا عائد کیا جائے، اس کی کوئی لگی بندھی مقدار نہیں تھی، بلکہ یہ حاکم اور امیر کی صوابدید پر منحصر تھی۔ سیدنا ابو بکر صدیقؓ نے بصریٰ کے شہریوں سے جزیہ وصول کیا تو ہر بالغ مرد پر ایک دینار اور ایک جریب گندم سالانہ کے حساب سے عائد کیا۔(۱) سیدنا خالد بن ولیدؓ نے اہل دمشق پر جو جزیہ عائد کیا، اس کی مقدار ایک دینار نقد، ایک جریب گندم اور کچھ تیل اور سرکہ تھا جبکہ سیدنا ابو عبیدہ بن الجراحؓ نے شام کے کچھ لوگوں کے ایک گروہ پر جزیئے کی ایک متعین مقدار عائد کردی، اس میں یہ شرط تھی کہ جزیہ دینے والے کم یا زیادہ ہوجائیں، تب بھی اس مقدار میں کمی یا بیشی نہیں ہوگی۔ اسی طرح کچھ لوگوں کے ساتھ یہ شرط تھی کہ ان کی استطاعت کے مطابق جزیہ وصول کیا جائے گا۔ اگر مال و دولت میں اضافہ ہوا تو جزیہ بھی بڑھ جائے گا اور اگر مال میں کمی ہوئی تو اس قدر جزیئے میں بھی کمی کردی جائے گی۔

اسی طرح سیدنا عمرؓ نے بھی شام، مصر، عراق اور ایران کے لوگوں پر جزیئے کی مختلف مقدار عائد کی۔ ابو عبید کی کتاب الاموال کے تحت سیدنا عمرؓ نے سونا رکھنے والوں پر چار دینار جبکہ چاندی رکھنے والوں پر چالیس درہم جزیہ عائد کیا اور اس کے ساتھ اہل ذمہ کو مسلمانوں کی تین دن کی ضیافت کا بھی ذمہ وار ٹھہرایا۔(۲) ایک اور روایت کے مطابق سیدنا عمرؓ کا عائد کردہ جزیہ ۲۸ درہم، ۲۴ درہم اور ۱۲ درہم تھا۔(۳) یعنی سیدنا عمرؓ اہل ذمہ سے ان کی استطاعت اور حیثیت کے مطابق جزیہ وصول کرتے تھے۔

دراصل اہل الذمہ بھی دو قسم کے تھے۔ ایک وہ اہل الذمہ تھے، جن کے علاقے

۱۔ کتاب الاموال، صفحہ ۳۲، ۳۴۔

۲۔ کتاب الاموال، صفحہ ۴۲۔ فتوح البلدان، صفحہ ۱۳۱۔

۳۔ کتاب الاموال، صفحہ ۴۲۔

فوجی طاقت کے زور پر فتح ہوئے تھے، دوسرے اہل الذمہ وہ تھے جن کے علاقے صلح کے ذریعہ فتح ہوئے تھے۔ جہاں تک فوجی طاقت کے زور پر فتح ہونے والے علاقوں کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں فقہاء کا پسندیدہ مسلک یہی رہا ہے کہ جس طرح جزیہ کی رقم میں کمی کی جاسکتی ہے، یہاں تک کہ اسے معاف بھی کیا جاسکتا ہے، وہیں جزیہ کی رقم میں اضافہ بھی کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ سیدنا عمرؓ نے ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے عائد کردہ جزیہ کی رقم میں اہل شام اور اہل کوفہ کی آسودگی کو دیکھتے ہوئے اضافہ کیا تھا[۱] اور ایک بار خود کے مقرر کردہ زیادہ سے زیادہ جزیہ یعنی ۴۸ درہم سالانہ کو بڑھا کر ۵۰ درہم سالانہ کردیا تھا کیونکہ عراق کے اہل الذّمہ اس کی استطاعت رکھتے تھے۔[۲]

دوسرے وہ علاقے جو صلح کے ذریعہ فتح ہوئے اور اہل الذمّہ خاص شرائط کے تحت جزیہ دیتے ہوں وہاں کمی بیشی جائز نہیں کیونکہ شرائطِ صلح سے جائز لینے کو نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حرام قرار دیا ہے۔[۳] جزیہ کے معاملے میں ایک اختلافی صورت امیر حجاج بن یوسف ثقفی کے دور میں نظر آتی ہے۔ انھوں نے جزیوں میں جہاں اضافہ کیا وہیں انھوں نے نومسلموں پر سے جزیہ ساقط نہیں کیا تاہم یہ کام پورے بلادِ اسلامیہ میں نہیں ہوا بلکہ صرف ان علاقوں میں ہوا جہاں حجاجؒ گورنر تھے۔ امیر حجاجؒ کے اس اجتہاد کی وجہ یہ تھی کہ ماضیٔ قریب میں موالی حکومت کے لیے بڑا خطرہ بن چکے تھے۔ مختار ثقفی کی فوج میں شامل ہوکر انھوں نے براہ راست حکومتِ وقت سے ٹکر لی تھی اور یہ کچھ بعید نہ تھا کہ کوئی اور طالع آزما پھر موالیوں کو حکومت کے خلاف استعمال کرلیتا۔ درحقیقت مختلف اقوام جو کہ مختلف خیالات اور تمدنی پس منظر سے تعلق رکھتی

۱۔ کتاب الاموال، صفحہ ۴۴۔

۲۔ ایضاً۔

۳۔ کتاب الاموال، صفحہ ۱۴۴۔

ہوں، انھیں ایک ہی قانون کا پابند بنا کر کے رکھنا ایک نہایت ہی مشکل کام ہوتا ہے اور اکثر بلا جبرِ شدید کے اس میں کامیابی حاصل نہیں ہو پاتی۔ لہٰذا اس سیاسی مسئلہ کا حل امیر حجاجؒ نے یہ نکالا کہ موالیوں کو اقتصادی طور پر دبا دیا جائے، ان پر ایسی معاشی مشکلات ڈالی جائیں کہ وہ سیاست چھوڑ کر پیٹ بھرنے کی فکر میں لگ جائیں۔ لہٰذا حجاجؒ نے یہ اجتہاد کیا کہ ''جزیہ دراصل ٹیکس کی حیثیت رکھتا ہے جو غلاموں پر عائد کیا جاتا ہے اور غلام کے اسلام قبول کر لینے سے اس پر عائد شدہ ٹیکس معاف نہیں ہوجاتا۔''(۱) تاہم جزیہ کی اس تاویل کے باوجود شرعی نقطۂ نظر سے یہ ایک مرجوح اجتہاد معلوم ہوتا ہے جو حجاجؒ اور اس کے بعض عمّال نے کیا۔ اس بابت امیر حجاجؒ کی نیت پر شک کرنے کے بجائے اس تاویل اور وجہ پر غور کرنا چاہیے جو اس سلسلے میں انھوں نے روا رکھی تھی۔ یہاں بھی حجاجؒ کا اصل مقصد موالیوں کو حکومت مخالف سرگرمیوں سے دور رکھنا تھا۔ تاہم اس کے لیے انھوں نے جو اجتہاد کیا، اس سے اختلاف رکھا جاسکتا ہے اور ہمیں بھی اس سے اس بابت اختلاف ہے۔

موالی سے خراج کی وصولی:

معترضین حجاجؒ پر الزام لگاتے ہیں کہ:

> ''ذمیوں میں سے کوئی مسلمان ہوجاتا تو اس کے ذمہ جزیہ وخراج ساقط ہوجاتا جبکہ حجاجؒ ذمیوں سے ان کے اسلام قبول کر لینے کے بعد بھی ان دونوں چیزوں کی وصولی کرتا رہا۔''

جہاں تک جزیہ کی بات ہے تو مذکورہ بالا سطور میں ہم اس پر کلام کر آئے ہیں تاہم جہاں تک رہی خراج کی بات تو حقیقت یہ ہے کہ اس بابت حجاجؒ کے معترضین نے سخت ٹھوکر کھائی ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس اعتراض سے متعلق کچھ عرض

۱۔ کتاب الاموال، صفحہ ۵۱۔

کرنے سے قبل جزیہ کی طرح خراج کی تعریف بھی طے کر لی جائے۔ خراج ایک عربی لفظ ہے جو قرآن مجید میں بمعنی اجر و صلہ کے استعمال ہوا ہے۔[1] عربی زبان میں عموماً اس کے معنی کرایہ، محصول، آمدنی، پیداوار، اجرت یا معاوضہ کے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عرب زمین کی پیداوار، گھر کے کرایہ اور مملوک غلام سے حاصل شدہ آمدنی کو خراج کہتے تھے۔ یہ لفظ لگان یا محصول کے لیے بھی بولا جاتا تھا، تاہم جیسا کہ ہم پہلے لکھ آئے ہیں کہ پہلی صدی ہجری تک عموماً جزیہ اور خراج مترادف الفاظ تھے۔

سیدنا عمرؓ کی فتوحات کے زمانے میں جب نئے مفتوحہ علاقوں کے باشندوں کو لونڈی غلام بنا کر فوجیوں میں تقسیم کر دینے کے بجائے اور ان کی زمینوں کو غنیمت کے طور پر تقسیم کر دینے یا بحق سرکار ضبط کر لینے کے بجائے ان مفتوحہ باشندوں کو ان کی مملوکہ اراضی پر بدستور قابض رہنے دیا گیا تو ان کی زمین پر محصول عائد کر دیا گیا۔ جس کے تحت مفتوحہ علاقوں کے باشندوں کو اپنی فصل اور پیداوار کا ایک مقررہ حصہ بطور خراج بیت المال میں داخل کرنا ہوتا تھا۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ مفتوحہ علاقوں کی تین قسمیں تھیں، چنانچہ اسی نسبت سے ان کے متعلق تین قسم کے احکام ہیں:

۱۔ ایک تو وہ مفتوحہ اراضی جن کے مالک اسلام قبول کر لیں اور اس بناء پر انہی کی ملکیت رہیں، ان سے عشر کے سوا کچھ وصول نہیں کیا جائے گا۔

۲۔ وہ اراضی جو ایک معین خراج ادا کرتے رہنے کی شرط پر صلح کے ذریعہ فتح ہوئی ہوں۔ ان سے شرائطِ صلح کے مطابق معاملہ کیا جائے گا اور اس سے زیادہ ان پر کوئی پابندی عائد نہیں ہوگی۔

۳۔ وہ مفتوحہ علاقے جو فوجی قوّت کے بل بوتے پر فتح کیے گئے ہوں اور یہی وہ زمینیں ہیں جن کے بارے میں مسلمانوں میں اختلاف رہا ہے۔

۱۔ سورۃ المومنون، آیت ۷۲۔

ایک جماعت کا خیال ہے کہ ایسی زمینوں کو غنیمت شمار کرتے ہوئے ان پر غنیمت کے احکام کا اطلاق کیا جائے گا، یعنی وہ پانچ حصوں میں تقسیم کر کے اس طرح بانٹ دی جائیں گی کہ ۴بٹا۵ حصے تو صرف اسے فتح کرنے والوں کو دیئے جائیں گے اور بقیہ ابٹا۵ حصہ ان میں تقسیم ہوگا، جس کا تعین اللہ نے قرآن میں کر دیا ہے۔

دوسری جماعت کا خیال ہے کہ ایسی زمینوں کا معاملہ امام کی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے گا۔ اگر وہ ان کے غنیمت ہونے کا فیصلہ کرے تو ان کے پانچ حصے کر کے تقسیم کر دیئے جائیں گے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خیبر میں کیا تھا۔ لیکن اگر امام ان زمینوں کو فئے قرار دے دے تو وہ عامۃ المسلمین کے باقی رہنے تک ان کے وقف کی حیثیت رکھیں گی (یعنی یہ اراضی اسلامی حکومت کے قبضہ میں رہیں گی اور اشخاص کی ملکیت نہیں بنائی جائیں گی)۔ بالکل اسی طرح جیسے عراق کی مفتوحہ اراضی کے متعلق سیدنا عمرؓ نے فیصلہ کیا تھا۔(۱)

اب اگر اوپر بیان کردہ دوسری قسم کے مفتوحہ علاقوں کے ذمی اسلام قبول کر لیتے تو ان پر سے جزیہ تو ساقط کر دیا جاتا مگر خراج بدستور لاگو رہتا۔ انھیں اسلام قبول کر لینے کے باوجود شرائط کی پابندی کرتے ہوئے متعینہ خراج ادا کرنا ہوتا۔ یہ ظلم اس لیے نہیں ہے کہ یہ انہی کے صلح نامہ کی پابندی ہے۔

اسی طرح تیسری قسم کے مفتوحہ علاقوں کے ذمی اگر مسلمان ہوجاتے تو ان پر سے بھی جزیہ تو ساقط ہوجاتا مگر انھیں بھی بدستور خراج ادا کرنا ہوتا کیونکہ ان خراجی اراضی کی حیثیت فئے کی ہوتی تھی اور فئے ایک طرح کا وقف ہے جس کو ختم نہیں جاسکتا تھا۔ سیدنا عمرؓ اور ان کے بعد کے تمام خلفاء کا یہی طریقہ رہا کہ خراج ادا کرنے والا ذمی اگر مسلمان ہوجاتا تو اس پر سے جزیہ ساقط کر دیا جاتا مگر خراج بدستور عائد رہتا۔ چنانچہ سیدنا علیؓ کے عہدِ خلافت میں ایک زمیندار نے اسلام قبول کر لیا تو سیدنا

۱۔ کتاب الاموال، صفحہ ۵۵۔

علیؓ نے اس سے کہا کہ:

> ''اگر تم اپنے علاقہ میں اپنی زمین پر ہی اقامت رکھو گے تو ہم تم سے جزیہ معاف کردیں گے لیکن تمھاری زمین سے خراج لیتے رہیں گے۔ اور اگر تم اپنی زمین چھوڑ کر دوسری جگہ منتقل ہوجاؤ گے تو ہم اس زمین کے زیادہ حقدار ہوں گے۔''(۱)

خلفائے راشدین کا یہی طریقۂ کار تھا اور اسی طریقے پر حجاجؒ کے بعد عمر بن عبدالعزیزؒ نے بھی عمل کیا۔ سو اگر حجاجؒ نے خراج لیا تو غلط نہیں لیا، اس نے وہی اقدام کیا جو متفق علیہ اور پہلے خلفاء اور ان کے عمال کی سنت تھی۔ معترضین حجاج بن یوسفؒ کو موردِ الزام ٹھہراتے ہوئے یہ تو لکھتے ہیں کہ حجاج نے مسلمان ہوجانے والے ذمیوں پر بدستور خراج عائد کر رکھا تھا، مگر یہ نہیں بتاتے کہ ان مسلمان ہوجانے والے ذمیوں کا تعلق کس قسم کے مفتوحہ علاقوں سے تھا۔ اگر ان کا تعلق ان مفتوحہ علاقوں سے تھا جو فوجی قوّت کے ذریعہ حاصل کیے گئے تھے تو وہ علاقے مسلمانوں کے لیے فئے ہوگئے تھے، ان زمینوں کی خریدو فروخت کو پسندیدہ نہیں سمجھا گیا، کیونکہ یہ زمینیں درحقیقت مسلمانوں کی ملکیت تھیں۔(۲) وہاں کا زمیندار اگر مسلمان ہوجائے گا تب بھی اسے خراج دینا پڑتا۔ یہ ایک فقہی فیصلہ ہے۔ اس فقہی فیصلے کے مطابق ان زمینداروں سے حجاجؒ نے ان کے اسلام قبول کرلینے کے باوجود خراج وصول کیا تو قطعاً کوئی غلط کام نہیں کیا۔

اسی طرح عراق کے جو علاقے صلح کے ذریعہ حاصل ہوئے مثلاً حیرہ، بانقیا اور اُلّیس وغیرہ وہاں کے معاملات صلح نامہ کی شرائط کے مطابق طے کیے گئے یعنی یہ کہ وہاں کی زمینیں وہیں کے باشندوں کی ملکیت رہیں گی، ان زمینوں کی خریدوفروخت

۱۔ کتاب الاموال، صفحہ ۷۲۔

۲۔ ایضاً، صفحہ ۱۲۱۔

کے معاملات انھیں کے پاس رہیں گے، تاہم صلحی زمینوں پر عائد کردہ خراج اس زمیندار کو دینا ہوگا خواہ وہ اسلام قبول کرے یا نہ کرے۔ سو اگر ان زمینوں کے باشندوں سے بھی حجاجؒ نے ان کے اسلام قبول کر لینے کے بعد بدستور خراج لیا تو یہ کام بھی قطعاً غلط یا خلاف شریعت نہ تھا۔

المختصر حجاج بن یوسفؒ کی بابت بیشتر معترضین کے اعتراضات یا تو تعصب پر مبنی ہیں یا پھر سماجی و معاشرتی رویوں کے یکطرفہ مطالعہ کا نتیجہ ہیں۔ حجاجؒ نے ہر اس عنصر کا، جو اموی حکومت کے خلاف باغیانہ روش اختیار کرتا تھا، زور توڑنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ مختار ثقفی اور ابن الاشعث کی بغاوت میں حصہ لینے کے سبب اس نے موالیوں پر بعض سخت احکام لاگو کیے، ان کو دیگر مشاغل میں ملوّث رکھا، ان کی مرکزیت کو ختم کرنے کے لیے انھیں مملکت کے دور دراز علاقوں میں تتّر بتّر کر دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس نے اہل بغی کو بُری طرح دبایا۔ اس میں عرب و موالی کی کوئی تخصیص نہیں کی۔

OOOOO

العراق فی عہد الحجاج بن یوسف ثقفی

عبدالواحد ذنون طٰہٰ

از عبدالواحد ذنون طٰہ

لیکچرار موصل یونیورسٹی ،عراق

العراق فی عہد الحجاج بن یوسف ثقفی

دکتور عبدالواحد ذنون طٰہ عراق کے شہر موصل میں ۱۹۴۳ میں پیدا ہوئے اور وہیں موصل یونیورسٹی ، عراق میں بحیثیت متخصص ''مغرب اور اندلس کی تاریخ'' کے لیکچرار ہیں۔ برطانیہ سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری ۱۹۷۸ میں''مغرب اور اندلس کی تاریخ'' میں حاصل کی۔ اکثر کتابیں اندلس کی تاریخ وحضارات پر لکھیں ، شاید اسی لیے ان کی کتابوں میں بنو امیہ اور ان کے والیوں سے متعلق حقائق سامنے آتے ہیں۔ کتاب ''العراق فی عہد الحجاج بن یوسف'' ان کے ماسٹرز کے سلسلے میں لکھے گئے مقالہ کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب میں دکتور عبدالواحد ذنون نے امیر حجاج بن یوسف ثقفیؒ کے امارات عراق کے زمانے پر تحقیق کی ہے اور کئی واقعات کی نہایت صائب اور درست توجیہہ ہدیۂ قارئین کی ہے۔ دکتور عبدالواحد ذنون کی یہ کتاب اس قابل ہے کہ اس کا اردو ترجمہ کیا جانا چاہیے۔ کتاب اپنے اندر کئی نادر حقائق اور چشم کشا معلومات رکھتی ہے۔ اسی غرض سے ہم نے مناسب سمجھا کہ امیر حجاجؒ سے متعلق اپنی اس کتاب میں عبدالواحد ذنون کی تحقیق سے بھی استفادہ کیا جائے اور قارئین کے سامنے دکتور صاحب کی اس تحقیق کے چند مفید مباحث پیش کیے جائیں۔ اسی سلسلے میں ہم نے

کتاب مذکورہ کے چند ابواب اپنی اس تالیف میں شامل کیے ہیں۔ ساتھ ہی دکتور عبدالواحد ذنون طہٰ کے مقالے کا خلاصۃ المبحث بھی شامل کیا ہے تاکہ پورے مقالے کا خلاصہ قارئین کے سامنے آجائے اور ان کو اندازہ ہو کہ دکتور طہٰ نے کس کس جہت اور سمت میں امیر حجاجؒ کی اصلاحی مساعی کا ذکر کیا ہے۔ امید ہے کہ قارئین نہ صرف ان مباحث کو معلومات افزا پائیں گے بلکہ ان کے مطالعہ کے بعد امیر حجاجؒ کی خدمات اور شخصیات کے نئے پہلوؤں سے بھی متعارف ہوسکیں گے۔ یہاں یہ بات یاد رہے کہ ہم نے بعض غیر ضروری و غیر متعلقہ مباحث سے بچنے کے لیے دکتور طہٰ کے مقالے کا لفظ بہ لفظ ترجمہ کرنے کے بجائے اس کا خلاصہ پیش کیا ہے جس میں صرف متعلقہ و ضروری مباحث کو ہی جگہ دی گئی ہے۔

امیر حجاج بن یوسفؒ کے قائم کردہ انتظامی عہدے اور ان پر عمال کا تقرر:

جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ امیر حجاجؒ کے زیر تسلط علاقہ کافی وسیع اور کئی بلاد پر مشتمل تھا، اس لیے امیر حجاجؒ کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ ان علاقوں پر ایسے عمال کو مقرر کریں جو عادل، امین اور فرائض کو بخوبی انجام دینے والے ہوں۔ اسی مقصد کی غرض سے وہ چن چن کر ایسے لوگوں کا انتخاب کرتے تھے جن میں مذکورہ اہلیتیں بدرجہ اتم موجود ہوتیں۔ ان تقرریوں کے لیے وہ کسی قرابت ، سفارش یا عصبیت کا قطعی لحاظ نہ کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ امیر حجاجؒ پورے بلادِ اسلامیہ میں اس سلسلہ میں مشہور تھے کہ ان کی کی ہوئیں تقرریوں میں سفارش یا قرابت کا کوئی دخل نہ ہوتا تھا۔[1] انھوں نے اپنے عمال کو نصیحت کر رکھی تھی کہ وہ لوگوں سے ہدایا نہ لیں کیونکہ ایسا کرنے کی صورت میں صاحبِ ہدایا اپنے معاملات میں عامل سے تخفیف

۱۔ رسائل الجاحظ، صفحہ ۱۵۶۔

حاصل کرسکتا ہے، ساتھ ہی اپنے عمال کو یہ کہہ رکھا تھا کہ لوگوں کے معاملات میں احترام اور احتیاط دونوں کا خصوصی خیال رکھیں۔(۱)

امیر حجاجؒ اپنے والیوں کے ماتحت لوگوں اور عوام کی خود بھی خبرگیری کرتے تھے اور ان کی شکایات سنتے تھے اور اگر کبھی اپنے کسی عامل کے خلاف موصول ہونے والی کسی شکایت کو جائز پاتے تو اس عامل کا فی الفوز محاسبہ کرتے تھے۔(۲) اگر کبھی کسی والی یا عامل نے اپنے محکومین میں سے کسی کی تقصیر کی ہوتی یا اس کے ساتھ کوئی بے انصافی کی ہوتی یا اس کے ساتھ برے طریقے سے پیش آیا ہوتا تو حجاجؒ اس والی کے ساتھ نہایت سختی سے پیش آتے۔(۳)

امیر حجاجؒ کے کچھ ولاۃ ایسے بھی تھے جو اس قدر وسیع اختیارات کے مالک تھے کہ اپنے ماتحت علاقوں میں والیوں کا تقرر کیا کرتے تھے لیکن ان وسیع اختیارات رکھنے والے عمال و ولاۃ پر بھی امیر حجاجؒ کڑی نگاہ رکھتے تھے اور ان عمال کی کی گئی تقرریوں کی نگرانی کرتے تھے اور ان کی بابت اپنی رائے دیتے تھے۔(۴) مثال کے طور پر حکم بن ایوب ثقفی کا معاملہ جو کہ بصرہ پر عامل تھے،انھوں نے اپنے زیرِ ولایت علاقوں پر سے کچھ عمال کو معزول کر دیا تھا۔ امیر حجاجؒ کو بعد از تحقیق معلوم ہوا کہ ان عمال کی معزولی معقول وجوہات کی بنا پر نہیں کی گئیں سو امیر حجاجؒ نے حکم بن ایوب ثقفی کو اس متعلق سخت سرزنش کی۔(۵) اسی طرح انھیں حکم بن ایوب ثقفی نے ایک دفعہ ایک تلخ خو اور درشت مزاج رکھنے والے اعرابی کو ایک علاقہ پر عامل

۱۔ محاضرات الادباء، ۱/ ۸۲۔

۲۔ الجلیس الصالح الورقہ ۱۸۸، دیوان الفرزدق ۱/ ۱۶۸۔

۳۔ البصائر والذخائر م ۲، قسم ۲، صفحہ ۵۹۷-۶۰۷، المافروخی، محاسن اصفھان: صفحہ ۷)۔

۴۔ البخلاء، صفحہ ۱۵۱-۱۵۲۔

۵۔ انساب الاشراف، جلد ۱۱، الورقۃ ۴۰ الف۔

بنادیا۔ امیر حجاجؒ کو پتہ چلا تو سخت ناراض ہوئے اور اس تقرر کی منسوخی کا حکم دیا۔[۱] صرف یہی نہیں بلکہ حساس مناصب پر مختلف علاقوں میں جو لوگ کام کرتے تھے امیر حجاجؒ ان سب کی نگرانی کرتے تھے اور ان پر کڑی نگاہ رکھتے تھے۔ جیسے کہ خراسان میں جب امیر قتیبہ بن مسلمؒ نے ایک غیر اہل شخص کو رئیس الشرطہ مقرر کیا تو امیر حجاجؒ نے فوراً قتیبہ کو خط لکھ کر اس شخص کو معزول کرنے کا حکم دیا اور اس کی جگہ اہل شخص کے انتخاب کی ہدایت کی۔[۲] عموماً اپنے زیرِ اقتدار علاقوں میں امیر حجاجؒ خود ہی صاحب شرطہ یعنی پولیس افسروں کی تعنیاتی کرتے تھے، تاہم امیر حجاجؒ یہ تعیناتی پوری چھان پھٹک کے بعد ہی کرتے تھے لہٰذا ان کے مقرر کردہ افسروں کو ان پر تعینات کوئی بھی عالم اس وقت تک معزول نہیں کرسکتا تھا جب تک کہ اس افسر کی کوئی قابلِ گرفت شکایت نہ ملے۔[۳]

امیر حجاج بن یوسف ثقفیؒ رشوت اور خیانت جیسے کریہہ افعال میں ملوّث عمال کے ساتھ نہایت سختی سے پیش آتے تھے اور ان کی سخت گرفت کرتے تھے۔ نیز حکومتی عہدیداروں میں سے جو لوگ ناجائز طریقے سے مال جمع کرتے تھے، ان کو بھی پکڑے جانے کی صورت میں کسی طور سے معاف نہ کرتے اور سخت سزائیں دیتے۔ ایک دفعہ ایک شخص علی بن ابی طالب نے امیر حجاجؒ کے ایک عامل کی انگلیاں اس وجہ سے کاٹ ڈالیں کہ وہ کسی معاملے میں خیانت کا مرتکب ہوا تھا۔ جب امیر حجاجؒ کو اس بات کا پتہ چلا تو بجائے علی بن ابی طالب کو کچھ کہنے کے امیر حجاجؒ نے اپنے ہی عامل کو سرزنش کی اور اسے تنبیہ کی کہ اگر تو نے آئندہ خیانت کی تو میں تیرے ہاتھ کا باقی حصہ بھی کاٹ دوں گا۔[۴] اسی طرح ایک دفعہ بحرین پر متعین امیر حجاج کے ایک عامل نے کچھ خیانت کی، امیر حجاجؒ کو جب پتہ چلا تو نہ صرف اس کو معزول کردیا بلکہ

۱۔ انساب الاشراف، جلد ۱۱، الورقۃ ۴۰ب۔ ۲۔ النویری: ۶/۴۷۔

۳۔ البخلاء، صفحہ ۱۴۹۔ ۴۔ الاشتقاق، صفحہ ۲۷۲۔

اس کو قید میں ڈال کر اس پر ۴۰۰۰۰ درہم جرمانہ بھی عائد کیا۔[۱]

امیر حجاج بن یوسف ثقفیؒ عاملین اور والیوں کے تقرر اور باز پرس میں ان کے حسب نسب اور قرابت کو کوئی اہمیت نہ دیتے تھے۔ چاہے یہ قرابت خود امیر حجاجؒ سے ہو یا پھر خلیفہ سے۔ یہی وجہ تھی کہ اپنی بصرہ آمد پر امیر حجاجؒ نے خالد بن عبداللہ، جو کہ خلیفہ کا مقربِ خاص تھا، کو اس کی چند کوتاہیوں اور غفلتوں پر قید کروا کر اس کا محاسبہ کرنا چاہا لیکن امیر عبدالملک بن مروانؒ آڑے آئے اور انھوں نے حجاجؒ کو اس سے الجھنے سے منع کیا تو حجاجؒ نے امیر عبدالملکؒ کے احترام میں خالد بن عبداللہ کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔[۲] اسی طرح مہلب بن ابی صفرۃ جو کہ رشتہ میں امیر حجاجؒ کے سسر بھی تھے، اہواز پر خالد بن عبداللہ کی طرف سے متعین عامل تھے۔ امیر حجاجؒ نے ان سے دس لاکھ درہم سابقہ خراج کا مطالبہ کیا۔[۳]

مالک بن اسماء بن خارجہ الفزاری جو کہ امیر حجاجؒ کے برادر نسبتی اور ان کی زوجہ ہند بنت اسماء کے بھائی تھے، سے اصبھان کی ولایت کے زمانے میں کچھ خیانت ہوگئی تھی، جب امیر حجاجؒ کو اس خیانت کا پتہ چلا تو وہ مالک بن اسماء سے کافی سختی سے پیش آئے اور ان کو قید میں ڈال دیا۔ مالک بن اسماء نے اپنے والد اسماء بن خارجہ سے کہا کہ وہ اس متعلق امیر حجاجؒ سے ان کی سفارش کریں کیونکہ امیر حجاجؒ اسماء بن خارجہ کا کافی اکرام کرتے تھے۔ لیکن اسماء بن خارجہ الفزاری نے اس بابت کسی بھی سفارش سے انکار کر دیا کیونکہ وہ سفارش اور خیانت سے متعلق امیر حجاجؒ کے مؤقف سے اچھے سے واقف تھے۔[۴] بعینہٖ امیر حجاجؒ کے ایک اور برادر نسبتی یزید بن مہلب بن ابی صفرۃ

۱۔ معجم الشعراء، صفحہ ۳۹۴، وانظر: ابن الجوزی سیرۃ عمر بن عبدالعزیز، صفحہ ۱۵۶ ففیہ ایضاً، ان الحجاج اغرم احد عمالہ علی الکوفۃ، لنفس السبب۔

۲۔ انساب الاشراف، ۴/۱۵۹۔ ۳۔ الطبری: ۲/۱۰۳۴۔

۴۔ الاغانی: ۱۶/۴۰-۴۱۔

تھے۔خراسان پر اپنی ولایت کے زمانے میں جب یزید بن مہلب اور اس کے بھائیوں سے خراج کے سلسلے میں چند بے اعتدالیاں سر زد ہوئیں تو امیر حجاجؒ نے ان سے ٦٠ لاکھ درہم کے بقایا جات کا مطالبہ کیا اور مطالبہ پورا نہ کرنے کی صورت میں یزید اور ان کے بھائیوں کو قید کردیا۔ امیر حجاجؒ کے اس اقدام کی حقانیت کے لیے یہی بات کافی ہے کہ امیر عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے دورِ خلافت میں یزید بن مہلب سے ان بقایا جات کا دوبارہ مطالبہ کیا۔ امیر عمر بن عبدالعزیزؒ سے پہلے خلیفہ سلیمان بن عبدالملکؒ بھی یزید بن مہلب سے ان پیسوں کا مطالبہ کرتے رہے تھے اور عمر بن عبدالعزیزؒ کے دور تک یزید بن مہلب نے یہ بقایا جات ادا نہیں کیے تھے۔ (١)

مذکورہ بالا تفاصیل سے یہ حقیقت مترشح ہوجاتی ہے کہ امیر حجاج بن یوسف ثقفیؒ تقررِ عمال کے سلسلے میں نہایت سخت پیمانوں کا انتخاب کرتے تھے اور اپنے عمال پر ان کے تقرر کے بعد بھی کڑی نظر رکھتے تھے۔ اسی کا کرنا تھا کہ امیر حجاجؒ کے دور کے بیشتر عاملین نہایت قابل، شریف النفس، مصلح عامہ کا خیال کرتے ہوئے عوام کی خدمت کرنے والے لوگ تھے۔ اب چونکہ امیر حجاجؒ رشوت لینے، رشوت دینے اور ناجائز طریقوں سے مال جمع کرنے والوں کو سخت ناپسند کرتے تھے اور ان کے خلاف فی الفوز تادیبی کاروائی اور اقدام کرنے سے گریز نہ کرتے تھے اس لیے بدطینت لوگوں نے ان کے اس پہلو کو نہایت مکروہ انداز میں پیش کرکے ان کی شخصیت کو مسخ کرنے کی کوشش کی۔

صاحب شرطہ یعنی پولیس آفیسر کا عہدہ ہر حکومت اور ہر دور میں معاشرے کی اصلاح اور امن و امان کے قیام کے لیے نہایت اہم عہدہ رہا ہے۔ امیر حجاج بن یوسفؒ شرطہ یعنی پولیس آفیسر مقرر کرتے ہوئے کسی عامل میں جو صفات دیکھتے تھے وہ یہ ہوتی تھیں کہ وہ سنجیدہ مزاج ہو، امین ہو، خیانت کرنے کے بارے میں سوچتا بھی نہ ہو، اس

١۔ تاریخ الیعقوبی: ٢ / ٣٤٤، الطبری: ٢ / ١٢١٣۔

کے لیے حق کے علاوہ کوئی اور چیز اہم نہ ہو اور اشراف کی سفارشوں کو کسی کے حق میں درخوراعتناء نہ سمجھتا ہو۔(۱) اسی طور سے امیر حجاجؒ کے ہاں عہدہ قضاء کے لیے بھی خاص احتیاط پائی جاتی تھی اور ان کی کوشش ہوتی تھی کہ اس عہدے پر صرف لائق اور امین آدمی ہی تعینات ہو۔ اسی لیے جب کوفہ میں قاضی شریح نے اپنی کبرسنی کے باعث اپنے عہدے سے استعفیٰ دینا چاہا تو امیر حجاجؒ نے اس وقت تک ان کا استعفیٰ منظور نہ کیا جب تک کہ اس حساس و اہم وعہدے کے لیے قاضی شریح نے اپنے ہی جیسا قابل شخص تجویز نہ کردیا(۲) یہی نہیں بلکہ عراق میں عوام کی رائے کے خلاف جاکر امیر حجاجؒ نے امام سعید بن جبیرؒ کو کوفہ کا قاضی مقرر کیا لیکن جب عوام نے ایک موالی کے عربوں پر قاضی ہونے کو سخت ناپسند کیا تو امیر حجاجؒ نے سعید بن جبیرؒ کی جگہ ابو بردہ بن ابو موسیٰ اشعریؒ کو قاضی مقرر کردیا لیکن ان کو سختی سے ہدایت کردی کہ وہ ہر معاملے میں سعید بن جبیرؒ سے مشورہ کیے بناء کوئی فیصلہ نہ دیں۔ (۳)

امیر حجاج بن یوسفؒ بغیر کسی استثناء کے اپنے تمام قاضیوں پر کڑی نظر رکھتے تھے اور ان کے مقدمات اور ان کے فیصلوں کی نہ صرف خبر گیری کرتے تھے بلکہ ان پر تبصرہ اور اپنی رائے بھی پیش کرتے تھے۔ تذکرہ نویس بیان کرتے ہیں کہ ایک مقدمہ کے دوران ایک دفعہ امیر حجاجؒ نے اپنے قاضی کو ٹوک دیا کہ ملزم سے زیادہ تو تم بات کررہے ہو، اس کو بھی بولنے کا موقع دو۔ اس پر قاضی نے جواب دیا کہ میں ملزم کے ساتھ ساتھ اس کے دو گواہوں سے بھی بات کررہا ہوں۔(۴) ساتھ ہی امیر حجاجؒ نے ہر قاضی کو ہدایت کررکھی تھی کہ اگر ان کو کسی بھی مقدمہ میں فیصلہ

۱۔ عیون الاخبار:۱/۱۶، العقد الفرید ۵/۱۹، تاریخ الخلفاء، صفحہ ۳۱۹۔

۲۔ عیون الاخبار:۱/۶۲، محاضراب الادباء:۱/۹۵۔

۳۔ طبقات ابن سعد:۶/۱۸۶، طبقات خلیفہ صفحہ ۱۵۸۔

۴۔ اخبارالقضاۃ:۱/۳۰۶۔

کرنے میں مشکل پیش آئے تو اس بابت جلد بازی دکھانے کے بجائے خود سے زیادہ قابل آدمی کی طرف مراجعت کرے۔ جیسے کہ میراث سے متعلق ایک مقدمہ میں جب قاضی کو مشکل پیش آئی تو امیر حجاجؒ نے خلیفہ عبدالملک بن مروانؒ کو اس سلسلے میں لکھا جو کہ خود انتہائی قابل و فاضل اور عالم انسان تھے اور ان سے اس بابت فتویٰ طلب کیا۔ جب خلیفہ عبدالملکؒ نے اپنا فیصلہ امیر حجاجؒ کو لکھ بھیجا تو انھوں نے قاضی کے سپرد کرتے ہوئے ہدایت کی کہ اس مقدمہ کا فیصلہ کرتے ہوئے خلیفہ عبدالملک کے فتویٰ کو پیش نظر رکھے۔ (۱)

امیر حجاج بن یوسف ثقفیؒ اور فتوحاتِ اسلامیہ:

بنو امیہ کے دور میں اسلامی سلطنت بہت زیادہ پھیل گئی تھی۔ خصوصاً ولید اوّل (یعنی ولید بن عبدالملک بن مروانؒ) کے دور میں سلطنتِ اسلامیہ نے بہت ترقی کی اور اسلامی لشکروں نے مشرق اور مغرب میں عظیم فتوحات حاصل کیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مشرق میں ولیدؒ کی یہ عظیم کامیابیاں امیر حجاج بن یوسفؒ کی کوششوں کا نتیجہ تھیں۔ اس کے لیے امیر حجاجؒ نے اسلامی علاقوں کو نہ صرف تیار کیا بلکہ مشرق میں ان فتوحات کے لیے مناسب اقدامات بھی کیے۔ اپنے جرنیلوں کی خوب حوصلہ افزائی کی اور انھیں ہر وہ چیز فراہم کی جس کی ان فتوحات کے سلسلے میں انھیں ضرورت تھی۔ ان گرانقدر مساعیوں کا نتیجہ ہوا کہ قتیبہ بن مسلمؒ نے ترکستان کے علاقے فتح کیے اور چین کی سرحدوں تک جا پہنچے جبکہ محمد بن قاسم ثقفیؒ کو سندھ اور ہندوستان کے علاقوں کو فتح کرنے پر مامور کیا۔ (۲) مجاہدین کے شوقِ جہاد کو بڑھانے کے لیے حجاج بن یوسفؒ اپنے ان عظیم جرنیلوں میں سے زیادہ فتوحات حاصل کرنے والوں کی

۱۔ اخبار القضاۃ:۱/۳۰۵۔

۲۔ البدایہ والنہایہ جلد ۹، صفحہ ۸۷۔۸۸۔

حوصلہ افزائی یوں بھی کرتے تھے کہ ان کو مفتوحہ علاقوں کی تولیت بھی دے دیتے تھے۔ قتیبہ بن مسلمؒ اور محمد بن قاسمؒ دونوں کو امیر حجاجؒ نے لکھا کہ:

ایکما سبق الی الصین فھو عامل علیھا و علی صاحبھا

''تم دونوں میں سے جس نے بھی چین کو فتح کرنے میں سبقت کی تو وہ چین اور اس کے حاکم پر عامل بنادیا جائے گا۔''(۱)

اور محمد بن قاسمؒ سے یہ وعدہ کیا کہ وہ جتنے علاقے فتح کرے گا، ان کو اس پر عامل بنادیا جائے گا۔(۲)

امیر حجاج بن یوسفؒ کو یقین تھا کہ یہ فتوحات دولتِ اسلامیہ کی قوت میں نہ صرف فائدہ مند ہوں گی اور اس کا فائدہ عمومی طور پر مسلمانوں کو ہوگا کہ اس سے عام مسلمانوں کی حالت بدلے گی اور مال و دولت کی فراوانی ہوجائے گی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ دینِ اسلام بھی دنیا میں پھیلے گا۔ وہ جانتے تھے کہ ان فتوحات پر وہ جتنا خرچ کریں گے، اس سے کئی گنا زیادہ ان فتوحات کے نتیجے میں بیت المال میں واپس آئے گا۔ پس بعد کے واقعات سے ثابت بھی ایسا ہی ہوا جیسا کہ امیر حجاجؒ نے سوچا ہوا تھا۔ بیت المال میں سے جو خرچ محمد بن قاسمؒ کے سندھ پر حملے کی مد میں کیا گیا تھا، فتحِ سندھ کے بعد بصورتِ مالِ غنیمت اس کا دوگنا واپس آیا۔(۳) اسی طرح قتیبہ بن مسلم نے بھی کثیر فتوحات کے نتیجے میں خرچ سے کئی گنا زیادہ مال بصورتِ غنائم واپس امیر حجاجؒ کی خدمت میں بھیجا۔(۴)

تاہم اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ غنائم کی کثرت اور بیت المال میں آنے

۱۔ دیوان جریر، جلد ۱، صفحہ ۲۶۵، تاریخ الیعقوبی جلد ۲، صفحہ ۳۴۹۔

۲۔ تاریخ خلیفہ، جلد ۱، صفحہ ۳۰۸۔

۳۔ فتوح البلدان، صفحہ ۵۳۸۔ الکامل فی التاریخ، جلد ۴، صفحہ ۵۳۹۔

۴۔ تاریخ بخاری، صفحہ ۸۰-۸۱۔

والے یہ مادّی فوائد ہی دراصل امیر حجاجؒ کی مشرقی فتوحات کا اصل محرّک تھے بلکہ ان فتوحات کا اصل محرّک سلطنتِ اسلامیہ کے مشرقی سرحدوں کے وہ ناموزوں حالات تھے جو کہ مشرقی سرحدوں پر اسلامی سلطنت کی فوری تقویت کے متقاضی تھے۔ خاص طور سے ان سرحدی علاقوں میں بدامنی بہت زیادہ تھی۔ ان راستوں پر چور اور ڈاکو بحری جہازوں اور قافلوں کو تنگ کیا کرتے تھے اور اس کام میں انھیں دیبل کے راجا کی حمایت حاصل تھی۔[1] اس راجا نے واضح طور پر اسلامی سلطنت کی تحقیر بھی کی تھی۔ ہوا کچھ یوں کہ جب حجاجؒ کو پتہ چلا کہ چند مسلم خواتین دیبل کے قریب ڈاکوؤں کا نشانہ بنی ہیں اور ان میں سے ایک نے اسے غائبانہ مدد کے لیے ''اے حجاجؒ'' کہہ کر پکارا بھی تھا تو امیر حجاجؒ نے فوراً دیبل کے راجہ داہر کو خط لکھا کہ عرب عورتوں کو فوری طور پر واپس بھیجو اور ان کا لوٹا ہوا مال و اسباب بھی واپس لوٹاؤ۔ راجہ داہر نے جواب دیا کہ یہ کام بحری قزاقوں کا ہے، اس لیے میں مجبور ہوں، نہ عورتیں واپس کر سکتا ہوں اور نہ مال و اسباب۔ گویا راجہ داہر نے امیر حجاجؒ کے اس مطالبے کو درخورِاعتناء نہ سمجھا۔ امیر حجاجؒ راجہ داہر کے اس جواب سے مطمئن نہ ہوئے، لہٰذا اب فوج کشی کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ بچا سو انھوں نے طاقت کے استعمال کا فیصلہ کیا ور ان علاقوں پر تسلط اور انھیں اسلامی حکومت کے زیرِنگیں لانے کے لیے ان کی طرف فوج بھیجی۔ (۲)

کچھ لوگ اور معترضین امیر حجاجؒ کی ان مہمات اور فتوحات کو ان کی ایک خاص سیاسی چال سمجھتے ہیں۔ ان کا یہ ماننا ہے کہ یہ ساری مہمات اور فتوحات صرف اس غرض سے تھیں کہ اہل عراق کو مصروف رکھا جائے، ان کو ان کے گھروں سے دور اور ان کی حربی طاقت کو منقسم رکھا جا سکے تاکہ خود امیر حجاجؒ اور حکومتِ اسلامیہ اہل

۱۔ معجم البلدان، جلد ۲، صفحہ ۶۳۸۔

۲۔ فتوح البلدان، جلد ۳، صفحہ ۵۳۴۔ طبری ۲/ ۱۲۸۶۔ معجم البلدان، جلد ۴، صفحہ ۸۸۶۔

عراق کی بغاوتوں سے محفوظ رہ سکیں اور ایسا نہ ہو کہ اہل عراق کی جنگی طاقت خود حجاجؒ کی طرف متوجہ ہوجائے۔ لیکن یہ محدود اور تنگ نظری پر مبنی رائے ہرگز ان عظیم جنگی مہمات کی وضاحت کے لیے کافی نہیں جنھوں نے اس وقت اموی سلطنت کے شرق و غرب کو گھیر لیا تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی یاد رہے کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ مشرق کی فتوحات میں صرف اہل عراق نے حصہ نہیں لیا تھا کہ ہم یہ سمجھیں کہ حجاجؒ نے عراقیوں کو مصروف رکھنے کے لیے ان مہمات کو ایک سیاسی حربہ کے طور پر اختیار کیا تھا بلکہ ان فتوحات میں اہل شام بھی کثیر تعداد میں اہل عراق کے شانہ بشانہ تھے۔[1] دراصل یہ اعتراض کرنے والے حضرات امیر حجاجؒ کے اس خطبے سے مغالطہ کھاگئے جس میں انھوں نے کہا تھا:

> ”اے اہل عراق! میں تمھارے مرض کے لیے ان مغازی اور لشکر کشیوں سے زیادہ کوئی دوا مؤثر نہیں سمجھتا کہ لوٹنے والی رات کتنی خوبصورت ہوتی ہے اور لوٹ آنے والی باری کتنی دلکش ہوتی ہے، اس لیے یقیناً اس کے بعد راحت ہوتی ہے۔“[2]

قطع نظر اس بات کے کہ یہ کلام ایک ادبی پیرائے میں کیا گیا ہے اور تاریخی مصادر سے اس کی توثیق بہت مشکل ہے، پھر بھی یہ اس بات کی دلیل نہیں بنائی جاسکتی کہ حجاجؒ نے فتوحات کی سیاست محض اہل عراق کی فطری کجی کا علاج کرنے کی خاطر اختیار کی تھی۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ امیر حجاجؒ کی توجہ شروع سے ہی فتوحات کی طرف مائل تھی، خصوصاً ماوراء النہر کے علاقوں کو فتح کرنا ان کی ترجیح تھی۔[3] یہ بھی ممکن ہے کہ بعد میں امیر حجاجؒ کو واقعی ایسا لگا ہو کہ اہل عراق کو جنگوں میں

۱۔ فتوح البلدان، جلد ۳، صفحہ ۵۳۴، طبری، جلد ۲، صفحہ ۱۲۵۸۔

۲۔ العقد الفرید، جلد ۴، صفحہ ۱۱۹۔

۳۔ گِب، صفحہ ۲۵۔

مصروف رکھنے کا یہ اضافی فائدہ بھی ہوا کہ داخلی معاملات میں تعارض کرنے سے ان کی نظریں پھر گئیں اور ان کا دھیان بٹ گیا۔ یہ رائے فتوحات کی سیاست کے نتیجے کے طور پر قبول کی جاسکتی ہے لیکن فتوحات کے لیے اس کو بنیادی مقصد قطعی نہیں بنایا جاسکتا۔

یہ امیر حجاجؒ کی لگن، تڑپ اور فتوحات کی مسئولیت کی ذمہ واری کا حوصلہ تھا کہ انھوں نے اسلام کے جھنڈے کو چین اور ہندوستان کی سرحدوں تک پہنچادیا۔ (۱)

علامہ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں:

انه لو عاش الحجاج لما اقلو قتيبه بن مسلم عن فتح بلاد الصين۔ (۲)

"اگر حجاجؒ زندہ رہتا تو قتیبہ بن مسلمؒ کو بلادِ چین فتح کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا"

یقیناً امیر حجاجؒ کا اپنے جرنیلوں کے ساتھ پختہ تعاون فتوحات کے باب میں ان کی زبردست شخصی تاثیر اور اثر و رسوخ کا مظہر ہے۔ سر گبز کا کہنا ہے:

"وسط ایشیا میں اسلامی لشکروں کی فتوحات جو کہ ولید اوّل کے دور حکومت میں ہوئیں، یہ اس تعاون تام کا نتیجہ ہیں جو کہ حجاجؒ کی متوجہ کرنے والی مہارت اور قتیبہ کی جنگی صلاحیت کے مابین موجود تھی۔" (۳)

یہ یقینی ہے کہ قتیبہ بن مسلم نے یہ فتوحات حجاجؒ کے بھرپور تعاون کے بل پر حاصل کی تھیں۔ اس لیے جب حجاجؒ نہ رہے تو پھر کوئی ایسا لیڈر اور منتظم نہ آسکا جو ان

۱۔ البدایہ والنہایہ، جلد ۹ صفحہ ۸۷،۱۱۹۔

۲۔ البدایہ والنہایہ، جلد ۹ صفحہ ۸۷-۸۸۔

۳۔ وسط ایشیا میں عربوں کی جنگی مہمات، صفحہ ۲۹۔

کی جگہ لے سکتا اور ان فتوحات کا دائرہ مزید وسیع کرسکتا۔ مابعد کے زمانے کی تاریخ اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ امیر حجاجؒ کے بعد کیسے عرب کی سیادت منقسم اور غیر مستقل ہوگئی تھی۔(۱)

پس ثابت ہوتا ہے کہ امیر حجاجؒ اور ان کا جذبہ جہاد ہی وہ اصل قوت تھے جو ان فتوحات کی پشت پر تھے اور ان کی کامیابی کا راز تھے۔ ساتھ ہی ان تمام جہادی مہمات پر غائر نظر ڈالنے سے ان فتوحات کی کامیابی کے بہت سے عوامل میں سے ایک عامل امیر حجاجؒ کی کمال تدبیر اور جاسوسی کا نظام بھی تھا، جو انھوں نے لشکروں کی تیاری اور انھیں منزل تک پہنچانے کے لیے اختیار کیا تھا۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے عوامل تھے جنھوں نے ان فتوحات کی راہ ہموار کی جیسے کہ امیر حجاجؒ نے محمد بن قاسمؒ کے لشکر کو وہ تمام لوازم مہیا کیے جن کی محمد بن قاسم کو ضرورت تھی یا ضرورت پڑ سکتی تھی اور محمد بن قاسم اور ان کے لشکریوں کی ہر چھوٹی سے چھوٹی ضرورتوں کا خیال رکھا۔(۲) پھر اس لشکر کو دو حصوں میں تقسیم کیا: ایک بحری اور دوسرا برّی اور اس بات کو یقینی بنایا کہ دیبل پر دونوں حملے بیک وقت ہوں۔(۳) ان کا اپنے جرنیلوں سے مسلسل رابطہ رہتا تھا جس کے ذریعے لشکر کو پیش آنے والی ہر چھوٹی بڑی بات سے وہ مطلع ہوتے تھے۔ محمد بن قاسم اور امیر حجاجؒ کے درمیان خطوط کا تبادلہ ہر تین دن بعد ہوتا تھا اور امیر حجاجؒ جنگ اور اس میں فتح حاصل کرنے کے بارے میں اپنی آراء اور تجاویز کثرت سے اور بروقت ان تک پہنچاتے تھے۔ امیر حجاجؒ کی پوری کوشش ہوتی تھی کہ ان مشکلات اور رکاوٹوں کو دور کریں جو ان لشکروں کو پیش آتی تھیں، اسی لیے وہ

۱۔ وسط ایشیا میں عربوں کی جنگی مہمات، صفحہ ۵۴۔

۲۔ الکامل فی التاریخ، جلد ۴، صفحہ ۵۳۸۔

۳۔ الکامل فی التاریخ، جلد ۴، صفحہ ۵۳۷۔

میدانِ جنگ کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کرتے تھے۔(۱) جب کبھی ان کے اور محاذ پر مصروف لشکر کے درمیان رابطہ منقطع ہوجاتا تھا تو ان کی بے چینی بہت بڑھ جاتی تھی اور مسلمان مجاہدین کے لیے ان کی شفقت اور توجہ میں اضافہ ہوجاتا تھا۔ لہٰذا جب سال ۸۷ھ/ ۷۰۵ء، دشمن کے محاصرے کے سبب قتیبہ بن مسلمؒ کے ساتھ امیر حجاجؒ کا پہلا رابطہ منقطع ہوا تو ان کو سخت قسم کی بے چینی اور اضطراب کا سامنا کرنا پڑا اور انھوں نے لوگوں کو حکم دیا کہ مسجدوں میں نمازوں کی پابندی کے ساتھ ساتھ مجاہدین کی سلامتی کے لیے کثرت سے دعا مانگیں۔(۲) امیر حجاجؒ اپنے جرنیلوں کو بہت زیادہ محتاط رہنے اور لشکر کے سپاہیوں کو بلاسبب خطرے میں نہ ڈالنے کی تاکید کرتے تھے۔ انھوں نے سپہ سالاروں پر لازم کردیا تھا کہ جب وہ حملہ کریں تو لشکر کے آگے آگے چلیں اور جب واپسی ہو تو لشکر کے پیچھے آئیں۔ ساتھ ہی سپہ سالاروں کو یہ بھی ہدایت دی گئی تھی کہ سپاہیوں کو تلاوتِ قرآنِ پاک کی ترغیب دیتے رہا کریں اس لیے کہ یہ ہی سب سے زیادہ محفوظ و مامون قلعہ ہے۔(۳)

یہ تھی وہ اولوالعزمی اور حکمت و شجاعت جس کے ساتھ امیر حجاجؒ نے مشرق میں فتوحات کی قیادت کی اور دشمنوں پر ایسی دھاک بٹھا دی کہ وہ بھی ان کی شجاعت، ہمت اور پاسداری کے معترف ہوگئے تھے۔ مؤرخین اور تذکرہ نویس بیان کرتے ہیں کہ دشمن و غیر مسلم بھی حجاجؒ پر بےانتہا اعتماد کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کی موت کے بعد زُنبیل کے باشندوں نے بعد کے خلفاء و عمّال کو وہ جزیہ دینا بند کردیا تھا جو وہ امیر حجاجؒ کو دیا کرتے تھے، جب ان سے اس سلسلے میں استفسار کیا گیا تو انھوں نے جواب

۱۔ طبری، ۲/ ۱۱۹۹۔ الکامل فی التاریخ، جلد ۴ صفحہ ۵۳۵۔ البدایہ و النہایہ، جلد ۹ صفحہ ۸۶۔

۲۔ تاریخ بخاری، صفحہ ۸۲۔ الکامل فی التاریخ، جلد ۴ صفحہ ۵۲۸۔ طبری، ۲/ ۱۱۸۱۔ البدایہ و النہایہ، صفحہ ۹، جلد ۶۱۔

۳۔ طبری ۲/ ۱۱۸۱۔ العقد الفرید، صفحہ ۴ صفحہ ۲۱۸۔ البدایہ و النہایہ، جلد ۹ صفحہ ۶۱۔

دیا کہ امیر حجاجؒ وہ بندے تھے جو مقصد کے حصول کے لیے مال خرچ کرنے میں بخل نہیں کرتے تھے اگرچہ بدلے میں انھیں ایک درہم بھی واپس ملنے کی امید نہ ہو جبکہ تمھارا حال یہ ہے کہ تم اس وقت تک ایک درہم خرچ نہیں کرتے جب تک تمھیں اس کے بدلے دس درہم ملنے کی طمع نہ ہو۔(۱) گویا ہماری حفاظت کے لیے امیر حجاجؒ جزیہ کی پرواہ نہیں کرتے تھے کہ کتنا آتا ہے، ان کا مقصد صرف رعایا کی حفاظت ہوا کرتا تھا۔

خلاصۃ البحث:

اس مقالہ میں ہم نے قارئین کے سامنے حجاج بن یوسفؒ کے دور کی تاریخ ِعراق پیش کی ہے۔ امیر حجاجؒ وہ شخصیت ہیں جن کی ذات سے متعلق مختلف شبہات لوگوں کے ذہنوں میں پائے جاتے ہیں اور جن کی شخصیت اور دورِ حکومت سے متعلق کافی اختلافِ رائے دیکھنے میں آتا ہے۔ بعض حضرات نے حجاجؒ کے دفاع کا کام کیا ہےاور بعض نے ان پر بہت سے الزامات لگانے کی کوشش کی ہے ، ان کی شخصیت کو مسخ کرتے ہوئے عراق میں ان کے عہدِ حکومت کو بدنما بنا کر پیش کیا ہے۔ اس بحث میں میں نے جہاں ان کے ایجابی پہلو مثلاً ان کی عمدہ سیاست ،احسن تنظیم اور اعلیٰ عسکری خدمات کو پیش کرنے کی کوشش کی وہیں میں نے ان پر لگنے والے الزامات کا بھی تحقیقی جائزہ لیا۔ اس تحقیق کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان پر لگنے والے الزامات کی اکثریت بنیادی مصادر کے ذریعہ علمی بحث و نقد کے سامنے مکمل طور پر زمین بوس ہوگئی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ امیر حجاجؒ نے اپنے دورِ حکومت میں غلطیوں کا بھی ارتکاب کیا جس کی وجوہات ان کی طبیعت میں موجود جلد بازی ،بے صبری ،بعض

۱۔ فتوح البلدان، صفحہ ۴۹۳۔ اخبار القضا، جلد ۱ ،صفحہ ۳۵۶۔

اوقات دوسروں پر عدم اعتمادی اور بعض امور کے نتائج سے متعلق غلط اندازے تھے۔ البتہ ہمارے لیے یہ جائز نہیں کہ ہم ان کے پورے عہد کو ہی خطاؤں سے پُر بنادیں اور بغیر حقیقت جانے ان پر مختلف الزامات کا اعادہ کریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ امیر حجاجؒ کے بارے میں سخت دلی ، خونریزی اور ناحق قتل و غارت کی شہرت مبالغے پر مبنی ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ امیر حجاجؒ نے لوگوں کو قتل کیا مگر صرف تب جب انھوں نے اطاعت سے ہاتھ کھینچا اور مملکت کی نافرمانی کی۔ اس کے باوجود بہت سے مواقع پر انھوں نے عفو و درگزر سے کام لیا خاص کر جب ان کے مخالفین اور باغیوں کی طرف سے ندامت کا اظہار ہوا اور انھوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کیا۔ اسی طرح ان کے زمانے میں لوگوں کے جیلوں میں پھینکے جانے سے متعلق جو باتیں مشہور ہیں وہ بھی مبالغہ پر مبنی ہیں۔ اسی طرح (علمی بحث و تحقیق کے بعد) امیر حجاجؒ پر تعصب اور علویوں اور ان کے انصار کے خلاف دشمنی کے بھی کوئی ثبوت نہیں ملے۔

بے شک ان کے دور کے سیاسی حالات ایسے تھے جس نے حجاج بن یوسفؒ کو اُن اقدامات پر مجبور کیا جن کی وجہ سے وہ بدنام ہیں۔ امیر حجاجؒ نے عراق کی ولایت تب سنبھالی جب وہاں بدامنی اور بغاوتوں کی کثرت ہوگئی تھی، ان کے سامنے صرف ایک ہی راستہ تھا کہ وہ (قیام امن اور اصلاح احوال کے لیے) آہنی ہاتھ کا استعمال کریں اور باغیوں کا صفایا کریں۔ لہٰذا انھوں نے ان بغاوتوں اور فتنے کی آگ کو سختی سے بجھایا جس کی وجہ سے لوگوں میں ان کے لیے حسد و نفرت پیدا ہوگئی۔ ان کے مخالفین میں سے کوئی ایسا نہیں جو ان سے نفرت نہ کرتا ہو اور بنو امیہ کی معزولی میں اس کی مصلحت نہ ہو۔ زبیری امیر حجاجؒ سے اس لیے نالاں تھے کہ وہ حجاز وعراق میں ان کی حکومت کے سقوط کا ذمہ دار تھے،اشاعثہ کی ان سے دشمنی کی وجہ یہ رہی کہ انھوں نے عبدالرحمن بن اشعث کے خروج کو ناکام بنا دیا اور مہالبہ اس لیے ناراض ہیں کہ انھوں نے یزید بن مہلب کو خراسان کی ولایت سے محروم کیا، علوی اس لیے ان کو

ناپسند کرتے تھے کہ انھوں نے ان کی خواہش کے برعکس عراق میں بنی امیہ کے حکم کو مضبوط کیا۔ اسی طرح خوارج پر ان کے کامیاب حملوں نے خوارج کو غضب ناک کیا۔ اس طرح امیر حجاجؒ کے کئی بڑے بڑے دشمن پیدا ہوگئے جن میں شعراء بھی تھے ، ادیب بھی تھے اور روات بھی جنھوں نے ان کی اخطاء سے متعلق روایات گھڑیں اور ان پر اپنے انتقامی جذبات کی تسکین کے لیے جھوٹ باندھا۔

اس دور کے اچھے مطالعہ کے لیے لازم اور ضروری ہے کہ انسان ان احوال کا اعتبار کرے جن میں امیر حجاجؒ نے عراق کی ولایت سنبھالی اور غور و خوض کرے کہ ان کے سخت اقدامات کے اسباب کیا تھے۔ اگر ہم نے حجاجؒ پر اس دور کے حالات کی رعایت کیے بغیر حکم لگایا تو یہ علمی طور پر غلط رویہ ہوگا۔ اور یہ طریقہ درست نہیں کہ ہم حجاجؒ کی سختی وقتل و غارت کا ذکر تو کریں مگر ان حالات کا ذکر نہ کریں جن کے تحت ان کو یہ کام کرنے پڑے اور نہ ان تحریکوں کا ذکر کریں جن سے اس کا سامنا تھا۔

امیر حجاجؒ کی ادارتی اور تنظیمی خدمات حجاجؒ کے عراق میں کارناموں میں سب سے نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔ وہ مختلف آفیسرز کی نگرانی و احتساب کرتے تھے اور ان کے غلط کاموں پر ان کی گرفت کرتے تھے۔ انھوں نے مختلف مناصب پر اہل افراد کا تعین کیا، فوجوں کی تنظیم نو کی اور حدود کا نفاذ کیا۔ دواوین کی تعریب میں بنوامیہ کی پالیسی کو نافذ کیا یعنی حجاجؒ وہ پہلے شخص ہیں جس نے دولتِ بنو امیہ کی سرکاری زبان کو فارسی سے عربی میں تبدیل کیا جس سے معاشیات اور ادرایات کے میدان میں عظیم فوائد حاصل ہوئے۔ اس کے علاوہ انھوں نے امیر عبدالملک بن مروانؒ کی ہدایات پر چاندی کی اسلامی کرنسی کا اجرا کیا۔ اس عظیم کارنامے کے جو ایجابی اثرات پوری مملکت میں مرتب ہوئے اس کے بیان کے لیے ایک ضخیم کتاب درکار ہے۔ اس کے علاوہ امیر حجاجؒ نے زراعت کے میدان میں بھی نمایاں خدمات انجام دیں۔ اس نے

کسانوں کو جانوروں اور کھیتوں سے متعلقہ سہولیات عطا کی آسان قرضے فراہم کیے نہروں کی کھدائی کا انتظام کیا جس سے ملک کی خوش حالی میں اضافہ ہوا۔

المختصر عراق میں اپنی گورنری کے زمانے میں حجاجؒ کی مختلف جہت میں مساعی اور تعمیری اقدام اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کے سامنے اس کی انتظامی معاملات میں سختی اور باغیوں کے خلاف سخت رویوں کو نظرانداز کرنا چنداں مشکل نظر نہیں آتا۔ امیر حجاجؒ خیر القرون کی ان چند شخصیات میں سے ہیں، جن کے مجموعی خیر نے ان کی غلطیوں کو ڈھانپ لیا ہے۔ اسلامی تاریخ میں جب بھی جہادِ اسلامی کا ذکر آئے گا تو اس بطلِ جلیل کے بغیر فتوحات کا تذکرہ نامکمل رہے گا۔

OOOOO

عہدِ حجاجؒ کی معاشرتی اصلاحات

پروفیسر ڈاکٹر محمود زیادة

از پروفیسر ڈاکٹرمحمود زیادۃ

لیکچرار بیروت یونیورسٹی، لبنان

عہدِ حجاجؒ کی معاشرتی اصلاحات

ڈاکٹر محمود زیادۃ عصرِ حاضر کے ایک جدید مؤرخ ہیں جنھوں نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لیے امیر حجاج بن یوسف ثقفیؒ پر ''الحجاج بن یوسف الثقفیؒ۔ المفترئ علیہ'' کے نام سے مقالہ تصنیف کیا تھا۔ ڈاکٹر محمود زیادۃ کا یہ مقالہ تاریخِ اسلامی کے بنیادی مصادرو ماخذ پر ان کی دسترس اور کامل عبور پر شاہد ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے نہ صرف مسلمان مؤرخوں کی تصنیف کردہ اسلامی تاریخ کا دقتِ نظری سے مطالعہ کررکھا ہے بلکہ ساتھ ہی مستشرقین نے اسلامی تاریخ کی بابت جو کچھ لکھا ہے، اس پر بھی انکا مطالعہ کافی وشافی ہے۔ اپنے دکتورے کے اس مقالہ میں پروفیسر محمود زیادۃ نے امیر حجاج بن یوسفؒ کی سیرت پر لگے کئی الزامات کا نہایت جز رسی کے ساتھ تحقیقی تجزیہ کرکے ان کا غلط و غیر ثابت ہونا مبرہن کیا ہے۔ ڈاکٹر محمود زیادۃ کا یہ مقالہ جامد تقلید کے اس دور میں ایک عمدہ تحقیقی کاوش قرار دیا جاسکتا ہے جس میں ڈاکٹر محمود نے درایت کے ساتھ ساتھ روایت کی کسوٹی پر بھی حجاج مخالف ہر

حکایت کو پر کھا ہے۔ اگر اللہ کی توفیق شاملِ حال رہی اور زندگی نے ساتھ دیا تو ان شاءاللہ کوشش ہوگی کہ اسلامی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے طلباء کے لیے اس عربی مقالے کا اردو ترجمہ کرواکر اس کو شائع کیا جا سکے۔ تاہم فی الحال اپنی اس کتاب کے مضمون سے مناسبت رکھنے کی وجہ سے ہم اس مقالے کے چند صفحات جو کہ امیر حجاج بن یوسفؒ کی ''معاشرتی اصلاحات'' سے متعلق ہیں، اپنی کتاب میں شامل کررہے ہیں۔ امید ہے کہ قاری ڈاکٹر محمود زیادۃ کی پیش کردہ ان تحقیقات کو معلومات افزا پائیں گے اور امیر حجاجؒ کی سیرت کے چند نئے گوشوں سے متعارف ہوں گے۔

امیر حجاج بن یوسفؒ کی معاشرتی اصلاحات:

حجاج بن یوسف اپنے دور میں صرف سیاسی سرگرمیوں تک محدود نہیں رہے تھے اور نہ ہی ان کی کاوشیں بغاوتوں کو دبانے اور فتوحات کے لیے لشکروں کو بھیجنے پر موقوف تھیں بلکہ وہ ایک ایسے گورنر تھے جو ایک بہترین منتظم ہونے کی حیثیت سے ہمیشہ دینی اور اجتماعی مفاد کے لیے بھی سرگرم رہتے تھے۔ اسی وجہ سے امیر حجاجؒ نے اپنے دورِ گورنری میں کئی معاشرتی اصلاحات بھی کیں جن میں قرآن کریم کی حفاظت کے لیے مناسب اقدامات کرنا، عربی سِکّوں کے اجراء کے لیے ٹکسال قائم کروانا، سرکاری دیوان یعنی ریکارڈز کا فارسی اور دوسری غیر عرب زبانوں سے عربی میں ترجمہ کروانا، زرعی ترقی کے لیے مختلف اقدامات کرنا ،نئے شہروں کی تعمیر کروانا اور بحری بیڑوں پر خصوصی توجہ دینا وغیرہ شامل ہیں۔

قرآن کریم کے لیے حجاج بن یوسفؒ کی خدمات:

اگر ہم دینی میدان کی بات کریں تو اس بات پر اجماع ہے کہ امیر حجاج بن یوسفؒ کا شمار صفِ اول کے ان مسلمانوں میں ہوتا ہے جنھوں نے کتاب اللہ کی حفاظت کے لیے جد وجہد کی۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کو قرآن کریم سے غیر معمولی لگاؤ اور تعلق تھا۔ وہ ہر رات قرآن کی تلاوت کیا کرتے تھے۔[۱] جیسا کہ کچھ روایات میں اس کا ذکر ہے یا وہ ہر رات ایک چوتھائی قرآن کی تلاوت کیا کرتے تھے جیسا کہ کچھ دیگر روایات میں مذکور ہے۔[۲] ابن جوزیؒ روایت کرتے ہیں کہ حجاج بن یوسفؒ آدھی رات کو ایک رکعت میں پورے قرآن کریم کی تلاوت کیا کرتے تھےاور ماہِ رمضان میں مغرب اور عشاء کے درمیان قرآن کی تلاوت ان کا معمول تھا۔[۳]

قرآن سے امیر حجاجؒ کے اسی غیر معمولی لگاؤ کی وجہ سے ان کی شدید خواہش تھی کہ قرآن مجید اس بات سے بالکل محفوظ ہوجائے کہ اس میں کسی بھی قسم کی تحریف یا اس کی تلاوت میں کسی دوسرے لہجے کی آمیزش کا خدشہ باقی رہے۔ اس بات کو ممکن بنانے کے لیے انھوں نے قرآن کریم کا مراجعہ کر نے، اس کے الفاظ پر نقطے لگانے ،حروف پر حرکات (یعنی زبر، زیر، پیش) واضح کرنے اور ان کو الگ الگ کرنے کا حکم دیا۔ آپ نے اس طرح کے کئی ایک مصاحف تیار کروائے اور ان کو مختلف ممالک میں بھیجا تا کہ لوگ قرآن مجید کے معاملے میں اختلاف کا شکار نہ ہوں۔

ان سب اقدامات کے پیچھے بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہ مصحف جو ہجرت کے تیسویں سال خلیفہ سوم عثمان بن عفانؓ نے مقرر کیا تھا اس پر نہ تو نقطے تھے اور نہ ہی حرکات تھیں۔ پھر جب اسلام میں ان لوگوں نے داخل ہونا شروع کیا جو کہ عرب نہیں تھے

۱۔ السجستانی۔ المصاحف، جلد ۱، صفحہ ۱۲۰ والعینی، جلد ۱۱، صفحہ ۴۰۰۔

۲۔ القرطبی۔ الجامع الاحکام القرآن، جلد ۱، صفحہ ۵۶۔۔

۳۔ ابن الجوزی مختصر صفوۃ الصفوۃ صفحہ ۱۵۱۔

یعنی فارس و روم کے باشندے وغیرہ اور زبانوں کے مختلف لہجے عام ہونے لگے تو اس بات کا خدشہ محسوس ہوا کہ قرآن مجید کو ان عجمی لہجات میں پڑھا جانے لگے گا۔ اس وقت زیاد بن ابوسفیانؒ نے ابو اسود دولی کو طلب کیا کہ وہ لوگوں کے لیے ایسی علامات مقرر کریں جن سے ان کی قراءت درست رہے۔ پس انھوں نے ہر لفظ کے آخری حرف پر حرکات وضع کیے۔طریقہ یہ اختیار کیا کہ انھوں نے زبر کو حرف کے اوپر نقطہ بنا کر واضح کیا اور زیر کو حرف کے نیچے نقطہ بنا کر ،اور پیش کو حرف کی ایک طرف نقطہ بنا کر واضح کیا اسی طرح انھوں نے تنوین والے حرف پر دو نقطے لگائے۔ لیکن اس سب کے باوجودلوگوں کی زبانیں قرآن مجید کے اصل لہجے کو یاد نہ کر پائیں،جس کی وجہ سے قراءت میں تحریف اور غلطیاں نمودار ہونے لگیں۔

یہ تحریف وتصحیف امیر حجاج بن یوسفؒ کے زمانے میں مزید پھیل گئی جس نے ان کو خوف زدہ کردیا اور انھوں نے پختہ ارادہ کیا کہ وہ ان اختلافات کا کوئی حتمی حل نکالیں گے۔ اسی مقصد کے پیشِ نظر امیر حجاجؒ نے اپنے کاتبوں سے مطالبہ کیا کہ وہ ملتے جلتے حروف کی علامات وضع کریں جس کے نتیجے میں لفظوں کے پہلے ،درمیانے اور آخری حروف پر نقطے اور حرکات لگائے گئے۔(۱)

نصر بن عاصم لیثی نے اس کام کی ابتداء کی۔ پس اس نے جدا جدا اور جوڑوں کی شکل میں نقطے وضع کیے مگر ان کے مقامات کو ایک دوسرے سے الگ رکھا تا کہ ان میں مشابہت نہ رہے۔ اس کے بعد عرصہ دراز تک لوگ اسی طرز پر قرآن کریم کو لکھتے رہے مگر یہ سب بھی قرآن میں واقع ہونے والی تحریف سے محفوظ رکھنے کے لیے کافی نہیں تھا(۲) جس کی بنا پر امیر حجاج بن یوسفؒ نے قرآن کریم کی مستقل حرکات

۱۔ ابن خلکان جلد ا صفحہ ۵۵ والتعریف بالقران الشریف صفحہ ۹۲۔

۲۔ ابن خلکان، جلد ا ،صفحہ ۵۵ ونولد کہ تاریخ القرآن، جلد ۳ ،صفحہ ۱۰۳، ۲۶۲۔

کی ذمہ داری حسن بصری اور یحییٰ بن یعمر کے زیرنگرانی ایک کمیٹی بنا کر اس کو سونپ دی۔[۱] مزید برآں امیر حجاج بن یوسفؒ نے قراء، حفاظ اور کاتبوں کو جمع کیا اور ان سے مطالبہ کیا کہ وہ قرآن کریم کے حروف کا شمار کریں اور اس کا نصف، ثلث، ربع اور سبع کا تعین کریں۔ جس پر ان لوگوں نے یہ کام چار ماہ میں مکمل کیا۔[۲] تاہم جہاں تک قرآن مجید پر علامات کی بات ہے تو ایک روایت کے مطابق یہ کام بھی حجاج نے کیا جبکہ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ کام مامون الرشید نے کروایا۔[۳]

جس طرح امیر حجاج بن یوسفؒ کو سیاسی امور کے متعلق تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور اس سلسلے میں ان پر کئی ایک الزامات لگائے جاتے ہیں بعینہٖ وہیں مصحف عثمانی میں تبدیلی کرنے کا الزام بھی ان پر لگایا جاتا ہے جیسا کہ سجستانی اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے گیارہ حروف تبدیل کیے ہیں۔[۴]

چونکہ یہ ایک ایسا بہتان ہے کہ اگر اس کو صحیح مان لیا جائے تو نہ صرف امیر حجاجؒ کو دائرہ اسلام سے خارج مانا جائے گا بلکہ اللہ کی کتاب قرآن کریم بھی مشکوک ہو کر رہ جائے گی۔ جبکہ اس قرآن کی صفت یہ ہے کہ اس کے پس و پیش سے اس میں کوئی غلط چیز داخل نہیں ہوسکتی۔ اس لیے ہم نے اس بات کا ارادہ کیا کہ اس روایت کی چھان بین کی جائے تاکہ یہ بالکل ثابت ہوجائے کہ یہ محض ایک من گھڑت الزام ہے جو امیر حجاجؒ کے مخالفین کی طرف سے ان پر لگایا جاتا ہے۔

جب ہم اس روایت میں موجود راویوں کو دیکھتے ہیں تو ہم اس میں عبداللہ بن ابو داؤد سجستانی ''کتاب المصاحف'' کے مصنف کو مجروح پاتے ہیں جن کو خود ان کے

۱۔ القرطبی، جلد ۱، صفحہ ۵۴۔

۲۔ راجع السجستانی، جلد ۱، صفحہ ۱۱۹، ۱۲۰ والقرطبی، جلد ۱، صفحہ ۵۵، ۵۶۔

۳۔ القرطبی، جلد ۱، صفحہ ۵۴۔

۴۔ راجع المصاحف للسجستانی جلد ۱ صفحہ ۴۹، ۵۰، ۱۱۷۔

والد نے ہی جھوٹا قرار دیا ہے[۱] جبکہ اس روایت کا دوسرا راوی عباد بن صہیب جو کہ متروک الحدیث راویوں میں سے ایک ہے۔[۲] المختصر روایتاً یہ حکایت ان دو مجروح راویوں کی وجہ سے سخت ضعیف ہے جس کی بناء پر امیر حجاجؒ پر اس طرح کا کوئی الزام عائد نہیں کیا جاسکتا۔ یہ تو اس حکایت پر روایتاً بحث تھی، جبکہ درایتاً بھی یہ روایت سخت قابلِ اعتراض قرار پاتی ہے۔ اگر اس واقعہ پر تفصیلی نظر ڈالی جائے تو یہی حتمی نتیجہ نکلتا ہے کہ سجستانی کی روایت کے برخلاف امیر حجاجؒ نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ پس اگر وہ مصحف عثمانی میں کسی قسم کی تبدیلی کا ارتکاب کرتے تو یہ بات ان کی زندگی میں ہی پھیل جاتی ،نتیجتاً حجاجؒ کو صحابہ اور تابعین کی طرف سے شدید انکار کا سامنا کرنا پڑتا اور وہ اس جرم پر حجاج کی تکفیر کا پروانہ جاری کرچکے ہوتے۔ کیونکہ ہم یہ تصور بھی نہیں کرسکتے کہ وہ لوگ حجاج سے ڈر گئے تھے اور اس اہم اصولی مسئلے پر خاموش ہوگئے تھے جس مسئلے پر خاموشی کی توقع کسی ایک عام مسلمان سے بھی نہیں کی جاسکتی ،اگر چہ اس کی گردن پر تلوار ہی کیوں نہ سونت دی گئی ہو۔ اور بالفرض محال اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ عراق کے رہنے والے صحابہ اور تابعین حجاجؒ سے ڈر کر اس مسئلے پر خاموش ہوگئے تھے تو شام اور حجاز میں رہنے والے صحابہ اور تابعین کیسے خاموش رہ سکتے تھے؟

چلو اگر یہ مان لیا جائے کہ وہ تمام لوگ حجاجؒ کے قہر کی وجہ سے ان کی زندگی میں خاموش رہے تو یہ کہاں کی معقول بات ہوئی کہ وہ سب ان کی وفات کے بعد بھی خاموش رہے اور اس مسئلے پر کوئی قدم نہیں اٹھایا؟ اگر اس وقت کے تمام صحابہ ،تابعین اور کبار علماء کسی بھی سبب سے اس مسئلے میں خاموشی اختیار کرتے ہیں ،تو اس وقت کے خلیفہ کو اپنے گورنر کی اس حرکت پر کس چیز نے خاموش رکھا؟ پھر اگر

۱۔ میزان الاعتدال، جلد ۱، صفحہ ۴۳۔

۲۔ ایضاً، جلد ۲ ،صفحہ ۱۰۔

ہم یہ بھی فرض کرلیں کہ اس وقت کا خلیفہ کسی بھی نامعلوم وجہ سے اس بڑی معصیت اور اس عظیم جرم پر خاموش رہا تو کیا اموی حکومت میں امیر حجاجؒ کی وفات کے بعد کوئی بھی ایسا خلیفہ نہ آیا جو اپنے رب کی معرفت رکھتا ہو کہ وہ اس کتاب کو اس کی سابقہ غیر محرّف ہیئت میں بحال کردیتا؟

اور جب حجاج نے مصحف عثمانی میں ۱۱ رحروف تبدیل کردیے تھے تو کیا اب یہ مصحف، مصحف عثمانی تھا یا یہ مصحف حجاج بن گیا تھا؟ تو پھر سجستانی نے اس عرصے کے متعلق کیوں نہیں بتایا کہ جس میں مصحف حجاج کو دوبارہ مصحف عثمانی میں تبدیل کیا گیا ہو جو آج تک رائج ہے؟

اور پھر اگر ہم اس مسئلے کو تاریخی تناظر میں دیکھیں تو ہم ایک دفعہ دوبارہ یہ بات تاکید سے کہہ سکتے ہیں کہ حجاج بن یوسف نے مصحف عثمانی میں کسی تحریف اور تبدیلی کے لیے کسی بھی قسم کی کوئی دست درازی نہیں کی تھی۔ ورنہ تاریخ دان ہر طرف سے ان کی اس غلطی پر حملہ آور ہوتے ،جبکہ ہم ان تاریخ دانوں کو دیکھتے ہیں کہ کس طرح سے وہ حجاج پر ان معمولی اور ہلکے کاموں کی وجہ سے غصے کا شکار ہیں اور پوری دنیا کو اس کے خلاف کھڑا کررہے ہیں جب کہ حالت یہ ہے ان کاموں کے متعلق وہ خود اختلاف رائے کا شکار ہیں چہ جائیکہ وہ اتنے بڑے حادثے پر خاموش رہے جبکہ حالت یہ ہو کہ ان کے پاس حجاج کے خلاف اتنی بڑی دلیل موجود تھی؟!

تحریف قرآن کا یہ قصہ جس کو سجستانی نے روایت کیا ہے مستشرقین میں سے اس قصے پر نولدکہ ایمان لایا اور بار بار اس نے اس قصہ کی تکرار اپنی تصانیف میں کی۔ اس نے امیر حجاجؒ کی طرف یہ منسوب کیا کہ انھوں نے قرآن کریم کو ایک ہی مصحف پر برقرار رکھنے کے لیے وہی کام سر انجام دیے جو کام سیدنا عثمان بن عفانؓ نے انجام دیے تھےاور انھوں نے مصحف ابن مسعودؓ کے استخفاف کی کوششیں کی جبکہ کوفہ میں اس وقت مصحفِ ابن مسعودؓ کو پڑھنے والے لوگ موجود تھے۔

ہمارے اندازے کے مطابق امیر حجاج بن یوسفؒ کا یہ موقف اس وجہ سے تھا کیونکہ وہ خود مصحف عثمانیؓ کی صحت کے قائل تھے۔ ان کو ڈر تھا کہ سیدنا عبد اللہ بن مسعودؓ کا گروہ جوان کے مصحف کی تلاوت کرتے ہیں جس میں مصحف عثمانی کے ساتھ اختلاف پایا جاتا ہے، کہیں امت میں اختلاف کا سبب اور قرآن کے محرف ہونے کی وجہ نہ بن جائے۔ جبکہ مصحف عثمانی پر جمہور صحابہ کا اتفاق پایا جاتا ہے۔ اسی طرح وہ اپنے علاوہ دوسروں کے لیے کشادہ لفظوں پر مشتمل نسخوں کو بہتر خیال کرتے تھے۔ اسی وجہ سے انھوں نے مصحف عثمانی پر اکھٹا ہونے کا حکم جاری کیا اور اس کے علاوہ کسی دوسرے مصحف کی تلاوت سے منع کردیا تھا۔ پس پھر اگر ابن مسعودؓ کا گروہ یہ بات کہے کہ حجاج نے قرآن میں تحریف کی ہے تو ان کے مطابق ٹھیک ہے کیونکہ حجاج نے ان کے مصحف میں تو تحریف کی تھی ،جبکہ عام مسلمانوں کی نظر میں یہ بات درست نہیں ہے کیونکہ انھوں نے مصحف عثمانی میں کوئی تحریف نہیں کی تھی۔

اگر ہم مستشرق بربیہ کی بات کریں(۱) تو وہ امیر حجاج بن یوسفؒ پر تحریف ِقرآن کا الزام اس طرح ثابت کرتا ہے کہ یعقوب الکندی المسیحی نے دیکھا کہ امویوں نے قرآن پاک میں اپنے خاندان کے متعلق خصوصاً سیدنا ابو سفیانؓ کے متعلق،جو ان کے جد امجد تھے،کچھ جرح وتنقید پر مشتمل اشارے پائے تو امیرحجاج بن یوسفؒ نے خلیفہ عبد الملک بن مروانؒ سے یہ درخواست کی کہ وہ قرآن کے سابقہ نسخوں اور صحیفوں کو تلف کردیں اور کچھ مخصوص فقروں کو حذف کرکے اور کچھ فقروں کا اضافہ کرکے از سر نو ان کی کتابت کا اہتمام کروائیں۔ بربیہ کے مطابق حجاج پر لگنے والی تحریف کی یہ تہمت خارج از امکان نہیں ہوسکتی ہے۔

ہمارے خیال سے مستشرق بربیہ کو چاہیے تھا کہ وہ امیر حجاجؒ کے خلاف کوئی فرد جرم عائد کرنے کے لیے کسی مستند اسلامی مصدر پر اعتماد کرتے بجائے اس کے

۱۔ الحجاج کما تراہ المصادر العربیہ، صفحہ ۲۵۶۔

کہ وہ یعقوب الکندی المسیحی کی کوئی عبارت نقل کرتے !! جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ بات ایک بے بنیاد تہمت ہے جس کی کوئی اصل نہیں۔ قرآن کریم خلیفہ اول ابو بکر صدیقؓ کے دور میں جمع کیا گیا اور پھر اس کا ایک نسخہ ام المومنین سیدہ حفصہ بنت عمرؓ کے پاس رکھوایا گیا جو مصحف عثمانی کے بعد بھی موجود تھا۔

اس مصحف میں جو کچھ موجود تھا وہ آج کے موجودہ معروف و رائج مصاحف میں موجود ہے۔ اگر اس مصحف میں کوئی تنقیدی اشارات اموی خاندان کے متعلق موجود ہوتے جیسا کہ الکندی بیان کرتا ہےتو وہ تمام اشارات آج بھی موجود رہتے جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ حقیقت میں ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔

سو مذکورہ بالا مبحث کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ بات بالکل ناممکن ہے کہ امیر حجاجؒ نے مصحف عثمانی کی تحریف کے لیے کوئی دست درازی کی ہوگی، اور علمی بنیادوں پر الکندی اور مستشرق بربیہ جیسے لوگوں کی تہمت نہایت ہی بے بنیاد اور حقیقت سے از حد دور ہے۔

امیر حجاج بن یوسفؒ کا عربی سِکّوں کے اجراء کے لیے ٹکسال قائم کروانا:

دور جاہلیت میں بلادِ عرب میں فارسی اور یونانی کرنسی عام مستعمل تھی۔ جب اسلام آیا تب بھی اہل عرب اسی کے ذریعے معاملات طے کرتے تھے یہاں تک کہ اٹھارویں ہجری میں جب امیر المومنین عمر بن خطابؓ کے دور میں فتوحات کا سلسلہ بڑھ گیا تو انھوں نے سِکّہ سازی کرنے کی کوشش کی اور درہم کو چھوٹے چھوٹے ٹکروں میں ہو بہوترتیب دیا سوائے اس کے کہ اس میں سے کچھ سِکّوں پر ''الحمدللہ''، کچھ پر ''محمدرسول اللہ'' اور کچھ دیگر پر ''لاالٰہ الااللہ وحدہ'' نقش کیا گیا۔

پھر اس کے بعد سیدنا عثمان بن عفانؓ نے اپنے دورِ خلافت میں کچھ دراہم

بنوائے اور ان پر ''اللہ اکبر'' نقش کروایا۔ پھر جب سیدنا امیر معاویہؓ مسندِ خلافت پر براجمان ہوئے تو انھوں نے دینار بنوائے جس میں سونتی گئی تلوار کی تصویر نقش کی گئی تھی۔ اسی طرح سیدنا عبد اللہ بن زبیرؓ نے بھی کچھ گول دراہم بنوائے تھے جن کے ایک طرف ''محمد رسول اللہ'' دوسری طرف ''امر اللہ بالوفاء'' جبکہ ارد گرد ''عبد اللہ'' نقش کروایا تھا۔ اس کے علاوہ مصعب بن زبیرؒ نے عراق میں بھی کچھ دراہم بنوائے تھے۔(۱)

تاہم ان سب اقدامات کے باوجود اسلامی حکومت مکمل طور پر اسلامی سِکّوں کا اجراء نہ کر پائی تھی اور ابھی بھی مملکتِ اسلامیہ میں بازنطینی اور ساسانی کرنسی ایک ممتاز مقام رکھتی تھی۔ اس سلسلے میں پہلی باقاعدہ رسمی کاروائی کا سہرا اموی خلیفہ عبد الملک بن مروانؒ کے سر ہے جنھوں نے سب سے پہلے پوری مملکتِ اسلامیہ میں مکمل طور سے اسلامی کرنسی کو مستعمل بنایا اور بازنطینی و ساسانی کرنسی کے استعمال کو ممکن حد تک محدود کرنے کے لیے مناسب اقدامات کیے۔ مؤرخین اس سلسلے میں خلیفہ عبد الملک بن مروانؒ کے اس اقدام کی کئی ایک وجوہات نقل کرتے ہیں۔

کچھ مؤرخین کے نزدیک خلیفہ عبد الملک بن مروانؒ نے امبرطور جستنیان دوم کی طرف ایک خط لکھا جس میں انھوں نے خط کی ابتداء نبی کریم ﷺ کی ہجری تاریخ اور ''قل ھو اللہ احد'' کے الفاظ سے کی۔ امبرطور کو یہ بات بہت بری لگی پس اس نے جوابی خط میں لکھا کہ اگر دوبارہ خلیفہ عبدالملک بن مروانؒ کی طرف سے خطوط میں اس طرح کے اشاروں کو دہرایا گیا تو وہ اپنی مملکت کے سونے کے سکوں پر اس کے خلاف عبارتیں نقش کروائے گا، یہ بات خلیفہ عبد الملک بن مروانؒ پر بڑی

۱۔ المقریزی۔النقود الاسلامیہ، صفحہ ۵ والبلاذری فتوح البلدان، صفحہ ۴۷۱ وابن الاثیر جلد ۴ صفحہ ۵۴ وابن خلدون۔المقدمہ، صفحہ ۱۸۳۔

گراں گزری جس کی وجہ سے انھوں نے خالد بن یزیدؒ کو امبرطوری دیناروں کا استعمال ختم کروانے کا حکم دیا اور لوگوں کے لیے الگ سے اسلامی سِکّوں کا اجراء کروایا جن سے وہ اپنے معاملات طے کریں۔(۱)

کچھ دیگر مؤرخین کا کہنا ہے کہ خلیفہ عبد الملک بن مروانؒ نے جب کرنسی کے سلسلے میں رومی طرز کو عربی طرز میں تبدیل کیا تو اس وقت جو رومی سِکّے رائج تھے ان پر لکھا ہوتا تھا: ''باپ، بیٹے اور روح القدس کے نام سے''۔ خلیفہ عبد الملک بن مروانؒ نے سِکّوں پر ''لا الہ الا اللہ'' لکھوایا۔ یہ بات روم کے بادشاہ کو بڑی ناگوار گزری اور اس نے عبد الملکؒ کو یہ دھمکی دی کہ وہ اپنے سکوں پر نبی کریم ﷺ کی شان میں گستاخی کرے گا، اس پر عبد الملک بن مروانؒ نے یہ اقدام کیا جو کہ پچھلی تاریخی روایت میں نقل ہو چکا ہے۔

مؤرخین کا تیسرا طبقہ روایت کرتا ہے کہ خالد بن یزید بن معاویہؒ نے عبدالملک بن مروانؒ سے درخواست کی کہ اے امیر المومنین! سابقہ لوگوں نے اپنی کتابوں میں یہ بات لکھی ہے کہ خلفاء میں سے سب سے زیادہ لمبی عمر والا خلیفہ وہ ہوتا ہے جو اپنے سکہ رائج الوقت پر اللہ کا تقدس بیان کرے، اس پر عبدالملک بن مروان نے اس بات کا عزم کیا اور اسلامی کرنسی کی بنیاد رکھی۔(۲)

تاہم ہماری تحقیق کے مطابق کرنسی سے متعلق عبدالملک کے ان اقدامات کے پیچھے جو حقیقی اسباب تھے وہ اسلامی مملکت کے اقتصادی نظام کو منظم کرنا اور اسلامی حکومت کو ذاتی تشخص دینا تھا۔ اور پھر اس کے ساتھ ساتھ اس کام پر ابھارنے کے پیچھے مستقل بنیادوں پر جاری وہ دشمنی تھی جو خلیفہ عبد الملک اور قسطنطنیہ کے چوتھے

۱۔ المقریزی۔النقود الاسلامیہ، صفحہ ۶ والبلاذری فتوح البلدان، صفحہ ۲۴۹ وابن الاثیر، جلد ۴، صفحہ ۵۴۔

۲۔ المقریزی۔ النقود الاسلامیہ، صفحہ ۶۔

بادشاہ اور جستیان کے دوسرے بادشاہوں کے درمیان تھی۔(۱)

اغلب گمان یہ بھی ہے کہ جستیان دوم کے ساتھ خلیفہ عبدالملک بن مروانؒ کے مراسلہ اور عربی طرز میں کی جانے والی تبدیلی اس کام کی ابتداء کی ایک براہ راست وجہ بنی تھی۔ البتہ جو روایت مقریزی نے خالد بن یزیدؒ کے مشورہ کے ذیل میں ذکر کی ہے کہ اس سے خلیفہ کی عمر لمبی ہوجاتی ہے ہماری تحقیق کے مطابق وہ من گھڑت ہے۔ ایسی روایتیں مؤرخین نے عموماً تاریخی حوادث کا خلا پُر کرنے کے لیے نقل کی ہیں۔

خلیفہ عبد الملک بن مروانؒ نے اس بات کو یقینی بنانے کی پوری کوشش کی کہ اس عربی طرز کی کرنسی کو رائج کیا جائے جو ہر قسم کے غیر متعلقہ نقش سے خالی ہو۔ اس بات کے التزام کے لیے انھوں نے لوگوں پر اس بات کو لازم قرار دیا کہ وہ اپنے معاملات اسی عربی کرنسی کے تحت طے کرنا شروع کردیں اور ساتھ ہی تحذیر بھی جاری کی کہ جو شخص عربی کرنسی کے علاوہ کسی دوسری کرنسی کے ذریعے خرید وفروخت کا معاملہ چلائے گا اس کے کام کو روک دیا جائے گا۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے تمام پرانے طرز کے سِکّوں کو سِکّہ سازی کے کارخانوں کی طرف بھیجنا شروع کردیا تاکہ ان کی ازسرنو ڈھلائی کی جاسکے۔(۲)

خلیفہ عبد الملک بن مروانؒ نے دمشق میں ہجرت کے چوہترویں سال دینار بنوائے اور امیر حجاج بن یوسفؒ کو خط لکھا کہ وہ بھی عراق میں اس طرز کی کرنسی بنوائیں چنانچہ انھوں نے بھی ۷۵ ہجری میں چاندی کے درہم تیار کروائے۔(۳)

مگر اس سال اس نئی کرنسی کو وہ اہمیت حاصل نہ ہوسکی جو ہونی چاہیے تھی البتہ

۱۔ ڈاکٹر حسن ابراہیم۔ النظم الاسلامیہ، صفحہ ۲۲۰۔

۲۔ الدمیری۔حیاۃ الحیوان الکبریٰ، جلد ۱، صفحہ ۷۸۔

۳۔ البلاذری فتوح البلدان، صفحہ ۴۷۳ وابن خلدون۔ المقدمہ، صفحہ ۱۸۳۔

اگلے سال ۷۶ ہجری میں امیر حجاج بن یوسفؒ کے مناسب اقدامات کے نتیجے میں عربی کرنسی کو تمام اطراف میں پزیرائی ملنا شروع ہوگئی۔(۱)

امیر حجاج بن یوسفؒ نے اس چاندی کرنسی یعنی دراہم کی سِکّہ ڈھلائی کی ذمہ داری ایک یہودی کو سونپی تھی جس کو سمیر کہہ کر پکارا جاتا تھا لہٰذا اس کی مناسبت سے اس کرنسی کو سمیری کرنسی کا نام دیا گیا۔ امیر حجاج بن یوسفؒ نے اس کرنسی پر ''بسم اللہ ''،''حجاج'' پھر ایک سال بعد اس پر ''قل ھو اللہ احد''نقش کروایا۔ (۲)ایک روایت کے مطابق عبدالملک بن مروان نے اس کرنسی پر''قل ھو اللہ احد'' نقش کروایا تھا۔

امیر حجاج بن یوسفؒ کی اس سمیری کرنسی کو کچھ فقہاء نے خاص ہدف بنایا تھا کیونکہ وہ اس بات سے منع کرتے تھے کہ ان سِکّوں پر''بسم اللہ''لکھوائی جائے ،ان کی اس مخالفت کی بنیادی وجہ یہ اشکال تھا کہ حالت جنابت والے اور حائضہ عورت ان سِکّوں کو ہاتھ میں کیونکر پکڑ سکتے ہیں۔(۳)

ہمارے خیال سے ان فقہاء نے محض تعصب کی بنیاد پر سمیری کرنسی کی مخالفت کی تھی۔ اس بات کی دلیل یہ ہے کہ معتدل علماء نے اس بات میں کوئی کراہت محسوس نہیں کی تھی ،یہ کرنسی مدینۃ الرسول بھی پہنچی تھی جہاں پر کچھ صحابہؓ موجود تھے مگر کسی نے بھی اس پر اعتراض نہیں کیا تھا سوائے اس کے نقش پر کیونکہ اس میں تصویر موجود تھی۔

۱۔ البلاذری۔فتوح البلدان، صفحہ ۴۷۳ وابن الاثیر، جلد ۴ ،صفحہ ۵۳ والطبری، جلد ۵ ،صفحہ ۸۳ والمعارف، صفحہ ۱۷۶ و الماوردی، صفحہ ۱۴۸ وابن خلدون المقدمہ، صفحہ ۱۸۳ والماوردی احکام السلطانیہ، صفحہ ۱۳۹۔

۲۔ ابن الاثیر جلد ۴ صفحہ ۵۳ والبلاذری، صفحہ ۴۷۳ والمقریزی، صفحہ ۸ والماوردی، صفحہ ۱۳۹۔

۳۔ البلاذری صفحہ ۴۷۳، المقریزی، صفحہ ۸ وابن الاثیر، جلد ۴ ،صفحہ ۵۳۔

سعید بن المسیبؒ اسی کرنسی کے ذریعے خرید و فروخت کیا کرتے تھےاور کسی بھی زاویے سے اس پر اعتراض نہیں کرتے تھے۔

جبکہ امام مالکؒ سے تو باقاعدہ اس بارے میں سوال پوچھا گیا تھا کہ ان درہم و دینار کا کیا حکم ہے جن پر اللہ کا نام لکھا ہوا ہوتو انھوں نے جواب دیا تھا کہ ان کے استعمال میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس بات سے استدلال کرتے ہوئے کہ اہل مدینہ کی طرف سے اس کے استعمال پر کوئی اعتراض نہیں کیا گیا تھا۔ اسی طرح ابن سیرین بھی اس کو معاملات کے لیے استعمال کیا کرتے تھے۔ اس پر مزید برآں یہ کہ عمر بن عبد العزیزؒ کی جب اس جانب توجہ مبذول کرائی گئی تو انھوں نے اس پر رقم کتابت کو مٹانے سے منع کردیا تھا۔(۱)

عہد عباسی میں ابو جعفر المنصورؒ کی خلافت میں یوں ہوا کہ حجاج بن یوسف کی وضع کردہ کرنسی کو برے نام سے پکارا جانے لگا،اس بنا پر علماء نے جس قدر ان سے اختلاف کیا اس کو اس مقام پر بیان نہیں کیا جاسکتا۔

کہا جاتا ہے کہ خلیفہ منصورؒ بنی امیہ کی وضع کی گئی کرنسی کو بطور خراج قبول نہیں کرتے تھےسوائے ہبیری ، خالدی اور یوسفی کرنسی کے اس لیے اول الذکر کرنسی کو(جس کو حجاج نے بنوایا تھا) برے الفاظ میں جانا جاتا تھا۔(۲)

اس کے بعد مورخ بلاذری اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے اس خاص اہتمام کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ دراصل مذکورہ بالا کرنسی کو بناتے بڑی محنت اور جد و جہد سے کام لیا گیا تھا یہاں تک کہ یہ کہا گیا تھا کہ ہبیری ،خالدی اور یوسفی کرنسی بنی امیہ کی سب سے عمدہ کرنسی ہے۔

امام بلاذری کی اس بات سے معلوم ہوتا ہے کہ حجاجؒ کی کرنسی کے خلاف خلیفہ

۱۔ المقریزی۔النقود الاسلامیہ، صفحہ ٦۔

۲۔ البلاذری صفحہ ۴۷ ۴۷۴وابن الاثیر، جلد ۴ ،صفحہ ۵۴۔

منصور کا اقدام محض ایک معاشرتی اقدام تھا اس میں کوئی دینی عمل دخل نہیں تھا۔ اس لیے یہ بات عدل کے خلاف ہے کہ خلیفہ منصور کے اس عمل کو علماء دینی رنگ دے کر اختلاف کی بنیاد بنائیں۔

امیر حجاج بن یوسفؒ نے پہلے کوفہ میں اور پھر واسط میں سکہ سازی کا ایک کارخانہ تعمیر کروایا اور وہاں پر پیشہ ور ڈھلائی کرنے والے مقرر کیے جو بادشاہ کے لیے سونے کی ڈلیوں، چاندی اور تانبے کے کھوٹے سکوں سے کرنسی کی ڈھلائی کیا کرتے تھے۔ ڈھلائی کے اس عمل کو ملاوٹ اور چوری سے محفوظ رکھنے کے لیے نہ صرف یہ کہ کام کرنے والے مزدوروں کی سخت نگرانی کی جاتی تھی بلکہ ان کے ہاتھوں میں ایک خاص قسم کا نشان داغ دیا جاتا تھا۔[1]

اس سب کے باوجود امیر حجاجؒ نگرانی کے حوالے سے اس قدر سخت نہیں تھے جس قدر بعد میں آنے والے لوگوں نے سختی کی تھی جیسے یزید دوم کے عہد میں عمر بن ہبیرہ نے محض چاندی کو کھوٹ سے پاک کرنے کے لیے بہت زیادہ سختی کا مظاہرہ کیا تھا۔، پھر ہشام بن عبدالملکؒ کے دور میں اس ذمہ داری پر خالد بن عبداللہ القسری کو فائز کیا گیا پس وہ اس معاملے میں عمر بن ہبیرہ سے بھی زیادہ سخت ثابت ہوئے تھے اور انھوں نے کرنسی کی ڈھلائی کے اس کام کو اس سے بھی زیادہ مستحکم اور مضبوط بنادیا تھا۔ پھر یہ ذمہ داری یوسف بن عمر ثقفی کو سونپی گئی تو اس کا م میں مزید بہتری کے لیے اس نے سختی کا معاملہ اتنا آگے بڑھا دیا تھا کہ اس نے سِکّوں کی ڈھلائی کرنے والے لوگوں کے ہاتھ تک کٹوائے تھے اور انسانوں کو تشدد کا نشانہ بنایا تھا۔[2]

پھر جس طرح امیر حجاج بن یوسفؒ کو اسلامی حکومت میں عربی کرنسی کی ڈھلائی میں سبقت اور فضیلت حاصل ہے، اسی طرح ان سِکّوں کے اجراء کے لیے

۱۔ البلاذری۔فتوح البلدان، صفحہ ۴۷۴،

۲۔ البلاذری۔فتوح البلدان، صفحہ ۴۷۴،وابن الاثیر، جلد ۴ ،صفحہ ۵۴۔

باقاعدہ ٹکسالوں کی تاسیس کرنا اور ایسے قواعد اور خطوط مرتب کرنا جن پر یہ کارخانے مستقل بنیادوں پر جاری رہیں ، کی بابت بھی امیر حجاجؒ کو ہی اولیت کا شرف حاصل ہے۔ المختصر امیر حجاج بن یوسفؒ اصلاحات کرنے والے ایک ایسے گورنر تھے جو نہ صرف اصلاح کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے بلکہ معاشرتی معاملات میں اصلاحات کے باعث وہ ایک مجدد بھی تھے۔

تمام سرکاری دیوانوں یعنی ریکارڈز کا عربی میں ترجمہ و منتقلی:

امیر حجاج بن یوسفؒ وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے پورے عراق کے سرکاری ریکارڈز اور دیوانوں کا عربی میں ترجمہ کروایا تھا۔ قصہ کچھ یوں ہوا کہ کوفہ اور بصرہ میں سرکاری ریکارڈ پر مشتمل دو رجسٹر تھے:ان میں سے ایک عربی میں تھا جس میں لوگوں کا اعداد و شمار اور ان کے وظائف کی تفصیل تھی،یہ وہ ریکارڈ تھا جس کو خلیفہ ثانی عمر بن خطابؓ نے وضع کیا تھا۔ جبکہ دوسرا رجسٹر وہ تھا جس میں مالیات کا ریکارڈ محفوظ تھا اور وہ فارسی میں تھا اور یہ سلسلہ اموی خلیفہ عبد الملک بن مروانؒ کے دورِ خلافت تک چلتا رہا۔[1]

جب امیر حجاج بن یوسفؒ عراق کے گورنر مقرر ہوئے تو انھوں نے زادان بن فروخ بن بیری کو بطور کاتب منتخب کیا۔ اس وقت زادان نے اپنے معاون صالح بن عبد الرحمن مولیٰ بنی تمیم کو امیر حجاجؒ کی خدمت میں پیش کیا کہ یہ بڑا کام کا آدمی ہے، اس کو اپنا مقرب بنالیں۔ اس پر امیر حجاجؒ نے اس کو پسند کیا اور اپنے قریب رکھا۔

جب صالح نے حجاج بن یوسفؒ کی اس پسندیدگی اور قربت کو محسوس کیا تو اس نے آکر زادان سے کہا: میں نے حجاج کے دل جو جگہ بنائی ہے اس سے مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ مجھے آپ پر مقدم نہ کر دیں جس سے آپ اپنا اصل مقام کھو بیٹھیں جبکہ

۱۔ (الجهشياري-الوزراء والكتاب، صفحہ ۲۳۔

آپ ہی میرے بڑے ہیں اور میں آپ ہی کے توسط سے حجاج تک پہنچ پایا ہوں۔

اس پر زادان نے صالح کو جواب دیا کہ تم یہ گمان نہ کرو کہ اس کو مجھ سے زیادہ تمھاری ضرورت ہے کیونکہ اس کو اپنے حساب و کتاب کے لیے میرے سوا کوئی دوسرا مناسب شخص مل ہی نہیں سکتا ہے۔ اس پر صالح نے کہا: اللہ کی قسم! اگر آپ چاہیں کہ میں سارا حساب کتاب عربی زبان میں ڈھال دوں تو میں ایسا کرلیتا ہوں۔ زادان نے کہا کہ تم ایسا کروکہ آدھا کام کرلوتا کہ میں اس معاملے کو دیکھ لوں۔ صالح نے جب زادان کے کہنے پر ایسا کیا[۱] تو زادان نے اس سے مطالبہ کیا کہ تم حجاج کے سامنے اپنی بیماری کا بہانہ کرو۔ شاید اس نے یہ کام اس لیے کیا تاکہ وہ حجاج بن یوسفؒ کی نظر میں صالح کا مقام و مرتبہ دیکھ سکے۔ صالح کی بیماری کا سن کر حجاج نے اپنا خاص طبیب اس کی طرف بھیجا مگر اس کو صالح میں کوئی مرض نظر نہیں آیا۔ زادان کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو اس نے صالح سے کہا کہ تم تندرستی کا اظہار کردو تاکہ یہ معاملہ ظاہر نہ ہوجائے۔ جبکہ زادان اس واقعہ سے حجاج کی نظر میں صالح کا مقام دیکھ چکے تھے۔ زادان کو اس وقت ابن اشعث کے فتنے میں قتل کردیا گیا تھا جب وہ اپنے گھر سے باہر کسی دوسرے مقام پر موجود تھا۔[۲]

اس کے بعد امیر حجاجؒ نے صالح کو ان کی جگہ پر بطور کاتب مقرر کرلیا تھا۔ اس تقرری کے بعد صالح نے حجاج کو اپنے اور زادان کے درمیان چلنے والے سرکاری حساب وکتاب کی عربی ترجمے والی ساری بات بتادی تھی۔ جس پر حجاج نے اس بات کا عزم کیا تھا کہ وہ اس کام کو ضرور مکمل کروائے گا اور اس کام کی ذمہ داری انھوں نے

۱۔ الجھشیاری۔ الوزراء والکتاب، صفحہ ۲۳ والبلاذری فتوح البلدان، صفحہ ۳۰۸ والماوردی، صفحہ ۱۹۲۔

۲۔ البلاذری۔ انساب الاشراف، جلد ۱۱ صفحہ ۳۵۲ والماوردی۔ احکام السلطانیہ، صفحہ ۱۹۳۔

صالح کو ہی سونپ دی تھی۔ جب صالح خود کو سونپی گئی ترجمے کی اس ذمہ داری میں کامیاب ہوگیا تو اس وقت مردان شاہ بن زادان نے صالح سے کہا تھا: جس طرح تم نے فارسی زبان کی جڑ کاٹی ہے اللہ تمھاری بھی جڑ کاٹ دے۔

فارسی دیوانوں کے عربی زبان میں ترجمہ سے اہل فارس کو بڑی تکلیف محسوس ہوئی تھی۔ انھوں نے صالح کو اس کام سے روکنے کے لیے ایک لاکھ درہم کی خطیر رقم جمع کرکے پیش کی تھی مگر صالح نے ان کی اس پیشکش کو ٹھکرادیا۔(۱)

بہت سارے مضمون نگاروں اور مصنّفین نے صالح بن عبد الرحمن سے کتابت کی تربیت حاصل کی، مصنف عبدالحمید کہا کرتے تھے کہ: ''اللہ تعالیٰ صالح کا بھلا کرے ان کا مصنّفین ومترجمین پر بہت بڑا احسان ہے۔''(۲)

یقیناً ادبی اور سیاسی دونوں اعتبار سے اس سارے ریکارڈ کے عربی ترجمے کا بڑا گہرا اثر ہوا تھا۔ پس جب ان اعداد وشمار اور مالیات کے ریکارڈز کا ترجمہ عربی زبان میں ہوچکا تھا اور ذمہ داری عرب مسلمانوں کے ہاتھوں میں آئی تھی تو اس چیز نے ذمیوں اور عجمی مسلمانوں کے سابقہ مناصب پر برقرار رہنے میں مدد دی، جس طرح اس نے عربی مضمون نگاروں اور مصنّفین کے طبقے کے ظہور اور بہت ساری فارسی اصطلاحات کا عربی میں منتقل ہونے کا فائدہ دیا تھا۔(۳)

دراصل یہ عمل ان مبادیات میں سے تھا جس پر اسلامی ممالک میں عرب قومیت کی بنیاد رکھی گئی، اسی کے ذریعے عجمی مظاہر کی یہ آخری جھلک بھی ختم کردی گئی جس کے نتیجے میں وہ تمام علاقے عربی وضع قطع اختیار کرگئے جو اپنے باسیوں کو

۱۔ البلاذری فتوح البلدان، صفحہ ۳۰۸ والماوردی الاحکام السلطانیہ، صفحہ ۱۹۳ اور الجهشیاری روایت کرتے ہیں کہ یہ واقع سن ۸۷ ہجری کو پیش آیا، صفحہ ۲۳۔

۲۔ ابن خلدون المقدمہ، صفحہ ۱۷۱ والبلاذری فتوح البلدان، صفحہ ۳۰۹۔

۳۔ الدکتور حسن ابراهیم۔النظم الاسلامیہ، صفحہ ۲۲۰۔

عرب تہذیب کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے رواں دواں تھے۔(۱)

زرعی ترقی اور دیگر اصلاحی کاموں کے لیے امیر حجاج بن یوسفؒ کی مساعی:

سیدنا عبد اللہ بن زبیرؓ سے معرکہ آرائی اور ان کی شہادت کے بعد امیر حجاج بن یوسفؒ کو عراق کے تمام معاملات کا گورنر مقرر کر دیا گیا تھا۔ امیر حجاج بن یوسفؒ کو اس وقت عراق پر مقرر کیا گیا تھا کہ جب یہ شہر دار الخلافہ کی مخالفت کا علم بلند کررہا تھا اور مہلب بن ابی صفرہ کے ہمراہ خارجیوں کے خلاف جنگ میں حصہ دار بننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ان کو اس وقت عراق کا والی مقرر کیا گیا تھا کہ جب مختلف اطراف میں خوارج خلافت کے نشیب و فراز کو بڑی باریک بینی سے نوٹ کررہے تھے۔ ان کو اس وقت اس شہر پر گورنر مقرر کیا گیا تھا کہ جب اسلامی مملکت کے دور دراز کے کنارے فتح کے انتظار میں تھے۔

داخلی اور خارجی ان متعدد مشکلوں پر قابو پانے کے لیے امیر حجاج بن یوسفؒ اگر مملکت کی بقاء کے امور کی خاطر عراق کے معاشرتی معاملات کو نظر انداز بھی کرتے تب بھی قابل ملامت نہ ٹھہرتے۔ مگر یہ بے نظیر دلیر شخص اس قدر جہاندیدہ اور بلند ہمت تھا کہ اس کے ہم منصبوں کے متعلق یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ امیر حجاج بن یوسف ثقفیؒ نے ایک طرف جنگ کے لیے فوج اور جنگی سازو سامان کو جمع کرنا شروع کردیا تھا تو دوسری طرف مختلف پہلوؤں سے معاشرتی اصلاحات کی داغ بیل ڈال دی تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ امیر حجاج بن یوسفؒ اپنے دور میں امورِ جہانبانی اور حسنِ تدبیر کے اعتبار سے باقی لوگوں اور عمال سے بہت آگے تھا۔ جب ہم ان کا موازنہ

۱۔ کرد علی۔ الحضارۃ العربیہ، جلد ۲، صفحہ ۱۶۸۔

اپنے اپنےادوار کے باقی گورنر وں اور فاتحین سے کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حجاجؒ ان معاملات میں مجتہد تھے،اور اگر ہم ان کا موازنہ آنے والے دیگر ہم منصب لوگوں سے کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ حجاجؒ نے ان کے مقابلے میں وقت سے پہلے اہداف حاصل کر لیے تھے۔

امیر حجاج بن یوسفؒ یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ کوئی بھی ریاست اس وقت تک اپنے پاؤں پر کھڑی نہیں ہوسکتی جب تک اس کے تمام اطراف میں فراوانی نہ ہوتب کہیں جاکر ایک کسان اپنی پیداوار میں سے ریاست کے لیے خراج نکال سکتا ہے۔ پس اگر زمین کسان کو پیداوار کم دے گی تو کسان بھی مجبوراً ریاست کو خراج کم دے گا۔ اسی وجہ سے حجاج بن یوسفؒ نے بنجر زمینوں کو زرخیز کرنے کے لیے کنوؤں اور نہروں کی کھدائی کا عمل شروع کروانے ، پیداوار کی صلاحیت سے محروم زمین کو قابل پیدوار بنانے اور کیچڑ زدہ زمین کو خشک کرکے پیدوار کے لیے مفید بنانے کے لیےخصوصی منصوبہ جات کا اہتمام کیا اور اس مقصد کے حصول کے لیے ہر ممکن توانائی صرف کی۔ (۱)

امیر حجاج بن یوسفؒ اپنی اصلاحات (Reformations) کےعمل کے دوران نا ممکن نام کےکسی لفظ کونہیں پہچانتے تھے۔ جب عراق کےکسانوں نے سیدنا سعد بن ابی وقاصؓ سے استدعا کی کے وہ ان کے لیے ایک نہر کھدوائیں تو سیدنا سعد بن ابی وقاصؓ نے سعد بن عمرو بن حرام کو یہ حکم نامہ جاری کردیا کہ وہ عراق کے کسانوں کے لیے ایک نہر کھدوادیں۔

سعد بن عمرو نے اس مقصد کے لیے کچھ لوگوں کو یہ ذمہ داری سونپی جس پر انھوں نے کھدائی کا کام شروع کیا یہاں تک کہ ایسے پہاڑ تک پہنچے جہاں پر کھدائی کاعمل ناممکن تھا پس اس کام کو وہیں پر چھوڑ دیا گیا۔ یہ کام اس وقت تک موقوف رہا

۱۔ یاقوت الحموی معجم البلدان جلد ۸ ،صفحہ ۳۶۰۔

یہاں تک کہ حجاج بن یوسفؒ عراق کے والی مقرر ہوئے۔ پس انھوں نے ہر طرف سے کام کرنے والوں کو اکھٹا کیا اور اس کام پر مامور لوگوں سے کہا کہ کھدائی کرنے والوں میں سے ہر شخص کے کھانے کا اندازہ لگاؤ اگر وہ اتنا کام کرتے ہیں کہ جتنا وہ کھاتے ہیں تو کھدائی کا کام جاری رکھو، پس انھوں نے اس کام پر خرچ کیا یہاں تک کہ کھدائی کا کام پایہ تکمیل تک جا پہنچا۔ بعد میں اس پہاڑ کو حجاج بن یوسف اور نہر کو سعد بن حرام کے نام سے جانا جانے لگا تھا۔[(۱)]

حجاج بن یوسفؒ نے عراق کے اندر ناقابلِ پیداوار کیچڑ زدہ بہت ساری زمینیں دیکھیں جن میں سے صرف چند کو پیداوار کے قابل بنایا جا سکا تھا جبکہ باقی زمینیں اپنی خستہ حالت پر باقی تھیں۔ اس متعلق حجاج بن یوسف نے حسان نبطی مولی بنی ضبہ کو ایسی زمینوں کی اصلاح کا حکم دیا جس پر حسان نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور مختصر طول وعرض والی بہت ساری زمینوں پر اصلاح کا کام کیا اور ان کو حجاج بن یوسفؒ کے کہنے پر کاشت کاری کے قابل بنایا۔[(۲)]

البتہ وہ کیچڑ زدہ زمینیں جو انتہائی وسیع وعریض تھیں ان پر خرچ کرنے کے متعلق حجاج بن یوسف امیر المؤمنین سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ ہوا کچھ یوں کہ ایک دفعہ پانی کا بہت بڑا سیلابی ریلا آیا اور زمین کا ایک بہت بڑا حصہ زیرِ آب ہوگیا تو حجاجؒ نے امیر المؤمنین ولید بن عبد الملک کو خط لکھا اور ان کو سیلاب کے متعلق خبر دی اور کہا کہ متاثرہ زمین کو بحال کرنے لیے تقریباً تیس لاکھ درہم کی لاگت آئے گی۔ پس امیر ولید بن عبدالملکؒ نے حجاجؒ کو اس سے زیادہ رقم بھیجنے کا حکم دیا۔ اس پر ان کے بھائی مسلمہ بن عبدالملکؒ نے کہا کہ یہ خرچہ میں اٹھاتا ہوں اس شرط پر کہ آپ وہاں

۱۔ البلاذری۔فتوح البلدان، صفحہ ۲۸۳۔

۲۔ البلاذری فتوح البلدان، صفحہ ۳۰۱ والماوردی۔ احکام السلطانیہ، صفحہ ۱۷۱۔

کی نشیبی زمین کے وہ حصے میرے تحت کردیں جن میں زمین پر خرچ کرنے کے بعد بھی پانی باقی رہے گا جبکہ انفاق کا معاملہ آپ اپنے بااعتماد اور خیر خواہ والی حجاج بن یوسف کے سپرد کردیجئے گا۔

ولید بن عبدالملکؒ نے اپنے بھائی مسلمہؒ کے اس مشورے کو قبول کیا اور حجاج بن یوسفؒ کے زیرِ نگرانی زمین کے اصلاح کا کام شروع کیا پس اس کے نتیجے میں ان کو بہت ساری زمینیں ملیں۔ انھوں نے سیبین کے نام سے دو نہریں بنوائیں ، کاشت کاروں اور کسانوں کو متحد کیا اور ان زمینوں کو آباد کیا۔ جب ان زمینوں کی طرف میٹھے پانی کی فراوانی ہوئی تو بہت سارے لوگوں نے وہاں جاکر کاشت کاری کا عمل شروع کیا ، خاص طور پر مسلمہ بن عبد الملک کوتو اس زمین نے بہت ہی زیادہ مصروف کردیا تھا۔(۱)

عراق میں بنجر زمینیں بہت زیادہ تھیں مگر امیر حجاج بن یوسفؒ کے ان اصلاحی اقدامات کی وجہ سے زراعت کرنے والے لوگ پوری تندہی کے ساتھ قطعات کی شکل میں آہستہ آہستہ ان بنجر زمینوں پر محنت کرتے اور ان میں کاشت کا کام شروع کرتے جس کی وجہ سے وہ پیدوار کے قابل ہوجاتیں۔ اس محنت اور اخلاص کی وجہ سے ان بنجر زمینوں کی مقدار میں مسلسل کمی آتی گئی اور ان لوگوں کو ان کے اخلاص و محنت کے بدلے میں زمین کے ان ٹکڑوں کا مالک بنادیا جاتا تھا۔

مثال کے طور پر بشار بن مسلم (قتیبہ بن مسلم کا بھائی) نے سینکڑوں گز زمین کا قطعہ لیا اور اس کو آباد کرنے اور کاشت کے قابل بنانے کے لیے کنوئیں کھدوائے۔(۲) خیرہ بنت ضمرہ قشیریہ (مہلب کی بیوی) نے عباسان کے قطعے کو کاشت

۱۔ ابن خرداذبہ۔ المسالک والممالک، صفحہ ۲۳۱ والبلاذری فتوح البلدان، صفحہ ۳۰۲۔

۲۔ البلاذری فتوح البلدان، صفحہ ۳۷۴۔

کے قابل بنایا۔ (۱)

امیر حجاج بن یوسفؒ کی نظر میں عوام کو بھی معاشرتی اصلاحات کی جھود میں شامل ہونا چاہیے چہ جائیکہ یہ کام صرف حکومت پر ہی چھوڑ دیا جائے۔ اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ امیر حجاج بن یوسفؒ نے پلوں کی حفاظت اور رکاوٹوں کی ترمیم کی ذمہ داری ان لوگوں پر بھی عائد کی جو ان سے فائدہ اٹھاتے تھے خصوصاً جو لوگ مالدار کاشت کار تھے۔ مگر یہی لوگ جب اس کام کو نظر انداز کرتے تو پانی کثرت سے زمینوں کی طرف بہتا ہوا آجاتا تھا اور ایسی صورت میں یہ لوگ اپنی زمینوں کے متبادل کا مطالبہ حکومت سے کرتے۔ امیر حجاج بن یوسفؒ نے ان کے اس متوقع عمل کو رد کیا تاکہ مستقبل میں یہ ان کے لیے اور دوسرے لوگوں کے لیے عبرت ہو اور وہ اپنی زمینوں کی حفاظت کے لیے رات جاگیں اس سے پہلے کہ کہیں سیلاب ان کی زمینوں کو کیچڑ زدہ کر کے برباد نہ کردے۔

حجاج بن یوسف پر جو یہ الزام لگایا گیا تھا کہ وہ زمینداروں کے معاملے میں بخل سے کام لیتے تھے، ان کی زمین زیر آب ہونے کی صورت میں ان کو متبادل زمین فراہم نہیں کرتے تھے اور خود ان کے پاس اتنے پیسے نہیں ہوتے تھے وہ لوگ خود آبی ریلوں کے آگے بند بنواتے۔ (۲) یہ ان پر محض الزام ہے جو کہ بعض لوگوں کی معاشرتی و سیاسی اصلاحات سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ جبکہ سچ تو یہی ہے کہ امیر حجاج بن یوسف اپنی سیاست پر اس اعتبار سے قطعی قابل ملامت نہیں تھے۔

مذکورہ بالا دعویٰ ہمارے اس گمان کے تحت ہے کہ امیر حجاج بن یوسفؒ کو جب یہ یقین ہوجاتا تھا کہ فلاں زمیندار تنگ دست ہے تو پھر وہ اس کی ہر ممکن مدد کیا کرتے تھے۔ مزید برآں یہ کہ جب بھی کوئی عوامی مصلحت کا معاملہ ہوتا یا بیت المال

۱۔ البلاذری فتوح البلدان، صفحہ ۳۶۹۔

۱۔ ابن الاثیر جلد ا صفحہ ۲۴۸ و بربیہ، صفحہ ۲۴۸۔

کے فائدے کی بات ہوتی اس وقت حجاج مال خرچ کرنے میں کنجوسی سے کام نہیں لیتے تھے جیسا کہ تاریخ کے صفحات میں ثبت ہے کہ امیر حجاجؒ کسانوں کی مدد کے غرض سے ان کو قرضہ دیا کرتے تھے جیسا کہ آج کل زرعی بینک کاشت کے لیے قرضہ دیتی ہے۔ اس لیے ایسے شخص کے لیے محال ہے کہ متبادل زمین دیتے وقت کنجوسی سے کام لے اگر مطالبہ عدل پر مبنی ہوتا تو۔

امیر حجاج بن یوسف ثقفیؒ کی دوراندیشی کا اندازہ صرف اس ایک واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب ان کو یہ پتہ چلا کہ بلادِ عراق میں گائے کی نسل میں واضح کمی ہوتی جارہی ہے جس کی بناء پر ان کے دودھ کی فراہمی میں رکاوٹ پیدا ہونے کے امکانات ہوسکتے ہیں تو انھوں نے لوگوں کو گائے کی قربانی کرنے سے منع کردیا۔ مختلف بلاد میں گائے کی قربانی پر پابندی کی اصل وجہ ان کی نسل کی حفاظت تھی لیکن بعض متعصب لوگوں کو گائے کی نسل کی حفاظت کے اس منفرد انداز سے بڑی تکلیف پہنچی جس پر ان میں سے بعض نے اعتراض کیا کہ ہم نے حجاج کو لوگوں کی خرابی کی شکایت کی تو اس نے جہالت میں ہم پر گائے کا گوشت ہی حرام قرار دے دیا۔(۱)

عصرِ جدید میں عمرانیات پر تحقیق کرنے والے لوگ جب امیر حجاج بن یوسفؒ کے اس حکم و اصلاح پر غور کرتے ہیں تو حیران ہوئے بغیر نہیں رہ پاتے کہ جب ہم خود مویشیوں کے ذبح پر پابندی کو ان کے دودھ اور گوشت کی نشوونما اوران کے گوبر کو کھیتی باڑی کے کام کی نشوونما کا بہت بڑا ذریعہ سمجھتے ہیں جبکہ امیر حجاج بن یوسفؒ دورِ حاضر کے ان طریقوں پر سینکڑوں سال پہلے عمل درآمد کراچکے تھے۔

امیر حجاج بن یوسفؒ کو لوگوں کے زراعت کا کام چھوڑ کر شہروں کی طرف ہجرت کرنے سے بے روزگاری اور اس کے نتیجے میں بڑھنے والے جرائم کا اندیشہ تھا۔ اس کے علاوہ لوگوں کے زراعت کا کام چھوڑنے کی وجہ سے زمینوں کا بے آباد ہوجانا

۱۔ الاغانی، جلد ۱۵، صفحہ ۹۴ و ابن خرداذبہ، صفحہ ۱۴ و یاقوت الحموی جلد ۵ صفحہ ۱۶۵۔

اور اس کے بعد حکومت کو ملنے والے خراج میں کمی کی وجہ سے حجاج بن یوسف نے ایسے تمام ہجرت کرنے والے لوگوں کو ان کے گاؤں میں واپس لوٹانے کا حکم دیا اور اس کام میں اس قدر سختی کی کہ یہ حکم دیا کہ ہر شخص کے ہاتھ پر اس کے گاؤں کا نام لکھا جائے تا کہ کوئی شخص کسی دوسرے گاؤں میں نہ جا سکے۔(۱)

دورِ جدید میں اصلاح کنندہ لوگ پینے کے صاف ستھرے پانی کا انتظام کرنے کے لیے منصوبہ جات کی بات کرتے ہیں جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ حجاج بن یوسفؒ نے پہلی صدی ہجری میں بصرہ میں پانی کی بڑی بڑی ٹینکیاں تعمیر کروائی تھیں جو ان کے نام سے پہچانی جاتی تھیں تا کہ لوگ ان سے پانی پئیں۔(۲)

عراق میں امیر حجاج بن یوسفؒ کی طرف سے کیے جانے والے اصلاحات کے یہ تمام کام جو مختلف مصادر ہمیں بتاتے ہیں، اگر مؤرخین کی معلومات کا دائرہ اس بارے میں مزید وسیع ہوتا تو وہ حجاج بن یوسف پر اپنا غصہ کبھی نہ اتارتے اور ان کی اصلاحات کی تعریف وتوصیف پر سینکڑوں مجلدات بھر دیتے۔ مگر حجاج بن یوسف کے متعلق تو لوگوں نے صرف ان کی سختی اور سنگ دلی کے قصے سنے ہیں کیونکہ ہمارے تذکرہ نویسوں نے مارے تعصب یا پھر کم علمی کے سبب ان اصلاحات کا ذکر کبھی عوام کے سامنے آنے ہی نہیں دیا۔

مسلمان مؤرخین اپنے جذبات کے دھارے میں ایسے آئے کہ انھوں نے حجاج بن یوسف کی اصلاحات کا نام و نشان مٹا دیا جبکہ اگر امیر حجاجؒ کی ان تمام معاشرتی اصلاحات کی تدوین کر دی جاتی تو وہ عہد جدید کے مصلح لوگوں کے لیے روشن مینار بن جاتے۔

۱۔ ابن عبد ربہ، جلد ۲ ،صفحہ ۷۷ والطبری، جلد ۵ ،صفحہ ۱۸۲ والمبرد، صفحہ ۲۸۵ وابن الاثیر، جلد ۴، صفحہ ۷۹۔

۲۔ البلاذری فتوح البلدان، صفحہ ۳۷۷۔

مؤرخین کی طرف سے منقول اس تھوڑے بہت کے باوجود بھی حجاج بن یوسف ناقدین کی تنقید سے چھٹکارا حاصل نہیں کرسکے۔ مؤرخین روایت کرتے ہیں کہ عراق میں کی گئیں حجاج کی یہ اصلاحی کاوشیں کچھ زیادہ دیرپا ثابت نہیں ہوئیں جس کا ثبوت یہ ہے کہ حجاج کی موت کے بعد عراق بدحالی کا شکار ہوچلا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد جب سلیمان بن عبد الملک نے عراق پر یزید بن مھلب کو والی مقرر کیا تو اس نے خود کی بڑائی بیان کی اور حجاج پر طعن کیا کہ عراق کو حجاج بن یوسف نے خراب کردیاہے اور میں آج اہل عراق کے لیے امیدوں کا مرکز ہوں۔ میں بھی اگر آگے بڑھوں اور لوگوں سے خراج وصول کروں اور اس بات پر ان کو سزائیں دوں تو میں حجاج کی طرح ہوجاؤں گا۔ جس پر عراق سے حاصل ہونے والا خراج بہت ہی زیادہ کم ہو گیا تھا۔(۱)

انھی مؤرخین نے پھر ہمارے لیے سیدنا عمر بن خطابؓ، سیدنا معاویہؓ، امیر حجاج بن یوسفؒ اور عمر بن عبد العزیزؒ کے دور کے خراج کے اعداد وشمار بھی نقل کیے ہیں جو اس بات کو ثابت کرنے کی ایک کوشش ہے کہ حجاج بن یوسفؒ نے عراق کو بدحالی کا شکار کردیا تھا۔

اس معاملے میں مصادر کے اختلاط اور اضطراب کے باوجود ہم یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ ان اعداد و شمار پر بحث کریں تاکہ اس سوئے ظن سے چھٹکارا پاسکیں کہ حجاج نے عراق کو معاشی طور پر خراب کیاہے۔

البتہ جو اضطراب ہے وہ اعداد و شمار کے اختلاف میں ہے۔ پس اگر عمر بن خطابؓ کے عہد میں بلاذری کی رائے کے مطابق خراج تقریباً سو ملین تک پہنچتا

۱۔ الطبری، جلد ۵ صفحہ ۲۸۶ وابن الاثیر، جلد ۴ صفحہ ۱۳۳ والعیون والحدائق، جلد ۳ صفحہ ۲۵ وابن الجوزی۔ مرآۃ الزمان، جلد ۹ صفحہ ۲۷۔

تھا۔[۱] اور یاقوت کے مطابق ایک سو اٹھائیس ملین تک۔[۲] جبکہ بشاری اور ابن خراداذبہ کے مطابق بھی یہی اعدادو شمار تھے۔[۳] گویا خود مختلف مؤرخین کے نزدیک صرف ایک سیدنا عمر بن خطابؓ کے دور میں جمع ہونے والے خراج کی بابت کافی اختلاف پایا جاتا ہے تو پھر امیر حجاج بن یوسفؒ کا دور، جن کو متعصب مؤرخین نے جی بھر کر بدنام کرنے کی سعی کی، ان کی بابت خراج کی کسی ایک رقم پر کیونکر اجماع ممکن ہوسکتا تھا۔ پھر انھیں مؤرخین نے عمر بن عبد العزیزؒ کے دور میں خراج کی رقم کو کم کرکے اسّی ملین نقل کیا ہے اور یہ ابن عساکر کی روایت کے مطابق ہے[۴] اورابن کثیر نے بھی کچھ یوں ہی لکھا ہے[۵] یاقوت حموی کی روایت کے مطابق یہ عدد ایک سو چوبیس ملین سے بھی متجاوز ہے۔ جب کہ خراج کے یہی اعداد وشمار امیر حجاج بن یوسف کے عہد میں بشاری ،ابن خرداذبہ ،یاقوت اور ابن عساکر کے مطابق ایک سو اٹھارہ ملین تھا۔

یعقوبی کے مطابق یہ عدد پچیس ملین تک پہنچ گیا تھا۔[۶] بلاذری، ابن عساکر اور ابن کثیر کی روایت کے مطابق عمر بن عبد العزیز کے دور میں خراج چالیس ملین تک پہنچ گیا تھا اور ماوردی اپنے منفرد قول کے مطابق یہ عدد ایک سو اٹھارہ ملین تک پہنچ گیا تھا۔[۷]

۱۔ فتوح البلدان، صفحہ ۳۷۹۔

۲۔ معجم البلدان، جلد ۵ ،صفحہ ۱۶۲۔

۳۔ احسن التقاسیم صفحہ ۲۳، المسالک الممالک، صفحہ ۱۴۔

۴۔ التاریخ الکبیر، جلد ۴ ،صفحہ ۸۰۔

۵۔ البدایہ والنہایہ، جلد ۹ ،صفحہ ۱۳۶۔

۶۔ تاریخ الیعقوبی، جلد ۳ ،صفحہ ۳۵۔

۷۔ الماوردی احکام السلطانیہ، صفحہ ۱۶۷۔

ہمارے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم اس چھوٹے عدد یعنی اٹھارہ ملین اور بڑے عدد ایک سو اٹھارہ ملین کے درمیان کوئی تطبیق کی صورت نکال سکیں مگر یہ کہ ہم ماوردی کی روایت کو غلط تصور کریں۔ کیونکہ یہ روایت سب سے مختلف ہے۔ جبکہ اٹھارہ ملین کی روایت کو چار لوگوں نے نقل کیا ہے جو بالترتیب یہ ہیں ابن خرداذبہ ،یاقوت، ابن عساکر اور بشاری۔ اس کے علاوہ پھر ہمارے لیے یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ ہم ماوردی کا ذکر کردہ خراج کا شمار اس لیے قبول کرلیں کہ وہ اعداد وشمار میں باقی لوگوں کے بانسبت متخصص تھا۔

اور یہاں پر ان روایات میں اضطراب کی صورتوں میں سے ایک صورت یہ بھی ہے کہ ان مؤرخین میں سے کچھ نے صرف عراق کے خراج کی بات کی ہے اور کچھ نے بڑی اکثریت کے خراج کی بات کی ہے۔ ہم یہ بات جانتے ہیں کہ حجاج بن یوسف کے دور میں عراق کے زیر اقتدار بڑی اکثریت نہیں تھی۔ اس کے باوجود جن مؤرخین نے ہم تک عراق کے زیر اقتدار بڑی اکثریت کی روایت کو نقل کیا ہے تو ہم ان کا اثبات اس طرح کرتے ہیں کہ دراصل انھوں نے عراق کی پوری ریاست کا ذکر کیا ہے۔

پھر جن مصادر میں گزشتہ اعداد وشمار کو نقل کیا گیا ہے وہ اس بات سے خاموش ہیں کہ وصول شدہ خراج صرف عراق سے تھا یا ارد گرد کے تمام علاقوں سے؟ یا یہ وہ رقم تھی جو حجاج خلیفہ کو ادا کرتا تھا؟؟ اس بات میں اور اُس بات میں فرق کرنے والی بات یہ ہے کہ حجاج کئی ملین کی تعداد میں خراج اکھٹا کرتے تھے مگر دار الخلافہ میں اس کی ادائیگی بہت کم کرتے تھے۔ کیونکہ تمام والیوں میں وہ واحد شخص تھے جو مسلسل داخلی جنگوں پر مال خرچ کرتے رہے ،وہ جنگیں جو ان کے دور میں ایک لمحے کے لیے بھی نہیں رکیں۔ بلکہ حجاج بن یوسفؒ کو بعض دفعہ ان جنگوں کو جاری رکھنے کے لیے دگنے بجٹ کی ضرورت پڑتی تھی کیونکہ یہ ایسی جنگیں تھیں جن کے پیچھے کوئی مال غنیمت کا سلسلہ نہیں تھا کیونکہ یہ ساری جنگیں داخلی تھیں جن کا مقصد فتنوں کو

ختم کرنا اور سب کو ایک خلیفہ کے تابع کرنا تھا۔

اور اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ اندرونی اصلاحات میں مصروف رہے جن کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے انھوں نے کسی طور سے مال خرچ کرنے سے گریز نہیں کیا۔ اس لیے ہم پورے اطمینان سے اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ مؤرخین نے خراج کے حوالے سے جتنی بھی روایات کو نقل کیا ہے ان میں اس رقم کا ذکر ہے جو حجاج عراق میں جنگی اور اصلاحی معاملات طے کرنے کے بعد دار الخلافہ بھجواتے تھے۔

اس کے علاوہ کسی بھی مصدر میں خراج کے اعداد و شمار کا سالانہ ریکارڈ موجو د نہیں ہے۔ پس اگر خراج کا مذکورہ اعداد و شمار جس کو وصول کیا گیا یا دارالخلافہ روانہ کیا گیا کا تعلق عراق میں اٹھنے والے بغاوت کے دنوں سے ہے تو یہ ماننا آسان ہے کہ اس حد تک خراج میں کمی واقع ہوگئی ہوگی۔

کچھ محققین ان اعداد و شمار کو قبول نہیں کرتے ہیں جیسا کہ فان فلوٹن کہتا ہے کہ ''کسی ملک کے بارے میں اتنے کم خراج کے متعلق تصور بھی نہیں کیا جاسکتا مگر یہ کہ وہ علاقہ بلاواسطہ خانہ جنگی کا شکار ہو۔''(۱)

خضری بک کہتے ہیں کہ ''خراج میں یہ کمی فتنوں اور بغاوت کے وقت پیدا ہوئی تھی،'' (۲)

مؤرخین کے پاس وہ ریکارڈ و دستاویز بھی کبھی موجود نہیں رہے جن میں عراق کے خراج اور اخراجات کا ریکارڈ تھا کیونکہ یہ سارا ریکارڈ ابن اشعث کی بغاوت کے وقت جل گیا تھا۔(۳)

البتہ جو کچھ عمر بن عبد العزیز اور یزید بن مہلب کے حوالے سے عراق کی

۱۔ السیادۃ العربیہ، صفحہ ۴۳۔

۲۔ تاریخ الامم الاسلامیہ ۲، صفحہ ۲۶۳۔

۳۔ البلاذری فتوح البلدان، صفحہ ۲۸۱ وابو یوسف الخراج، صفحہ ۵۸۔

معاشی خرابی کے متعلق نقل کیا گیا ہے وہ حجاج سے بغض رکھنے والے لوگوں کی ذاتی کارستانیاں ہیں۔

ہمارے خیال کے مطابق حجاج کی طرح کے آدمی کے لیے جنھوں نے کثرت سے مصیبتوں کا سامنا کیا، فتنوں کا قلع قمع کیا اور داخلی اصلاحات کا اجراء کیا۔ وہ اگر دارالخلافہ کو خراج کے نام پر کچھ بھی ادا نہ کرتے تو ان کے لئے کوئی قابلِ ملامت بات نہ تھی کیونکہ حکومتِ وقت اور مرکزِ خلافت کے لئے یہی بات کافی تھی کہ حجاج نے ان کو عراق کی مشکلات سے چھٹکارا دلا دیا تھا چاہے اس چھٹکارا دلانے میں عراق سے حاصل کردہ سارا خراج ہی کیوں نہ استعمال ہوگیا ہو۔

اگر حجاج بن یوسفؒ کی ہمت ،ہوشمندی اور انفاق کرنے کی بہترین حکمت عملی نہ ہوتی تو اہل عراق کی طرف سے مصائب و آلام کا یہ سلسلہ دار الخلافہ کے لیے جاری رہتا۔

چاہے کچھ بھی ہوجائے ہمیں اس بات کا یقین ہے کہ حجاج بن یوسف کے اس عمل میں خلیفہ عبد الملک بن مروان کی مرضی شامل تھی اور ان کو اس کی طرف سے شافی مقدار میں خراج کی وصولی پہنچتی تھی۔(۱) اگر ایسا نہ ہوتا تو خلیفہ اس کو اپنی خلافت میں ہی معزول کردیتے اور پھر اپنے بیٹے ولید کو اس کو برقرار رکھنے کی وصیت کیوں کرتے ؟اس لیے حجاج بن یوسفؒ اور زیاد ثقفیؒ ایک جیسی بات کے مستحق ٹھہرے وہ یہ کہ عباسی امویوں سے ان دونوں کے نام پر حسد کیا کرتے تھے۔ ابو جعفر منصور نے کہا تھا: ’’خلفاء تین ہیں معاویہ اس کو زیاد کافی ہوگیا ،عبد الملک اس کو حجاج کافی ہوگیا جبکہ میں تو مجھے کوئی کافی نہیں ہوا‘‘۔

OOOOO

۱۔ البلاذری انساب الاشراف، جلد ۱، صفحہ ۳۱۱ و ابن عبد ربہ، جلد ۲ صفحہ ۹۹۔

امیر حجاج بن یوسف ثقفیؒ کے خلاف الزامات کا تحقیقی جائزہ

علامہ مفتی اسحٰق صدیقی سندیلوی ندوی

از علامہ مفتی اسحٰق صدیقی سندیلوی ندوی

سابق شیخ الحدیث و مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

امیر حجاج بن یوسف ثقفیؒ کے خلاف الزامات کا تحقیقی جائزہ

زیر نظر مبحث مشہور ندوی عالم مفکر اسلام علامہ محمد اسحٰق صدیقی سندیلوی مرحوم کی مشہور تالیف ''اظہار حقیقت بجواب خلافت و ملوکیت حصہ سوم'' کے اس حصے سے ماخوذ ہے جس میں مصنف مرحوم نے امیر حجاج بن یوسف ثقفیؒ سے متعلق غلط فہمیوں کا ازالہ کیا ہے اور قارئین کے سامنے حجاجؒ کے زمانے اور اس میں کیے گئے اقدامات کی نہایت مناسب توجیہ پیش کی ہے۔ مفکر اسلام علامہ اسحٰق صدیقی سندیلوی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ آپ نہ صرف علوم القرآن و الحدیث پر گہری نظر رکھتے تھے بلکہ تاریخ سے متعلق بھی آپ کا مطالعہ نہایت شاندار اور جاندار تھا۔ فلسفہ تاریخ سے آپ کو خاص شغف تھا اور اسی وجہ سے آپ دقیق سے دقیق تاریخی مباحث کی بھی انتہائی عمدہ اور قرائن سے مطابقت رکھنے والی توجیہ کر لیتے تھے۔ ان شاءاللہ زیر نظر مبحث کے مطالعہ کے بعد قارئین علامہ اسحٰق صدیقی سندیلوی سے متعلق ہمارے اس تبصرے کی حقانیت کو جان جائیں گے۔ سید مودودی کی کتاب ''خلافت و ملوکیت''

کے نقد میں لکھی جانے والی اپنی تالیف ''اظہار حقیقت'' میں علامہ اسحٰق صدیقی صاحب نے تاریخ اسلام کے انتہائی اہم گوشوں پر سے پردہ اٹھایا ہے اور مشاجرات صحابہؓ سے متعلق نہایت وقیع اور ساتھ ہی محتاط معلومات فراہم کی ہے۔ مفکر اسلام کی اسی تحقیقی کاوش نے ہمیں ہمت دلائی کہ ان کی کتاب کے حجاج بن یوسف سے متعلق حصے کو اپنی اس تالیف میں شامل کرکے شائع کیا جائے سو یہ کاوش اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ امید ہے کہ قارئین علامہ اسحٰق صدیقی سندیلوی صاحب کی کتاب مذکور اس حصے کے مطالعہ کو تاریخی مباحث سے متعلق معلومات افزا اور تحقیقی پائیں گے۔

امیر حجاجؒ کے ساتھ تذکرہ نگاروں کا ظلم:

سبائیوں نے حجاج بن یوسف ثقفیؒ پر ظلم وستم کا الزام لگایا اور اس کی اس قدر تشہیر کی کہ عام مسلمان بھی انھیں ظالم کہنے لگے اور ان کا نام ظلم وستم کی علامت بنا دیا گیا۔ اس تشہیر اور بہتان کو سبائیوں اور سبائیت نوازوں نے خلافتِ بنو امیہ کے خلاف عوام و خواص کو مشتعل کرنے کا ذریعہ بنایا، چنانچہ امیر المومنین عبدالملک بن مروانؒ نے اپنی اولاد کو جو وصیت حجاج مرحوم کی قدر شناسی اور ان سے حسن سلوک کے متعلق کی تھی، اس کا تذکرہ کرکے مودودی صاحب لکھتے ہیں:

> ''یہ وصیت اس ذہنیت کی پوری نمائندگی کرتی ہے جس کے ساتھ یہ لوگ (بنو امیہ) حکومت کررہے تھے۔''(۱)

مگر یہ عمارت ظلم کے اسی غلط پروپیگنڈے اور جھوٹ کی ریت پر قائم کی گئی ہے جس کا ڈھیر سبائیوں اور سبائیت نوازوں نے لگایا ہے۔ اس لیے حقیقت ظاہر ہونے کے بعد یہ پوری عمارت زمین بوس ہوجاتی ہے۔ غلط بیانی اور مبالغہ آرائی کا ایک نمونہ مودودی صاحب کا مندرجہ ذیل قول ہے:

۱۔ خلافت وملوکیت صفحہ ۱۸۶۔

> ''اس کے زمانے میں جو لوگ قید کی حالت میں کسی عدالتی فیصلے کے بغیر قتل کیے گئے، صرف ان کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار بتائی جاتی ہے، جب وہ مرا تو اس کے قید خانوں میں ۸۰ ہزار بے قصور انسان کسی مقدمے اور کسی عدالتی کارروائی کے بغیر سڑ رہے تھے۔''(۱)

تبصرہ: اس غلط بیانی کے لیے ''الاستیعاب جلد ا'' کا حوالہ دیا گیا ہے۔ الاستیعاب کے متعلق محتاط و محقق علماء کا بیان ہے کہ یہ (بلا چھان پھٹک کے مطلق) قابل اعتماد کتاب نہیں۔ اکابر علماء قدیم نے بھی اسے قابل اعتماد نہیں سمجھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کے مصنف حافظ ابن عبدالبرؒ کے ذہن پر تاریخی معاملات کو لے کر شیعیت کا خاصا اثر تھا اور وہ بنو امیہ سے دلی پرخاش رکھتے تھے، اس لیے ان کے خلاف روافض کی روایتیں بلا تکلف قبول کر کے نقل کر دیتے تھے۔ اس معاملے میں نہ تو وہ خود قابل اعتماد ہیں اور نہ ان کی کتاب۔ مجہول کے صیغوں ''قیل''، ''یقال'' اور ''بتائی جاتی ہے'' کہہ کر ہر جھوٹ نقل کیا جاسکتا ہے۔ مگر اہل بصیرت ایسی کہانیوں اور افواہوں کا کوئی اعتبار نہیں کرتے۔ خصوصاً جو بعید از قیاس ہوں، ان کی صحت کا شبہ اور احتمال بھی کسی فہیم انسان کو نہیں پیدا ہوتا۔ زیر بحث روایت تو اگر ثقات کی متصل سند کے ساتھ بھی ذکر کی جاتی تو بھی قابل قبول نہ ہوتی، بلکہ فہم سلیم کے نزدیک مردود اور جھوٹی قرار پاتی۔

اس سوال کا جواب کیا ہے کہ یہ مقتول شماری کس نے کی؟ اس زمانے میں کوئی خبر رساں ایجنسی نہیں تھی، نہ اخبارات تھے۔ ڈاک، تار، فون وغیرہ ذرائع خبر رسانی بھی مفقود تھے۔ سفر بھی آج کی طرح آسان نہیں تھا۔ پھر اس سبائی روایت کے کذاب راوی نے مقتولین کی تعداد کیسے معلوم کر لی؟ اور یہ کیسے معلوم کر لیا کہ یہ سب مقتولین ناحق، بغیر کسی عدالتی فیصلے کے قتل کیے گئے تھے؟ موجودہ زمانے میں

۱۔ خلافت وملوکیت، صفحہ ۱۸۶۔

جبکہ رسل و رسائل اور حمل و نقل کے ذرائع بکثرت ہیں، مشرق کی خبر مغرب تک منٹوں میں پہنچ سکتی ہے اور بعض اوقات پہنچتی ہے۔ اگر کسی چھوٹے سے ملک میں ، بلکہ کسی بڑے شہر میں بھی سو دو سو آدمی قتل کیے جائیں تو خود اس شہر میں رہنے والوں کے لیے ان کی صحیح تعداد کا معلوم کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ آج کل مختلف ممالک کے بڑے شہروں میں مختلف قسم کے ہنگامے ہوتے رہتے ہیں، بعض صورتوں میں حکومت گولی چلاتی ہے۔ مقتولین ، مجروحین کی صحیح تعداد مدت دراز تک معلوم نہیں ہو پاتی۔ بلکہ بکثرت ایسا ہوتا ہے کہ صحیح تعداد کبھی نہیں معلوم ہوتی۔ پھر حجاج مرحوم کے دور میں ایک وسیع و عریض صوبے میں ان مفروضہ مقتولین کی یہ تعداد اور ان کا بغیر کسی عدالتی فیصلے کے قتل ہونا کیسے معلوم ہوگیا؟ اس سوال کا کوئی اطمینان بخش جواب یہ معترضین نہیں دے سکتے۔ اس سے ثابت ہوا کہ یہ روایت بالکل جھوٹی، موضوع اور جعلی ہے جو کہ کسی رافضی دشمنِ خلافت کی گھڑی ہوئی ہے، جس نے جھوٹ اور مبالغہ آرائی کو ممزوج کر کے حجاج مرحوم پر بہتان و افتراء کیا ہے۔ ۸۰ ہزار قیدیوں کی روایت کو بھی اسی پر قیاس کرلیجئے، یہ بھی جھوٹ کی پوٹ ہے۔ یہ قیدی شماری کس نے کی؟ اور کس کے بس کی بات تھی؟ اگر حجاجؒ ظالم تھے تو انھوں نے اس مقتول شماری اور قیدی شماری کرنے والے کی گردن کیوں نہ ماردی اور انھیں جیتا کیسے چھوڑ دیا؟ یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ اموی خلافت کے زمانے میں جیل خانوں کی تعداد بہت کم تھی اور اتنی وسیع و عریض جیل جیسی موجودہ زمانے میں ہوتی ہے، شائد ایک بھی نہ تھی۔ سزائے قید کا رواج بہت کم تھا۔ اگر یہ سزا دی جاتی تھی تو زیادہ تر مجرم کو خانۂ قید کردیا جاتا تھا، جسے ہمارے زمانے میں نظر بندی کہتے ہیں۔ یعنی ملزم اپنے گھر میں آزادی کے ساتھ رہتا ، صرف گھر سے باہر جانے پر پابندی ہوتی تھی۔ پھر یہ ۸۰ ہزار قیدی آخر قید کہاں تھے؟ اور ان کی گنجائش کہاں نکالی گئی تھی؟ ان دروغ بافی راویوں اور دروغ نواز مؤرخوں کی سمجھ میں یہ بھی نہ آیا کہ ایک

لاکھ بیس ہزار مقتولین اور اسّی (۸۰) ہزار قیدیوں کا تذکرہ سن کر اس دور کی تاریخ اور عام انتظامی و سیاسی حالات سے معمولی واقفیت رکھنے والے کے دل میں بھی مندرجہ بالا سوالات پیدا ہوں گے۔ ان کا جواب تو ہونا چاہیے۔ لیکن عداوتِ بنی امیہ اور حبِّ شیعیت کے زہر کے زیر اثر ہونے کی وجہ سے ان کا ذہن بھی ماؤف ہوگیا اور سوالات تک نہ پہنچ سکا، ورنہ کوئی اور روایت گھڑ دیتے اور جھوٹ کی تعداد میں اضافہ کر دیتے۔

سبائیوں اور سبائیت نواز تاریخ نگاروں اور راویوں نے جھوٹ کیوں بولا؟ اور مبالغہ آمیز کذب و دروغ کا اتنا بڑا ڈھیر کتبِ تاریخ میں کیوں لگا دیا، اس کا علم بھی مفید ہے۔ جو لوگ تحریکِ سبائیت، اس کے مقاصد اور اس کے طریق کار سے واقف ہیں، ان کے لیے اسے سمجھ لینا کچھ بھی مشکل نہیں۔ ابنِ سبا کی تعلیم یہ تھی کہ اگر سبائیوں کی مفسدہ پردازی پر حکومت کوئی گرفت کرے تو اپنی مظلومیت کا رونا اونچی سے اونچی آواز میں رویا جائے اور معمولی سی بات کو سینکڑوں گنا کر دکھانے کے ساتھ اپنی معصومیت و بے گناہی کی جھوٹی تشہیر خوب کی جائے۔ یہ یہود کا بہت اصولی عمل ہے، وہی انھوں نے سبائیوں کو سکھایا، سبائی ہمیشہ اسی پر کاربند رہے اور اب بھی اس پر کاربند ہیں۔

اموی خلافت کے مبارک دور میں خلافتِ اسلامیہ کے خلاف سبائیوں کی خفیہ سازشیں جاری تھیں۔ یہ مفسدین فی الارض ''تقیہ'' کا لبادہ اوڑھ کر اور ''سُنّی'' بن کر اسلام اور خلافتِ اسلامیہ کے خلاف طرح طرح کے دینی و دنیاوی فتنے برپا کرنے میں مصروف تھے۔ ایسے فتنہ پرداز منافق دشمنانِ اسلام، جب گرفت میں آجاتے تھے تو حجاج مرحوم انھیں سزا دیتے تھے اور یہ سزا شرعاً و اخلاقاً، ہر طرح بالکل بجا اور درست ہوتی تھی۔ ایسے واقعات چند ہی ہیں۔ انھیں سبائیوں اور سبائیت نوازوں نے جھوٹ اور مبالغے کی آمیزش کر کے رائی کا پہاڑ بنانے کی کوشش کی ہے۔ ان مفسدوں کو

جب سزا دی گئی تو قانونِ شرعی کے مطابق دی گئی۔ حجاج مرحوم کی گورنری کے پورے زمانے میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں پیش کیا جاسکتا جس میں انھوں نے کسی شخص کو اس کے جرم کے ثبوتِ شرعی کے بغیر سزا دی ہو۔ واضح رہے کہ کسی کے بارے میں ایسے سنگین الزام کے لیے بھی ثبوت کی ضرورت ہے۔ خونِ ناحق کا الزام معمولی الزام نہیں ہے۔ حجاج ہو یا اور کوئی، کسی کو بھی اس جرم کا مرتکب ثابت کرنے کے لیے شرعی ثبوت کی احتیاج ہے۔ روایت کو سند اور درایت دونوں حیثیتوں سے جانچنے اور پرکھنے کی ضرورت ہے۔ یہی نہیں بلکہ خود مؤرخ کے عقیدہ و کردار کو بھی ملحوظ رکھنا لازم ہے۔ مؤرخ بھی ایک راوی ہے۔ جب رواۃ پر نقد کیا جائے گا تو اسے نقد سے مستثنیٰ کیوں سمجھا جائے؟ مختصر یہ کہ حجاج مرحوم پر ظلم و جور کا الزام لگانے والوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس الزام کا ثبوت دیں۔ اور میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ حجاج مرحوم کے دورِ ولایت کا ایک واقعہ بھی ایسا نہیں پیش کرسکتے جس کے بارے میں وہ شرعی دلیل سے یہ ثابت کرسکیں کہ اس میں انھوں نے کسی کا خون ناحق بہایا تھا۔ صرف یہ کہہ دینا کہ فلاں مؤرخ اعظم نے یہ لکھا ہے، یا فلاں شیخ المشائخ ، فلاں امام اہلسنت، فلاں عمدۃ الاولیاء اور فلاں علاّمہ نے یہ لکھا ہے، ثبوت کے لیے کافی نہیں۔ تاریخ اقوال و آراء کا نام نہیں بلکہ نقل و روایت کا نام ہے۔ کسی تاریخی واقعہ کے ثبوت کے لیے نقل صحیح و قوی درکار ہے۔ نقلِ اقوال بالکل بیکار ہے۔

ممکن ہے کسی معاملے میں ان سے نادانستہ غلطی بھی ہوئی ہو اور کسی غیر مجرم کو مجرم سمجھ کر انھوں نے سزا بھی دی ہو، لیکن سبائیوں اور سبائیت نوازوں خصوصاً علوی راویوں اور مؤرخوں نے اس قسم کے ایک واقعہ کو دس واقعات کرکے دکھایا ہے اور مجرموں کو بے گناہ ظاہر کرکے ان کی مظلومیت کا رونا رویا ہے۔ ان کذاب سبائیوں کے جھوٹے آنسوؤں سے متاثر ہوکر بعض سُنّی مؤرخین نے بھی ان کی مشہور

کی ہوئی غلط افواہوں پر یقین کرلیا۔ بہت سے ایسے بھی ہیں جنھیں اس کا علم تھا کہ حجاجؒ ان الزاموں سے بری ہیں لیکن حکومت یا علویہ کو خوش کرنے کے لیے یہ علماء و مؤرخین ان کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے۔ جیسے آج پاکستان اور بھارت کے متعدد صحافی اور سیاسی لیڈر ایران کی تعریف کرتے رہتے ہیں۔ بلکہ بعض علماء بھی اس کی ستائش کرنے میں دریغ نہیں کرتے۔ حالانکہ ایران نے انقلابِ خمینی کے دور میں اور اس کے بعد سُنّیوں پر ایسے مظالم ڈھائے اور ڈھارہا ہے کہ جنھیں سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ اب تک لاکھوں سنیوں کا خون بہا چکے ہیں اور بغیر کسی تحقیق و ثبوتِ جرم ہزاروں کو پھانسی پر لٹکا چکے ہیں یا گولی مار چکے ہیں۔ اور اب تک سنیوں پر جھوٹے الزام لگا کر سزائے موت دینے کا سلسلہ جاری ہے۔ یہ بات بالکل واضح ہوچکی ہے کہ خمینی اور ان کے ہم مذہب اسلام کے دشمن ہیں۔ مگر مودودی صاحب کے ہم مشربوں اور ان کی پیروی کرنے والوں میں سے کسی کی زبان سے آج تک کوئی لفظ ایران کی چنگیزی و فرعونی حکومت کی مذمت میں نہیں نکلا، بلکہ یہ لوگ ایران کی مدح و ستائش کرتے رہتے ہیں اور اس کی خوشامد میں لگے رہتے ہیں اور بعض اس کے شیعی نظام کو اسلامی نظام کے نام سے موسوم کرکے اسلام کی توہین و تنقیص کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ بعض مشاہیر علماء اہلسنت نے بھی اپنی شیعیتِ خفیہ کی وجہ سے یا ایران اور شیعوں کو خوش کرنے اور نفع دنیا حاصل کرنے کے لیے خمینی آنجہانی مذکور کو اپنا مقتداء اور پیشوا تک کہہ دیا تھا۔ بعض نے ایران کے ''جشن انقلاب'' میں شرکت کی اور خمینی آنجہانی کو تحفے تحائف دیئے۔ حالانکہ یہ جشن درحقیقت سنیوں کی تباہی کا جشن تھا۔

شیعہ مؤرخوں اور راویوں نے اسلامی تاریخ کو تاریک بنانے، خلفائے اسلام، ان کی حکومتوں اور ان کے عمال کو بدنام کرنے کے لیے جھوٹ بولنے کے ساتھ مغالطہ دہی سے بھی خوب کام لیا ہے۔ اس مغالطہ دہی کی ایک مثال عبدالرحمٰن بن محمد

بن اشعث کی بغاوت کا بیان بھی ہے، جس کا مختصر تذکرہ چند صفحات پیشتر ہو چکا ہے۔ یہاں اس پر مزید روشنی ڈالنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس سے مخالفین بنی امیہ کی بیمار ذہنیت اور زیادہ واضح ہو جائے گی۔

ابن الاشعث کی بغاوت:

عبدالرحمٰن بن محمد بن اشعث حجاجؒ کے زمانے میں ایک فوجی افسر تھا۔ آدمی تیز اور ذہین تھا، عراق کا باشندہ تھا، جہاں ایرانی سبائی خاصی بڑی تعداد میں رہتے تھے۔ عراق کے دو اہم شہر کوفہ اور بصرہ ان کے مرکز تھے۔ یہ ''تقیہ'' کے غول میں پوشیدہ رہتے تھے اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی خفیہ تدبیروں میں مصروف رہتے تھے۔ نفاق ان کا شعار اور خفیہ ساز باز انکا اصولِ کار تھا۔ ابن الاشعث کے آخری کردار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی درحقیقت اسی گروہ سے تعلق رکھتا تھا، مگر مدتِ دراز تک تقیہ کی نقاب میں اپنا اصل چہرہ چھپائے رہا۔ امیر حجاجؒ کے معترضین نے اس کی بغاوت کے واقعہ کو اس طرح سے ذکر کیا ہے کہ گویا اس نے کوئی جہاد فی سبیل اللہ کیا ہو۔ حالانکہ علماء و مؤرخین اسلام نے عموماً اس کی اس بغاوت کو ''فتنۂ ابن الاشعث'' کے عنوان سے (بذیل حوادث ۸۰ھ و ۸۲ھ) ذکر کیا ہے اور اس کی بغاوت کے واقعہ پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے:

> ''عبدالرحمٰن بن محمد بن الاشعث ایک فوجی افسر تھا۔ یہ عراق کا رہنے والا تھا۔ تیز، جری اور ذہین آدمی تھا۔ حجاجؒ نے اسے سجستان کا گورنر بنا کر بھیج دیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے قریب کے کافر ملک پر حملے شروع کر دیئے۔ ان بلادو امصار کا والی ایک مشرک رتبیل نامی تھا۔ یہ حملے صرف سرحد تک محدود تھے اور سرحدی چھیڑ چھاڑ کی حد سے آگے نہیں بڑھے تھے۔ کچھ مدت کے بعد حجاج نے اسے لکھا کہ رتبیل کے

ملک پر باقاعدہ حملہ کرے اور اندرون ملک تک فوجیں لے جا کر اس
کی سرزمین کو فتح کرے۔ چونکہ حجاج سے اس کی مخالفت تھی۔ (۱)
اس لیے اس نے یہ کہا کہ اس نے اس جنگ کا حکم اس لیے دیا ہے کہ
اسے اور اس کے لشکر کو تباہ کروا دے۔ اس نے اپنے لشکر والوں سے

ا۔ عبدالرحمٰن بن محمد بن الاشعث سے امیر حجاجؒ کے ناراض ہونے کی وجہ یہ تھی کہ بعض واقعات کی وجہ سے انہیں شبہ پیدا ہوگیا تھا کہ وہ خلافتِ اسلامیہ کے خلاف سازش کررہا ہے اور اس کا رجحان غداری کی طرف ہے۔ ایک واقعہ تو یہ ہے کہ جب حجاجؒ نے اسے شبیب خارجی کے مقابلے میں بھیجا تو اس نے جنگ کرنے میں ڈھیل اور سستی سے کام لیا۔ ایک موقع پر جب شبیب پسپا ہوچکا تھا اور اس کی مکمل شکست قریب تھی، ابن الاشعث نے مقام جوخی میں قیام کرکے اس کی درخواست پر اس کے ساتھ التوائے جنگ کا معاہدہ کرلیا اور اسے جنگ کی تیاری کا موقع دے دیا۔ اس موقع پر عثمان بن قطن نے حجاجؒ کو اطلاع دی کہ ''عبدالرحمٰن نے تمام علاقہ جوخی کو کھود کر ایک خندق بنادیا ہے۔ شبیب کو تو چھوڑ دیا ہے مگر اس علاقہ کی مال گذاری اپنے خرچ میں لا رہا ہے اور باشندوں کو کھائے جاتا ہے''۔ گویا وہ دیدہ و دانستہ دشمن کو قوت حاصل کرنے کی مہلت دے رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ خیانت وظلم کا مرتکب بھی ہورہا تھا۔ (طبری مترجم احوال، ۷۶ھ حصہ ۵ ،صفحہ ۲۱۰)
مندرجہ ذیل واقعہ بھی اس کے ساتھ حجاجؒ کی بدگمانی کو جائز اور درست ثابت کرتا ہے ۔جس زمانہ میں وہ حجاجؒ کے حکم سے شبیب خارجی سے جنگ میں مصروف تھا، اس زمانے کا ایک واقعہ طبری لکھتا ہے:
عبدالرحمٰن نے وہ رات دیر الیعار میں بسر کی۔ دو سوار آئے اور اس کے پاس کوٹھے پر چلے گئے۔ ایک شخص تو علیحدہ کھڑا ہوگیا اور ایک بہت دیر تک عبدالرحمٰن سے تنہائی میں باتیں کرتا رہا۔ پھر وہ اتر آیا اور اس کے دوسرے ساتھی بھی نیچے اتر آئے۔ بعد میں لوگوں نے بیان کیا کہ جو شخص عبدالرحمٰن سے باتیں کرتا رہا وہ شبیب تھا اور عبدالرحمٰن میں اور اس میں پہلے سے مراسلت ہوا کرتی تھی۔ طبری، مترجم حصہ ۵ ،صفحہ ۲۱۶)
اس کا مطلب ہے کہ وہ خلافت کے دشمنوں سے مل گیا تھا اور خلافت کے خلاف ان سے ساز باز کررہا تھا۔

کہا کہ ہمارے پاس اتنی قوت نہیں ہے کہ ہم رتبیل کے ملک پر حملہ کرسکیں اور اندرون ملک جا کر لڑسکیں، حجاجؒ نے ہمیں تباہ کرنے کے لیے یہ حکم دیا ہے۔ اس لیے مجھے امیر بنالو اور خلافت پر قبضہ کرو۔ حجاجؒ اور عبدالملکؒ دونوں کو ختم کردو۔ فوج اس پر راضی ہوگئی اور اس نے بغاوت کردی۔ اس کے ساتھ بہت سا لشکر ہوگیا اور اس نے بلاد اسلامیہ پر حملے شروع کردیئے۔ حجاجؒ نے عبدالملک کو کمک کے لیے لکھا، اس نے ابن الاشعث کے مقابلے کے لیے شام سے لشکر بھیجا، جس نے اسے ہزیمت دی۔ یہاں تک کہ ''بست'' کے مقام پر پہنچ کر اس کا لشکر منتشر ہوگیا اور ''بست'' کے عامل نے اسے قید کردیا۔ یہ واقعہ رتبیل کو معلوم ہوا تو وہ اپنا لشکر لے کر بست پہنچا اور ابن الاشعث کو قید سے چھڑا کر اعزاز و اکرام کے ساتھ لے گیا۔[1]

علامہ ذہبیؒ کے اس بیان پر نظر کرنے کے بعد یہ بات محتاجِ بیان نہیں رہتی کہ ابن الاشعث نے بغاوت بھی کی اور غداری بھی۔ اس نے خلافتِ اسلامیہ کے خلاف تلوار اٹھائی اور نظامِ خلافت کو ختم اور مسلمانوں کے مِلّی شیرازے کو پراگندہ کرنے کی ناپاک اور انتہائی مذموم کوشش کی۔ اس نے اسی پر اکتفاء نہیں کیا، بلکہ نہایت مکروہ قسم کی غداری بھی کی۔ وہ کافروں سے مل گیا اور انھیں اسلامی ملک پر مسلط کرنا چاہا۔ کافروں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کا خون بہایا اور اپنے کافر دوست رتبیل کی تحویل میں چلا گیا۔ اس طرح یہ غدار کافروں کا دوست اور مسلمانوں کا دشمن بن گیا۔ اس کا ناپاک کردار بتا رہا ہے کہ یہ یقیناً کوئی سبائی تھا جو اتنی مدت تک اپنی شیعیت کو تقیہ کی نقاب میں چھپائے رہا۔ موقع پاتے ہی اس نے امّتِ مُسلّمہ پر وار کیا۔ اس کی اس بغاوت، غداری، عداوتِ خلافت اسلامیہ اور مسلم کشی کو علامہ ذہبی (اور

۱۔ تاریخ الاسلام وطبقات المشاہیر و الاعلام، صفحہ ۲۳۰ جلد ۳۔ ناشر مکتبہ القومی القاہرہ، مصر۔

عام طور پر علماء ومؤرخین) ''فتنہ'' کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ مودودی صاحب اس کی اس حرب فی سبیل الطاغوت کو جہاد فی سبیل اللہ کا درجہ دیتے ہیں۔ العیاذباللہ ثم العیاذباللہ۔ اس سے ان مخالفینِ بنی امیہ و بنی عباس کی ذہنیت کی پستی اور دروغ پسندی واضح ہوجاتی ہے۔ یہ حسد اور عداوتِ خلافت اسلامیہ کے جذبات سے مغلوب ہو کر حق و انصاف اور شریعت مقدسہ اسلامیہ کے احکام سب کو نظر انداز کردیتے ہیں۔

علامہ ذہبی کے مندرجہ بالا بیان میں صاف صاف کہا گیا ہے کہ بست کے مقام پر پہنچ کر اس کا لشکر منتشر ہوگیا۔ اس کے الفاظ یہ ہیں :

''وتفرق اصحاب ابن الاشعث یعنی ابن الاشعث کے ساتھی اس سے جدا ہوگئے۔''

بست میں اس کے لشکر نے اسے چھوڑ دیا، اسی وجہ سے بست کے عامل نے اسے آسانی کے ساتھ گرفتار کرلیا۔

مودودی صاحب کہتے ہیں کہ

''ابن کثیر کا بیان ہے کہ قراء (یعنی علماء وفقہاء) کی ایک پوری رجمنٹ اس کے ساتھ تھی۔''

ان کے اس قول پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ''قراء'' کی یہ ''رجمنٹ'' کب سے اس کے ساتھ ہوئی تھی اور کب اس سے الگ ہوگئی؟ اتنا تو ماننا پڑے گا کہ بست کے مقام پر پہنچ کر اس کا سارا لشکر اس کا مخالف ہوکر اس کا ساتھ چھوڑ چکا تھا۔ اس لیے مخالفینِ خلافت کو اتنا تو تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ ''قراء'' کی یہ نام نہاد ''رجمنٹ'' بھی اس سے الگ ہوگئی تھی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قراء جو کہ بقول مودودی صاحب ابن الاشعث کی فساد انگیزیوں اور بغاوت و غداری کو ''جہاد'' ہونے کی سند دے رہے تھے اور جہاد ہی سمجھ کر اس میں شریک ہوئے تھے، ''جہاد'' سے ''فرار'' کے گناہ کبیرہ کے مرتکب ہوئے یا نہیں؟ ہزاروں علماء کا اس طرح غدر کرکے بقول

راوی ''جہاد'' سے ''فرار'' کی معصیتِ عظیمہ کا مرتکب ہونا تو بہت اہم اور عبرت خیز بات ہے، اگر ایسا ہوتا تو اس کا عام طور پر چرچا ہوتا۔ یقیناً تاریخ کے صفحات میں ملامت کے عنوان سے اس کا تذکرہ ہوتا۔ لیکن ہم تاریخ کے صفحات اس سے خالی پاتے ہیں۔ جن علماء و مشائخ کا نام اس سلسلے میں آتا ہے مثلاً امام شعبی، امام ابن ابی لیلیٰ، حسن بصری، و امثالہم ان کا تذکرہ کتب رجال میں دیکھیے تو ان میں بھی ان کی اس مبینہ معصیتِ کبیرہ کا کوئی تذکرہ نہیں ملے گا۔ مزید یہ کہ یہ سب حضرات اپنے وطن واپس آئے تو ان سے حجاجؒ یا عبدالملکؒ کسی نے بھی کوئی باز پرس نہیں کی اور ابن الاشعث کے ساتھ بغاوت میں شرکت پر ان میں سے کسی کو بھی سزا نہیں دی۔ پھر ابن کثیرؒ کے اس قول کو کس طرح صحیح سمجھا جاسکتا ہے کہ ''قراء'' کی ایک پوری ''رجمنٹ'' باغی ہوکر ابن الاشعث کے ساتھ غدرو بغاوت میں شریک ہوگئی تھی۔ ان کے قول کی صحت کی صرف یہ صورت ہے کہ اس سے مراد ان کی ابتدائی شرکت ہو، یعنی جب ابن الاشعث بحکم حجاجؒ جہاد کے لیے روانہ ہوا تھا تو یہ سب حضرات علماء کفار سے جہاد کرنے کے لیے اس کے ساتھ گئے تھے اور جہاد میں شریک ہوئے تھے۔ مگر جب اس کی نیت خراب ہوئی اور کفار سے جہاد کے بجائے اس نے خلافت سے بغاوت اور ملت اسلامیہ کے ساتھ غداری کے جرم عظیم کا ارتکاب کیا تو یہ حضرات علماء اس سے الگ ہوگئے۔ اس کے بعد اگر وہ فوری طور پر واپس نہ آسکے تو یہ رکنا مجبوری میں تھا۔ ظاہر ہے کہ ابن الاشعث نے قطعی یہ پسند نہ کیا ہوگا کہ اتنی بڑی جماعت خصوصاً علماء کی جماعت، عین میدان جنگ میں اس کے لشکر سے الگ ہوجائے اور دارالاسلام پہنچ کر اس کی مخالفت کرے۔ اس لیے اس نے انھیں ڈرا دھمکا کر لشکر میں ٹھہرنے پر مجبور کیا ہوگا۔ موقع ملتے ہی یہ لوگ وہاں سے واپس آگئے اور اس فتنہ پرداز سبائی ذہن والے غدار باغی کے فتنہ کو فرو کرنے میں حکومت اسلامیہ کی اعانت کرنے لگے۔ اگر

ابن کثیرؒ کے قول مذکور کا یہ مطلب نہ لیا جائے تو کہنا پڑے گا کہ انھوں نے غلط بیانی کی اور سبائی مؤرخین و رواۃ کے کذب و بہتان کو نقل کرکے اپنے مؤرخانہ وقار کو مجروح کرلیا۔

ہمارے نزدیک ابن کثیرؒ کے قول کا مطلب وہی ہے جو ہم نے بیان کیا ہے۔ مودودی صاحب نے اس سیاق میں نقل کرکے ناواقف قاری کو مغالطہ دینے کی افسوسناک کوشش کی ہے۔ جہاد میں ان علماء کی شرکت سے انکار نہیں، مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ بغاوت و غدر میں بھی اس فتنہ پرداز کے شریک تھے۔ انھیں مفسد و باغی ابن الاشعث کا شریک کار یا موید کہنا ان حضرات پر بہتان و افتراء اور سراسر کذب و دروغ ہے۔ بلاشبہ ان حضرات نے اس وقت اس کا ساتھ دیا تھا، جب وہ کفار کے مقابلے میں مصروف جہاد تھا مگر جب اس نے بغاوت اور غداری کی تو اس وقت یہ اس سے الگ ہوگئے۔ ابن کثیرؒ کے قول مذکور یا اسی مضمون کے دوسرے اقوال و روایات سے اس مقصد پر استدلال کرنا بہت مذموم غلطی اور مکروہ قسم کی مغالطہ دہی ہے۔

اس سے یہ بات بھی روشن ہوگئی کہ ابن الاشعث کی تائید میں امام شعبیؒ، حسن بصریؒ، ابن ابی لیلیٰؒ کی جو تقریریں مودودی صاحب نے نقل کی ہیں وہ بھی موضوع، جعلی اور سبائی رواۃ و مؤرخین کی گھڑی ہوئی ہیں۔ جب یہ لوگ اسے چھوڑ کر واپس چلے گئے تھے اور غدر و بغاوت اور فتنہ میں اس کے شریک ہی نہیں رہے تو یہ تقریریں کب کیں؟ اور کیوں کیں؟ نیز یہ کہ پھر جب اپنے وطن واپس آئے تو ان تقریروں کی بناء پر حکومتِ اسلامیہ نے ان کی گرفت کیوں نہ کی؟ اس سے عیاں ہے کہ یہ تقریریں جھوٹے سبائی راویوں کی تصنیف کی ہوئی ہیں اور ان بزرگوں کی طرف ان کی نسبت بالکل غلط اور خالص جھوٹ ہے۔

سعید بن جبیرؒ کے قتل کی اصل وجوہات:

تاہم سعید بن جبیرؒ کی طرف منسوب کر کے جو تقریر نقل کی گئی ہے اس کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ واقعی ان کی تقریر تھی۔ اس کا قرینہ یہ ہے کہ ابن الاشعث کی تائید اور بغاوت و غدر پر لوگوں کو برانگیختہ کرنے کے جرم پر ان کی گرفت کی گئی اور حجاجؒ نے انھیں سزائے موت دی۔ ممکن ہے کہ دو ایک اور غیر معروف علماء جو سعید بن جبیرؒ کی طرح سبائی تشہیر و تزویر کا شکار ہو گئے ہوں، ان کے ہم خیال ہوں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ابن الاشعث حق پر تھا، اس کا باطل ہونا دلیلِ شرعی سے ثابت ہے۔ خلافتِ اسلامیہ سے بغاوت خود معصیتِ کبیرہ اور جرمِ عظیم ہے۔ اس کے ساتھ اس کا کفار سے مل جانا، ان کے ہاتھ سے مسلمانوں کو قتل کروانے اور مملکتِ اسلامیہ کو تباہ کرنے کی کوشش کرنا تو نہایت ہی مکروہ اور شنیع غداری ہے جس کا گناہِ عظیم اور معصیتِ کبیرہ ہونا بدیہی اور واضح ہے۔ ایسے مفسد، باغی اور غدار کی تائید کرنا، اس کی غداری، بغاوت اور اس کے فساد فی الارض کو ''جہاد'' کہنا نہایت قبیح اور جرمِ عظیم ہے۔ اس تائید کا مطلب خود ان جرائم میں شرکت کرنا ہے۔ سعید بن جبیرؒ اس کے مرتکب ہوئے۔ حجاج مرحوم نے بہت کوشش کی کہ وہ اپنے گناہ عظیم سے باز آجائیں۔ انھیں نرمی کے ساتھ سمجھایا بجھایا، استمالت کے لیے ہدیئے تحفے دیئے لیکن سبائی زہر ان کے دماغ پر اس قدر قوی اثر کر چکا تھا کہ وہ کسی طرح اس سے باز نہ آئے۔ بغاوت اور غداری کی سزا شرعاً و عقلاً قتل ہے۔ وہ ایک باغی، مفسد کی پرزور تائید کر رہے تھے۔ اسے تقویت پہنچانے کے ساتھ، دوسروں کو بغاوت و غداری اور فساد فی الارض کی ترغیب دے رہے تھے۔ اس طرح وہ خود ان عظیم و قبیح جرائم و معاصی کے مرتکب ہو رہے تھے۔ وہ شرعاً مستوجب

قتل تھے۔ حجاجؒ نے جو انھیں سزائے موت دی تو اس کا یہ فیصلہ شرعاً وعقلاً ہر طرح جائز تھا۔ اسے ظلم کہنا خود ظلم ہے۔

سعید بن جبیرؒ بہت بڑے درجے کے عالم دین تھے، مجتہد تھے، اپنی ذاتی و انفرادی زندگی میں بہت متقی اور عابدو زاہد تھے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ اسلامی قانون سے بالاتر ہوگئے تھے۔ شریعتِ اسلامیہ، قانون سے استثناء کی اجازت کسی کو نہیں دیتی۔ قانون سب کے لیے ایک ہی ہے۔ کسی کو اس کی ذاتی زندگی کی پاکیزگی یا اس کے علم و فضل کی وجہ سے کسی جرم کی سزا سے مستثنیٰ نہیں کیا جاسکتا۔ ہم ان کی مغفرت کے لیے دعا تو کرتے ہیں مگر انھیں اس جرم سے بری نہیں کہہ سکتے اور ان کی اس معصیت کبیرہ کو طاعت و سعادت نہیں کہہ سکتے۔

بکثرت لوگ اس مغالطہ میں مبتلا ہوجاتے ہیں کہ کسی انسان کی انفرادی زندگی اور اس کی اجتماعی زندگی، دونوں میں ہمیشہ یکسانیت ہوتی ہے۔ جو شخص اپنی ذاتی اور انفرادی حیات میں متقی، عابد و زاہد ہوتا ہے، اس کے متعلق عام طور پر لوگ یہ حسنِ ظن قائم کرلیتے ہیں کہ سیاسی میدان میں بھی اس کا ہر قدم زہد و تقویٰ کا پابند ہوگا۔ بکثرت ایسا ہوتا بھی ہے یعنی ایسے افراد بھی شاذو نادر نہیں ہیں جن کی انفرادی زندگی اور اجتماعی زندگی میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ وہ جس طرح اپنی ذاتی زندگی میں متقی ہوتے ہیں، اسی طرح اپنی اجتماعی زندگی مثلاً معاشرت، سیاست وغیرہ میں بھی تقویٰ ان کا شعار ہوتا ہے۔ اور وہ حبۃ اللہ اخلاص کے ساتھ دین و ملت کی خدمت و نصرت کرتے ہیں۔ لیکن ہمیشہ ایسا ہونا ضروری نہیں ہے۔ بکثرت مثالیں اس کے برعکس بھی ملتی ہیں۔ تاریخ دیکھئے اور اپنے زمانے کے حالات کا بغور مطالعہ کیجئے تو بہت بڑی تعداد ایسے اشخاص کی ملے گی جن کی انفرادی زندگی دینی اور اخلاقی نقطہ نظر سے بہت قابل تحسین و ستائش نظر آتی ہے مگر ان کا اجتماعی کردار قبیح و مذموم دکھائی

دیتا ہے۔[1]

سعید بن جبیرؒ بھی اسی قسم کے شخص تھے۔ بہت بڑے درجہ کے عالم دین تھے اور ان کی انفرادی زندگی زہد و تقویٰ کے رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ مگر ذہن نے سبائی زہر پی لیا تھا۔ بعض افکار بگڑے تو اجتماعی کردار میں بھی فساد پیدا ہوا اور اس نے تقویٰ و احتیاط کے سب حدود پار کر لیے۔ اسلامی حکومت و نظامِ حکومت کے خلاف اسلام ہی کا نام لے کر ایک باغی و غدار کی حمایت کرنے لگے، یہی نہیں بلکہ اس کی بغاوت و غداری کی تحسین کر کے دوسرے لوگوں کو اس میں شرکت کی دعوت دینے لگے۔ ان حالات میں حجاج مرحوم کی حکومت کے بجائے کوئی دوسری حکومت ہوتی تو وہ بھی وہی کرتی جو حجاجؒ نے کیا۔ ان کا یہ فیصلہ شرعاً، عقلاً و عرفاً ہر طرح جائز تھا۔ اس پر اعتراض کرنا اور اسے ظلم کہنا صحیح نہیں۔

خلافت بنی امیہ کے مخالفین و معاندین اور ان کی عظمت پر حسد کرنے والوں میں جو ذہین اور صاحب علم ہیں، وہ اپنی کمزوری سے واقف ہیں۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ دلیل و برہان سے ہم اپنے غلط دعویٰ کو ثابت نہیں کر سکتے۔ اس لیے وہ تشہیر اور پروپیگنڈے کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ استدلال کے بجائے خطابت سے کام لینے کے لیے اس دور اور بعد کے دور کے متعدد علماء کے اقوال پیش کرنے لگتے ہیں کہ دیکھو فلاں فلاں نے حجاج کو ظالم و جابر کہا ہے، جیسے مودودی صاحب نے حضرت حسن بصریؒ وغیرہ کے دو تین اقوال پیش کیے ہیں۔ چند صفحات پہلے میں ان کا تذکرہ کر کے

۱۔ موجودہ دور (۱۹۹۰ء مطابق ۱۴۱۰ھ) میں بھی اس کا مشاہدہ ہو رہا ہے۔ ہماری سیاسی قیادت جن لوگوں کے ہاتھوں میں ہے، ان میں بکثرت ایسے افراد بھی ہیں جن کی ذاتی اور انفرادی زندگی بہت متقیانہ اور قابل تحسین ہے۔ لیکن یہی حضرات جب کسی سیاسی پلیٹ فارم پر آتے ہیں، یا کسی ادارے کے سربراہ یا عہدہ دار مقرر ہو جاتے ہیں تو ان میں اور ایک فاسق و فاجر سیاسی لیڈر، یا سربراہ میں کوئی فرق نہیں رہتا۔

ان کا جواب دے چکا ہوں۔ سعید بن جبیرؒ کے قتل کے بارے میں مخالفین خلافت نے یہی روش اختیار کی ہے۔ یہ لوگ اس حادثے کے متعلق بہت سے علماء و مشائخ کے منثور مرثیوں کا انبار لگادیتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ سعید بن جبیرؒ کے قتل کی کیفیت و حالت کے متعلق جو افسانے ، سبائیوں اور سبائیت نوازوں نے گھڑے ہیں انھیں بھی باندازِ مرثیہ خوانی بیان کرتے ہیں۔ ان غلط اور سبائیوں کی گھڑی ہوئی کہانیوں کی اس قدر تشہیر کی گئی کہ قدیم طرز کے مدارسِ عربیہ کے طلبہ میں ان کا تذکرہ ہوتا رہتا ہے۔ حالانکہ ان مدارس میں تاریخ کا مضمون داخلِ نصاب نہیں ہے۔ عبدالملک کے بارے میں جو مضمون لکھا جاتا ہے تو اس میں حجاج کا تذکرہ اور اس قتل کے واقعہ کا ذکر کرنا اور اس کے ساتھ یہ لکھنا کہ ''سعید بن جبیرؒ نے قبلہ کی طرف رخ کیا تو حجاجؒ نے ان کا رخ ادھر سے پھروادیا'' ضروری سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ محض افسانہ ہے جس کا کوئی ثبوت نہیں۔ شیعہ مؤرخین اور شیعہ راویوں نے جھوٹے قصے گھڑے ہیں جو بالکل بے اصل ہیں۔

اس مغالطہ انگیز استدلال کا اطمینان بخش ردو و جواب یہ ہے کہ اس واقعہ کا کسی مؤرخ اور عالم دین نے انکار نہیں کیا کہ سعید بن جبیرؒ ، ابن الاشعث کی تائید کررہے تھے۔ اور صرف تائید نہیں بلکہ لوگوں کو اس کی بغاوت و غداری میں شریک ہونے کی ترغیب بھی دے رہے تھے۔ باوجود افہام وتفہیم اور استمالت وہ اس سے باز نہیں آئے۔ یہی ان کا جرم تھا۔ جب جرم ثابت ہوگیا تو شرعاً وعقلاً ہر طرح ان کا قتل جائز قرار پایا۔ اس کے بعد مؤرخین اور علماء کا محض اپنے جذبات کی بناء پر اسے مذموم کہنا قطعاً قابل اعتبار نہیں اور ان کے جذباتی اقوال کو پرکاہ کے برابر بھی وزن نہیں دیا جاسکتا۔ جب دلیلِ شرعی سے ایک چیز کی صحت ثابت ہوگئی تو مؤرخین وعلماء کی ذاتی و جذباتی رائے اور ان کی نوحہ خوانی کی بناء پر عدل کو ظلم اور صحیح کو غلط نہیں کہا جاسکتا۔

اموی دور یا عباسی دور کے بعض علماء نے جو اس واقعہ پر مرثیہ خوانی کی ہے اور

اسے حجاجؒ کا ظلم قرار دیا ہے، اس کے متعدد اسباب ہیں۔ مناسب ہے کہ یہاں ان کی طرف اشارہ کردیا جائے۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ صرف سعید بن جبیرؒ کے قتل کے معاملے میں نہیں بلکہ اسلامی تاریخ کے بہت سے مسائل کے بارے میں قاری سبائی مغالطوں سے محفوظ رہ سکیں گے۔

ایک عام قانونِ نفسی اس کا پہلا سبب ہے۔ وہ یہ ہے کہ بعض خصوصیات میں اشتراک کی وجہ سے جب بہت سے افراد کا ایک گروہ بن جاتا ہے تو ان میں ایک گروہی عصبیت پیدا ہوجاتی ہے۔ اور کبھی یہ اس قدر بڑھتی ہے کہ انسان اپنے زمرے کے آدمی کی حمایت میں جاو بے جا کی بھی کوئی پرواہ نہیں کرتا۔ پھر یہ کہ سعید بن جبیرؒ کے شاگرد بھی بکثرت تھے، ان صورتوں کی وجہ سے جب وہ قتل کیے گئے تو علماء کے دل کو انھیں خطاوار جاننے کے باوجود صدمہ پہنچا اور اسی لیے انھوں نے حجاج کی مذمت شروع کردی اور عدل کو ظلم کہنے لگے۔

بغیر کسی تحقیق کے حجاجؒ کو ظالم اور اموی خلفاء کو ستم گر کہنا اسلامی تاریخ پر ظلم ہے:

عباسی دور کے بعض علماء و مؤرخین نے شیعوں اور حکومت کو خوش کرنے کے لیے بنو امیہ پر طعن و تشنیع کرنا مناسب اور نفع بخش خیال کرکے موقع بے موقع ان پر طعن و تشنیع کی بوچھاڑ کی۔ اس سلسلہ میں حجاجؒ کے خلاف زہر افشانی ناگزیر تھی۔ عباسی دور میں شیعوں کا اتنا زور بڑھ گیا تھا کہ اربابِ حکومت کا قرب حاصل کرنے کے لیے شیعوں کو خوش رکھنا مفید بلکہ ایک حد تک ناگزیر معلوم ہوتا تھا۔ براہ راست حکومت کو خوش کرنے کے لیے بھی یہ ذریعہ مناسب معلوم ہوتا تھا۔ ہندوستان کے علماء نے عہد عباسی کے انھیں علماء کی تقلید کی اور بغیر کسی تحقیق کے حجاج کو ظالم و جابر اور اموی خلفاء کو ستم گر کہتے رہے۔ اور بعض نے ان مطاعن کی حقیقت سے واقفیت

کے باوجود شیعوں کی خوشنودی کے لیے ان کی خصلت تبرا بازی اختیار کرلی اور اموی خلفاء وعمال و حکام کو برا کہنا اپنا شعار بنالیا۔ ان علماء و مؤرخین اہلسنت کے اس طرزعمل کی نوعیت کا علم ہونے کے بعد حجاجؒ یا خلفائے بنی امیہ کے بارے میں ان کی مذمت کا اعتبار کرنا اور اسے اسلامی تاریخ کو تاریک ثابت کرنے کے لیے دلیل بنانا عقل و دانش سے بے رخی، عدل و انصاف سے بے مہری اور اسلامی تاریخ پر ظلم ہے۔

علماء کے ایک طبقہ کی اس غلط روی کے نظائر بکثرت ہیں۔ ایک واقعہ جو چند سال پہلے پاکستان ہی کی سرزمین پر پیش آیا پیش کرتا ہوں۔ میں اس وقت تک پاکستان نہیں آیا تھا بلکہ ہندوستان ہی میں مقیم تھا۔ اخبارات سے اس واقعہ کا علم ہوا اور جب ۱۹۷۰ء میں پاکستان آیا تو اس کی مزید تصدیق ہوئی۔ صحیح سنہ تو یاد نہیں لیکن اندازہ ہے کہ ۲۰، ۲۵ سال گزرے ہوں گے۔ عراق میں تین چار شیعہ علماء کو غداری اور حکومتِ بنی اسرائیل سے عراق کے خلاف ساز باز کرنے کے الزام میں پھانسی دی گئی۔ ان سب پر باقاعدہ عدالت میں مقدمہ چلایا گیا اور انھیں اپنے دفاع کا پورا موقع دیا گیا۔ الزام ثابت ہوگیا تو انھیں قانون کے مطابق سزائے موت دی گئی۔ مگر حکومتِ عراق کے سربراہ سُنّی تھے۔ اس لیے پاکستان کے شیعہ علماء میں صف ماتم بچھ گئی اور انھوں نے حکومتِ عراق کے خلاف احتجاج شروع کیا۔ اس احتجاج کا مکروہ پہلو یہ تھا کہ اس میں بعض علمائے اہلسنت بھی باجبہ و دستار شریک تھے اور عراق کی سُنّی حکومت کے خلاف زہر افشانی میں وہ بھی شیعوں سے پیچھے نہیں رہے۔

اس واقعہ پر نظر کرنے کے بعد آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ عہدِ عباسی میں علماء کی ایک تعداد کا شیعہ نواز ہونا قطعاً قابلِ تعجب اور بعید از قیاس نہیں۔ ایسے علماء کے لیے ہم دعائے مغفرت تو کرسکتے ہیں، ان کے نام کے ساتھ رحمہ اللہ اور غفرلہ بھی لکھ سکتے ہیں لیکن ان کے غلط اقوال و بیانات کو صحیح نہیں کہہ سکتے۔ اور ان کے ان اقوال فاسدہ کا اعتبار کرکے اپنی شاندار اور درخشاں تاریخ کو داغدار نہیں بنا سکتے۔

جس طرح ابن الاشعث کی بغاوت اور غداری ایک فتنہ تھی، اسی طرح صفحاتِ تاریخ میں اس کی حکایت بھی کسی حد تک ایک فتنہ ثابت ہوئی ہے۔ یوں تو مؤرخین کا بیان واضح ہے۔ خصوصاً علامہ ذہبیؒ نے تو بات بالکل صاف کردی ہے اور یہ حقیقت خوب عیاں کردی ہے کہ ابن الاشعث مذکور باغی اور غدار واجب القتل تھا۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی ان کے بیان سے بالکل عیاں اور الم نشرح ہوگئی کہ علماء و صلحاء اہلسنت قطعاً اس کی بغاوت و غداری میں شریک نہیں ہوئے۔ ایک دو علماء جن کا ذہن سبائی زہر سے متاثر و مسموم ہوگیا تھا، اس کے موید ہوگئے تھے مگر ایک دو عالموں کی تائید و شرکت کو علماء کی شرکت نہیں کہہ سکتے۔ ان کی کتاب ''تاریخ الاسلام'' سے چند صفحات پہلے یہ سب باتیں نقل کی جاچکی ہیں، مگر جس عبارت کا ہم نے حوالہ دیا ہے اس کے آخر میں ایک جملہ ایسا بھی ہے جس سے مخالفینِ خلافتِ بنی امیہ ناواقفوں کو مغالطہ دینے کا کام لے سکتے ہیں، اس لیے مناسب ہے کہ اس کی وضاحت کردی جائے۔

علامہ ذہبی عبدالرحمٰن ابن الاشعث کی غداری اور پھر اس کا عسکرِ خلافت سے شکست کھا کر ''بست'' کی طرف فرار ، اس کے لشکر کا منتشر ہوجانا اور اس کا ساتھ چھوڑ دینا، عاملِ بست کا (جسے خود ابن الاشعث نے مقرر کیا تھا) اسے گرفتار کرلینا، ان سب امور کا تذکرہ کرکے لکھتے ہیں کہ اس موقع پر رتبیل اپنا لشکر لے کر آیا اور عاملِ بست کو جنگ و قتل کی دھمکی دے کر ابن الاشعث کو رہائی دلائی اور اعزاز و اکرام کے ساتھ اپنے ہمراہ لے گیا۔ اس کے بعد لکھتے ہیں:

وکان مع ابن الاشعث عدد کثیر من الاشراف والکبار ممن لم یثق بامان الحجاج

''اور ابن الاشعث کے ساتھ بہت سے معززین اور بڑے لوگ تھے، جنھیں حجاج کے وعدۂ امان کا اعتبار نہیں ہوا۔'' (مطلب یہ کہ وہ بھی ابن

الاشعث کے ساتھ رتبیل کے یہاں چلے گئے)

اس عبارت سے بعض لوگوں کو شبہ ہوا کہ شائد علماء کی ایک کثیر تعداد ابن الاشعث کی ہمنوا ہوگئی تھی، لیکن یہ شبہ بوجوہ ذیل غلط ہے:

۱۔ اس میں ''اشراف و کبار'' کے الفاظ ہیں۔ یعنی وہ لوگ جو سوسائٹی میں امتیاز رکھتے تھے اور انھیں عوام سے نسبتاً اونچا درجہ دیا جاتا تھا۔ ان لوگوں کا عالمِ دین ہونا ضروری نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ لوگ بڑے تاجر یا کسی بڑی جائداد کے مالک ہوں، یا کسی جگہ کے سیاسی و معاشرتی لیڈر ہوں۔ ''شریف و کبیر'' ہونے کے لیے کسی زمانہ میں بھی عالمِ دین ہونا ضروری نہیں تھا۔ اس سے ان کا زمرۂ علماء میں سے ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے برعکس یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ علماء میں سے نہیں تھے۔ اگر علماء ہوتے تو مؤرخ ضرور ان کا تذکرہ ''علماء'' کے لقب سے کرتا۔

۲۔ ''ممن لن یثق بامان الحجاج'' کے الفاظ سے عیاں ہے کہ حجاجؒ نے انھیں امان دے کر واپسی کی اجازت دیدی تھی۔ مگر امان کا مطلب تو یہی ہے کہ ان لوگوں نے ابن الاشعث کی بغاوت و غداری سے اپنی برات و بے تعلقی ظاہر کی تھی۔ حجاجؒ نے ان کی بات کا یقین کیا اور انھیں امان دیدی۔ اس سے روشن ہے کہ یہ لوگ بھی ابن الاشعث کے ساتھ اس وقت تک رہے جب تک وہ کفار کے مقابلے میں جنگ کرتا رہا۔ جب اس نے غدر کیا اور باغی ہوکر کافروں سے مل گیا تو ان ''اشراف و کبار'' نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اس لیے علامہ ذہبیؒ کی اس عبارت سے ابن الاشعث کی بغاوت و غداری میں علماء و صلحاء کی شرکت ثابت کرنے کی کوشش کرنا افسوسناک مغالطہ دہی اور فریب کاری ہے۔

حجاج بن یوسف ثقفیؒ کی دینی خدمات:

حجاج مرحوم نے قرآن مجید کی جو عظیم القدر خدمت انجام دی ، اس کا اعتراف کرنے پر ان کے دشمن بھی مجبور ہیں۔ مودودی صاحب نے بھی بادل نخواستہ لکھ دیا:

”قرآن پر اعراب لگوانا اس کی وہ نیکی ہے، جس کی تعریف رہتی دنیا تک کی جائے گی۔“(۱)

حجاجؒ کی یہی نیکی جسے اس کے دشمن بھی بادل نخواستہ تسلیم کرتے ہیں، ان کے ساتھ سبائیوں کی شدید عداوت کا سبب بن گئی۔ قرآن مجید سینوں اور سفینوں میں محفوظ ہو چکا تھا اور اس دور تک تواتر کے ساتھ پہنچا تھا۔ لاکھوں کی تعداد میں حفاظ اور سینکڑوں کی تعداد میں قرآن مجید کے نسخے موجود تھے۔ ان سب کی تعداد روز افزوں تھی۔ لیکن اس مکتوب قرآن مجید پر اعراب یعنی زیر، زبر، پیش نہیں لگے ہوئے تھے۔ قرآن مجید میں کسی تحریف کا امکان تو باقی نہیں رہا تھا لیکن اس کا اندیشہ تھا کہ کہیں شیعہ اور یہود عجمی نو مسلموں کو فریب دیکر اعراب کی غلطیوں میں مبتلا نہ کردیں نیز اس سے جو اختلاف ہو، اس کی اشاعت کر کے قرآن مجید کے محفوظ ہونے کے بارے میں دین سے ناواقف نو مسلموں کے دلوں میں شکوک و شبہات نہ پیدا کردیں۔ اس خطرے کا احساس حجاج مرحوم نے کرلیا اور قرآن پر اعراب لگوا کر اس کی حفاظت کے لیے ایک اور مضبوط حصار کا اضافہ کردیا۔ جس کی وجہ سے قرآن مجید میں اختلاف کا شبہ پیدا کرنے کا کوئی امکان ہی نہیں باقی رہا۔ حجاجؒ مرحوم کے اس اقدام سے شیعوں اور یہود کے ارمانوں پر اوس پڑگئی۔ یہ دشمنانِ قرآن تو اسی فکر اور کوشش میں لگے رہتے تھے کہ موقع نظر آئے تو قرآن مجید میں تحریف نہیں تو شبہ تحریف پیدا کر کے سب مسلمانوں کو نہ سہی، کم از کم نو مسلموں کے ایک گروہ کو تو

۱۔ خلافت وملوکیت، صفحہ ۱۸۵۔

گمراہ کردیں۔ حجاجؒ نے ان سب کو مایوس کردیا۔ اس مایوسی نے ان کے دل میں حجاجؒ کے خلاف عداوت کا شعلہ بھڑکادیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان دشمنانِ امت ِسبائیہ کاذبہ نے حجاجؒ مرحوم کے خلاف پیٹ بھر کر جھوٹ بولا ہے اور پیالہ بھر کر زہر اگلا ہے۔ شیعہ اور ان کے معاون خوب سمجھ گئے کہ قرآن مجید میں تحریف غیر ممکن ہے۔ لیکن انھوں نے سوچا کہ پورے قرآن مجید کو نہ سہی اس کے کسی چھوٹے سے جز کو ہی مشکوک بنادیں۔ اس کے لیے انھوں نے یہ تدبیر کی کہ بعض صحابہ کرامؓ کی طرف اختلاف قرأت کے نام سے بعض قرأتیں منسوب کردیں جو قرأت متواترہ سے بالکل مختلف تھیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی طرف جو قرأت، متواترہ قرأت کے خلاف منسوب ہے وہ بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے۔ شیعوں کے اس کیدو فریب کو مٹانے کے لیے اور اہل ایمان کو بچانے کے لیے انھوں نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی مبینہ قرأت کا پڑھنا اور لکھنا قانوناً ممنوع قرار دیا۔ ان کا یہ اقدام ہر طرح سے مستحسن اور لائق تعریف و ستائش ہے مگر سبائی ذہن اس واقعہ کو ان کا عیب کہتا ہے۔ چنانچہ مودودی صاحب لکھتے ہیں:

> ''حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو وہ سردار منافقین کہتا تھا۔ اس کا قول تھا کہ ابن مسعودؓ مجھے مل جاتے تو میں ان کے خون سے زمین کی پیاس بجھاتا۔ اس نے اعلان کیا کہ ابن مسعود کی قرأت پر کوئی شخص قرآن پڑھے گا تو اس کی گردن مار دوں گا اور مصحف میں سے اس کی قراءت کو اگر سور کی ہڈی سے بھی چھیلنا پڑے تو چھیل دوں گا۔''(۱)

''سور کی ہڈی سے چھیلنا'' اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی شان میں بے ادبی کرنا، روافض کا افتراء اور بہتان ہے۔ ان لوگوں نے حضرت عثمانؓ پر بھی یہ بہتان باندھا ہے کہ انھوں نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو پٹوایا جس سے انھیں ''ہرنیا'' کا

۱۔ خلافت وملوکیت، صفحہ ۱۸۶۔

مرض ہوگیا تھا۔ یہ سب سبائی کارخانہ دروغ بافی کی ساختہ روایتیں ہیں۔ صحیح بات صرف اتنی ہے کہ اس نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی مبینہ قرأت پڑھنے اور اشاعت و تعلیم کی سختی کے ساتھ ممانعت کردی تھی۔ اس کا یہ فعل حد درجہ قابل تحسین ہے۔ اس کا مقصد قرآن مجید کی حفاظت تھا۔ سبائی ذہن رکھنے والوں کا اس پر اعتراض کرنا، اس کی دلیل ہے کہ عداوتِ بنی امیہ کی شدت نے ان کی عقل وفہم کو ماؤف کردیا ہے کہ خوبی کو برائی کہہ رہے ہیں۔ حق یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی طرف قرأت متواترہ کے خلاف جو قرأت منسوب کی جاتی ہے وہ ان پر بہتان و افتراء ہے۔ اسی طرح بعض دوسرے صحابہؓ مثلاً حضرت ابن عباسؓ یا حضرت ابن عمرؓ وغیرہ کی طرف اس قسم کی جو قرأتیں منسوب کی جاتی ہیں وہ بھی قطعاً ان بزرگوں پر بہتان و افتراء ہیں۔ یہ حضرات اس سے بری ہیں۔ اس قسم کی سب روایتیں قطعاً باطل کذب و دروغ اور شیعہ مفسدوں کی وضع کردہ ہیں۔ قرآن مجید تواتر سے ثابت ہے اور اس کا ثبوت قطعی و یقینی ہے۔ خبر واحد سے کسی لفظ کا جزو قرآن ہونا قطعاً ثابت نہیں ہوسکتا۔ اسے قرآن یا اس کا جزو سمجھنا گمراہی اور ضلال ہے۔ کوئی عقل سلیم اس امر کو باور نہیں کرسکتی کہ یہ صحابہ کرامؓ جنھوں نے خود نبی کریم ﷺ سے قرآن مجید کی تعلیم حاصل کی، ساری عمر کسی آیت کی تلاوت میں غلطی کرتے رہے اور ان الفاظ کو الفاظِ قرآن سمجھتے رہے جو درحقیقت قرآن نہیں ہیں، جس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ اس موقع کے ان الفاظ سے مختلف ہیں جو ہزاروں صحابہؓ پڑھتے تھے۔

یہ بھی یاد رہے کہ نبی کریم ﷺ نے صرف ایک کتاب مسمی قرآن مسلمانوں کے ہاتھ میں نہیں دے دی تھی کہ وہ جیسے چاہیں اسے پڑھتے رہیں، بلکہ نبی ﷺ نے قرآن مجید کی باقاعدہ تعلیم دی تھی۔ پھر کیا نبی ﷺ نے کسی کو کچھ اور کسی کو کچھ پڑھایا تھا۔ جس قرآن کی تعلیمِ عام آپ ﷺ نے دی تھی جو ہزاروں نے آپ ﷺ سے حاصل کی تھی اور جو تواتر کے ساتھ منقول ہے، کیا ابن

مسعودؓ (یا دو تین مزید صحابہؓ کو جن کی طرف اس قسم کی قرأتیں منسوب کی جاتی ہیں) کو اس کے خلاف تعلیم دی تھی؟ کوئی عقل سلیم اسے باور نہیں کرسکتی کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تعلیم کتاب میں یہ تفریق فرمائی ہو۔

اسی طرح عقل اسے بھی باور نہیں کرسکتی کہ یہ حضرات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تعلیم حاصل کرنے کے باوجود عمر بھر غلطی میں مبتلا رہے۔ حالانکہ ان کے ساتھ لوگ ہزاروں قرآن مجید پڑھتے اور سنتے رہتے تھے مگر انھوں نے ان کی قرأت سن کر بھی اپنی غلطی کی اصلاح نہ کی اور ان میں سے بھی کسی نے انھیں ان کی غلطی پر نہیں ٹوکا۔ حاصل بحث یہ ہے کہ یہ اختلافِ قرأت کی روایتیں جو اخبار آحاد ہیں اور ان میں بھی ضعاف بلکہ درحقیقت موضوع، جعلی، دشمنانِ قرآن کی وضع کی ہوئی ہیں ان سے قرآن کریم کی جو قرأتیں معلوم ہوتی ہیں، ان کا لکھنا اور پڑھنا اور انھیں قرآن مجید کی قراءت سمجھنا، نیز ان نام نہاد قرأتوں کو ان صحابہ کرامؓ کی طرف منسوب کرنا قطعاً حرام اور ممنوع ہے۔ اگر ایسی قرأتوں کو لکھنے اور پڑھنے سے حجاج مرحوم نے منع کردیا تھا تو کیا برا کیا۔ اس پر اعتراض کرنا اس بات کی واضح علامت ہے کہ معترض کے دل میں قرآن مجید کی وہ عظمت اور وقعت نہیں ہے جو ایک مومن کے دل میں ہونا چاہیے۔ تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ حجاج مرحوم حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے ساتھ بہت عقیدت و محبت رکھتے تھے۔

امیر المومنین عبدالملکؒ نے بھی انھیں حضرت موصوف کی اطاعت کا حکم دیا تھا۔ حجاج مرحوم ہمیشہ اس پر عامل رہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ انھوں نے آں محترم کو قتل کی دھمکی دی، کسی طرح قابل یقین نہیں۔ اسی طرح حضرت انسؓ اور سہل بن سعد ساعدیؓ کو گالیاں دینے، ان کی گردن پر مہریں لگوانے کی کہانی اور اسی قسم کے دوسرے قصے شیعوں اور شیعہ نوازوں کے گھڑے ہوئے ہیں اور سبائی کارخانہ دروغ بافی کے تیار کیے ہوئے جھوٹے افسانے ہیں۔ یہ تاریخی خبریں نہیں ہیں بلکہ سبائی

پروپیگنڈہ اور تشہیر ہے جو شیعہ مؤرخین طبری، ابن اسحٰق وغیرہ نے بہت شوق سے اپنی کتابوں میں اکٹھا کرلیا۔ پھر کچھ جھوٹ اور دروغ اپنی طرف سے اس میں ملا کر پروپیگنڈے کا ذہنی زہر تیار کیا۔ اس قسم کی سب روایات میں کوئی نہ کوئی شیعہ راوی ضرور ملے گا۔ کبھی بغیر تقیہ اور کبھی نقابِ تقیہ ڈالے ہوئے۔ اکثر و بیشتر تو یہ روایتیں مشہور کذاب و مفتری ابو مخنف کی پھیلائی ہوئی ہیں۔ سنی مؤرخین مثل ابن کثیرؒ و ابن اثیرؒ تاریخ لکھنے بیٹھے تو انھوں نے ''نقل راچہ عقل'' پر عمل کیا۔

بنو امیہ اور بنو عباس دونوں کے خلاف اس قسم کی غلط روایتیں مشہور کرکے اور معاندانہ جھوٹا پروپیگنڈہ کرکے شیعوں نے عوام اہلسنت کو بھی ان سب کے خلاف سخت بدگمان کردیا تھا۔ عوام کے گمان و اعتقاد کے خلاف زبان کشائی بڑی ہمت کا کام ہے۔ ایسے علماء تو بہت سے ملتے ہیں جنھوں نے حکومت کے خلاف جرأت کے ساتھ بات کہی ہو لیکن ایسے علماء کی تعداد اقل قلیل ہے جنھوں نے عوام کے رجحانات کے خلاف زبان کھولی ہو۔ ہم نے اچھے اچھے علماء کبار کو دیکھا کہ ''خوفِ فتنہ'' کی آڑ لے کر عوام کی ہاں میں ہاں ملانے لگتے ہیں۔ شیعوں نے پیہم پروپیگنڈے سے عوام کے ذہن کو مسموم کردیا تھا۔ اس لیے وہ علماء و مؤرخین جنھوں نے بنو امیہ و بنو عباس کی خلافتوں پر اعتراضات کیے ہیں اور شیعوں کی طرح ان پر ''تبرّا'' بھیجا ہے، ان میں بہت سے ایسے تھے جنھوں نے جان بوجھ کر جھوٹ بولا ہے تاکہ عوام ان کے مخالف نہ ہوجائیں۔ ان علماء کی آراء اور اس موضوع پر ان کی روایتوں کا کوئی اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ ہم انھیں درایت کی کسوٹی پر ہی پرکھ کر قبول یا ردّ کرسکتے ہیں۔ ان کے لیے قرائن کی شہادت لازم ہے۔ تاریخِ اسلام کی خوبی یہ ہے کہ زیرِ بحث قسم کی جتنی روایتیں اور کہانیاں تاریخ میں ملتی ہیں، ان میں ایک بھی درایت کی کسوٹی پر پوری نہیں اترتی اور قرائن کی شہادت ہمیشہ اس کے خلاف ہوتی ہے۔ جس سے یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ یہ کہانی کسی شیعی کارخانہ دروغ بافی کی مصنوعہ اور کسی شیعہ یا شیعہ

نواز کی گھڑی ہوئی ہے۔ اور اس سے کذب آفرینی، افتراء پردازی، بہتان طرازی کا سبائی آرٹ خوب نمایاں ہوجاتا ہے۔ اس کے متعدد نمونے ہم اپنی کتاب ''اظہارِ حقیقت'' میں پیش کر چکے ہیں۔ فاضل قاری ان مثالوں اور نمونوں کو دیکھنے اور سمجھنے کے بعد سبائیوں اور شیعیت نوازوں کے باقی اعتراضات کی غلطی اور لغویت بھی انھیں مثالوں پر قیاس کر کے معلوم کر سکتے ہیں۔

خادمِ قرآن کریم حجاج بن یوسف مرحوم و مغفور کے دو احسانات پوری امت پر ایسے ہیں جن کے بار سے سبکدوش ہونا، اس کے لیے ممکن نہیں۔ ان میں ایک قرآن کریم پر اعراب لگوا کر اس کی حفاظت اور اس کی اشاعت کرنا ہے، دوسرا سرزمینِ ہند تک اسلام پہنچانا ہے۔ یہ ان کے ایسے عظیم احساناتِ عظیمہ ہیں جن کا اعتراف کرنے پر ان کے مخالفین بھی مجبور ہیں۔ چنانچہ مودودی صاحب نے بھی اپنی زیرِ نظر کتاب کے صفحہ ۱۸۵ پر بادل نخواستہ اس کا اعتراف کیا ہے۔ لیکن ان کی یہی خوبی دشمنانِ قرآن اور دشمنانِ اسلام کے نزدیک بہت بڑا عیب تھا۔ اس لیے وہ حجاج مرحوم کے سخت دشمن ہو گئے اور انھیں غلط اور لغو اعتراضات کا نشانہ بنایا۔

معرکۂ ابن زبیرؓ اور امیر حجاج بن یوسف ثقفیؒ:

ایک اعتراض جس کی ابتداء تو سنی نما شیعوں ہی کی طرف سے ہوئی، شیعوں نے اپنے مطلب کے لیے اسے اچھالا اور بہت سے سُنّی بھی اس سے متاثر ہوگئے، ان کا حضرت عبداللہ بن زبیرؓ پر حملہ کرنا تھا۔ شرعی نقطہ نظر سے یہ اعتراض ہی غلط ہے۔ حجاج مرحوم امیر المومنین عبدالملک بن مروانؒ کی طرف سے گورنر تھے اور انھیں خلیفۃ المسلمین تسلیم کرتے تھے اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو باغی جانتے تھے۔ قرآن مجید میں صاف صاف باغی سے جنگ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ واقع کے اعتبار سے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ باغی تھے یا نہیں؟ یہ الگ مسئلہ ہے۔ لیکن حجاجؒ انھیں

باغی ہی سمجھتے تھے اور انھیں باغی ہی سمجھ کر ان سے جنگ کی۔ اس لیے شرعاً ان کے اوپر کوئی الزام نہیں ہے۔ اس اعتراض کے ساتھ جو حاشیہ آرائی کی گئی ہے مثلاً سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ کی لاش کی تدفین سے مانع ہونا اور اس کا بے گور و کفن کئی دن پڑا رہنا یا سیدہ اسماء بنت ابی بکرؓ کی شان میں بدزبانی یا خانہ کعبہ پر پتھر برسانا وغیرہ،(۱) یہ شیعوں اور شیعیت نواز مخالف بنی امیہ سنی مؤرخین اور راویوں کے گھڑے ہوئے طبع زاد جھوٹے افسانے ہیں، جن کا کوئی قابل اطمینان ثبوت نہیں ، بلکہ درایت اور قرائن ان کی تردید کرتے ہیں۔

مودودی صاحب نے اگر زیرِ بحث مسئلہ پر علامہ شبلی نعمانی کی کتاب ''النقد علی تاریخ التمدن الاسلامی'' کا مطالعہ کر لیا ہوتا تو شائد وہ شیعوں اور یہود و مستشرقین کے ان اعتراضات کا تذکرہ کرنے کی جسارت نہ کرتے۔ اگر انھوں نے کتاب مذکور دیکھی ہے تو ان کا اِن غلط الزاموں کو دہرانا بہت ہی تعجب خیز اور افسوسناک ہے۔ یہ الزام غلط ہیں اور ان کا کوئی اطمینان بخش ثبوت قیامت تک نہیں پیش کیا جاسکتا۔ آئندہ سطور میں ان پر تفصیلی بحث اور ان اعتراضات کا اطمینان بخش جواب ملاحظہ ہو:

۱۔ مودودی صاحب حجاجؒ کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''اس ظالم نے عین حج کے زمانہ میں مکہ معظّمہ پر چڑھائی کی جبکہ زمانہ جاہلیت میں کفار و مشرکین بھی جنگ سے ہاتھ روک لیتے تھے۔''(۲)

تبصرہ: مودودی صاحب نے یہ جملے لکھ کر قاری کو مغالطہ دینے کی مذموم کوشش کی ہے۔ کتبِ تاریخ متفق ہیں کہ حج کے زمانے میں حجاج کی طرف سے

۱۔ ہمیں یہاں مؤلف مذکور سے اختلاف ہے۔ سیدہ اسماء بنت ابی بکرؓ والی روایت صحیح ہے اور صحیح مسلم میں موجود ہے، تاہم اس روایت کو اس کے درست سیاق و سباق میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس روایت پر مفصل کلام ہم پیچھے اپنی گزارشات میں ہدیۂ قارئین کر چکے ہیں۔

۲۔ خلافت و ملوکیت، صفحہ ۱۸۵۔

کوئی جنگ نہیں کی گئی۔ یکم ذی الحجہ سے محاصرہ کرلیا گیا تھا، جنگ نہیں کی گئی ، پورے اشہرِ حرم میں کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ جنگ محاصرہ شروع ہونے سے پانچ ماہ بعد جمادی الاولیٰ میں ہوئی۔ بلکہ بنظر غائر دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ کوئی جنگ ہوئی ہی نہیں۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

''واقدی کا بیان ہے کہ مجھ سے مصعب بن نائب نے بروایت نافع مولیٰ اسد (وہ ابن زبیرؓ سے خوب واقف تھے) بیان کیا کہ سیدنا ابن زبیرؓ کا محاصرہ ذی الحجہ ۷۲ ہجری کی چاند رات سے شروع ہوا۔ اس کا مطلب ہے کہ حجاج نے یہ محاصرہ پانچ ماہ اور سترہ راتوں تک جاری رکھا۔''[1]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حج کے زمانے میں محاصرہ جاری رہا۔ کوئی جنگ نہیں ہوئی، جنگ کرنے کا الزام معترض نے اپنی طرف سے تراشا جو بالکل غلط ہے۔ حافظ صاحب اس عبارت میں پانچ ماہ کے محاصرے کا تذکرہ کرتے ہیں، جنگ کا کوئی تذکرہ نہیں کرتے۔

جناب حسن بصریؒ کے حوالے سے موصوف لکھتے ہیں:

''تیسرا واقعہ وہی ہے جس کا حضرت حسن بصریؒ نے آخر میں ذکر کیا ہے۔ مدینہ سے فارغ ہونے کے بعد وہی فوج جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حرم میں یہ اودھم مچایا تھا، سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ سے لڑنے کے لیے مکہ پر حملہ آور ہوئی اور اس نے منجنیق لگا کر خانہ کعبہ پر سنگ باری کی جس سے کعبہ کی اک دیوار شکستہ ہوگئی۔ اگرچہ روایات میں یہ بھی ہے انھوں نے کعبہ پر آگ برسائی تھی۔ لیکن آگ لگنے کے کچھ دوسرے وجوہ بھی بیان کیے جاتے ہیں، البتہ سنگ باری کا واقعہ متفق علیہ ہے۔''

ا۔ البدایہ والنہایہ، جلد ۸، صفحہ ۳۲۹۔

تبصرہ: حضرت حسن بصریؒ کی طرف اس سراپا کذب و دروغ بیان کی نسبت بالکل غلط ہے۔ یہ جس طرح حجاج مرحومؒ اور ان کے لشکر پر بہتان و افتراء ہے اسی طرح حضرت حسن بصریؒ پر بھی بہتان و افتراء ہے۔ شیعہ اور شیعہ نواز کذاب راویوں نے یہ جھوٹ گھڑا، واقعیت سے اسے ادنیٰ تعلق بھی نہیں۔ غلافِ کعبہ شریف میں آگ لگنے کے متعلق مقبول اور معروف روایت یہ ہے کہ سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ کے ساتھ والوں میں سے کسی نے موصوف کی اجازت سے کسی ضرورت سے حرم شریف میں آگ جلائی تھی، اس کی کوئی چنگاری اڑ کر غلافِ کعبہ پر پڑ گئی جس سے اس میں آگ لگ گئی جو فوراً بجھادی گئی۔ اس میں حجاج یا ان کے لشکر کا کیا قصور تھا؟ یہ ایک اتفاقی واقعہ تھا جس کی ذمہ واری کسی شخص پر بھی نہیں ڈالی جاسکتی۔ شیعہ راویوں اور مؤرخوں نے اس معمولی سی خبر کو اپنے قلب کی سیاہی میں رنگ کر پیش کیا۔ یہ گفتگو بھی اس صورت میں ہے جب آگ لگنے کا واقعہ بھی ثابت ہو۔ حق یہ ہے کہ اگر اصولِ روایت و درایت کی کسوٹی پر پرکھا جائے تو نفس آگ لگنا ہی ثابت نہیں اور آگ لگنے کا قصہ ہی سرے سے سبائیوں کا تصنیف کیا ہوا جھوٹا افسانہ معلوم ہوتا ہے۔ ''کعبہ پر آگ برسانے'' کا الزام تو سراسر بہتان و افتراء اور بے بنیاد جھوٹ ہے۔ سبائی راویوں اور مؤرخین کے پروپیگنڈے کے سوا اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ بلکہ اس کے غلط اور جھوٹے ہونے پر دلائل قائم ہیں۔ ملاحظہ ہوں:

اولاً:۔ معترضین کہتے ہیں کہ جبل ابی قبیس پر منجنیق نصب کرکے آتش باری کی گئی۔ آپ خود حج یا عمرے کے لیے جاچکے ہوں تو فبھا ورنہ کسی پڑھے لکھے سمجھدار حاجی سے پوچھئے کہ جبل ابی قبیس کا فاصلہ مسجد حرام سے کتنا ہے؟ اور پھر اندازہ کرلیجئے کہ کیا اتنے فاصلے سے مسجد شریف کے اندر کوئی شعلہ آتش پہنچایا جاسکتا ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ اتنی دور سے شعلہ نشانہ مذکور تک پھینکنا عادتاً غیر ممکن ہے۔ اس لیے آگ پھینکنے کی روایت سراپا کذب و دروغ ہے، جو بغض صحابہؓ و بغض

بنی امیہ سے مغلوب شیعہ اور شیعیت نوازوں نے وضع کی ہے۔

ثانیاً:۔ چند سطور کے بعد ہم اس خلفشار کے دوران مکہ معظّمہ کے حالات البدایہ و النہایہ سے ان شاءاللہ نقل کریں گے۔ ان پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حجاجؒ کی فوجیں مسجد الحرام کے دروازوں کے قریب تک پہنچ چکی تھیں۔ سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ انھیں منتشر کردیتے تھے وہ پھر جمع ہوجاتی تھیں۔ اگر آگ مسجد الحرام کے اندر پہنچ سکتی تھی تو ان کے اوپر بھی گر سکتی تھی اور ان کے جسم و لباس میں بھی آگ لگ سکتی تھی۔ تو کیا حجاجؒ اپنی ہی فوجوں کو جلانا چاہتے تھے؟ اس سے عیاں ہے کہ کعبہ پر آگ پھینکنے کی روایت بالکل غلط اور سراپا کذب و افتراء ہے۔ اس سراپا کذب روایت کو مختلف فیہ کہنا بڑی افسوسناک جسارت ہے۔ اس کے غلط ہونے پر ان سب اہلسنت کا اتفاق ہے جو شیعیت سے متاثر نہیں ہیں اور جن کے دل اہل ایمان کے ساتھ بغض، عداوت اور حسد رکھنے کی ظلمت سے پاک ہیں۔ اس روایت کو سامنے رکھنے سے کعبہ شریف پر منجنیق سے پتھر پھینکنے کی من گھڑت روایت کا غلط اور مکذوبہ ہونا بھی واضح ہوجاتا ہے۔ حجاجؒ کے لشکر کے آدمی مسجد الحرام کے دروازوں کے قریب تک آئے تھے تو کیا ان کی منجنیقیں خود اپنے لشکر والوں پر پتھر پھینکتی تھیں؟ اگر منجنیق سے کعبہ شریف پر پتھر پھینکے جاتے تو کیا اس کا خطرہ نہیں تھا کہ وہ مسجد شریف سے باہر گریں اور خود حجاجؒ کے لشکر والوں ہی کے لیے جان لیوا ثابت ہوں؟ علاوہ بریں بیت اللہ کا طواف کسی وقت بھی موقوف نہیں ہوتا، کچھ نہ کچھ لوگ ہر وقت طواف میں مشغول رہتے ہیں۔ یہ واقعہ مشہور و معروف اور سینکڑوں کے مشاہدوں سے ثابت اور عام طور پر اہل اسلام میں تسلیم شدہ ہے کہ فتح مکہ کے بعد سے کسی وقت بھی مطاف خالی نہیں رہتا اور کچھ نہ کچھ لوگ طواف میں مشغول رہتے ہیں۔ اس سے صرف وہ وقت مستثنیٰ ہے جس میں کوئی فرض نماز ادا کی جاتی ہو۔ اگر کعبہ شریف سے منجنیق پر پتھر پھینکے جائیں تو طواف کرنے والوں کے زخمی ہونے یا مرنے کا قوی

اندیشہ ہوتا ہے۔ طواف پر کسی طرف سے بھی کوئی پابندی نہ تھی۔ طواف کرنے والوں میں حجاجؒ کے لشکر والے بھی ہوتے تھے۔ اس سال خود حجاجؒ امیر الحجاج تھے۔ حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں:

فلما دخل ذو الحجة حج الناس الحجاج فی هذه السنة یعنی ذوالحجہ کا مہینہ شروع ہوا تو حجاج نے اس سال لوگوں کو حج کرایا۔(۱)

گذر چکا ہے کہ عبدالملک بن مروانؒ نے حجاجؒ کو حکم دیا تھا کہ وہ مناسکِ حج کے مسائل میں سیدنا عبداللہ بن عمرؓ کے احکام پر عمل کریں۔ اگر بقول شیعہ و شیعہ نواز مؤرخین کعبہ شریف پر دوران حج سنگ باری ہوتی رہتی تو حجاج اور ان کے ساتھیوں نے طواف کیسے کیا؟ دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کعبہ شریف پر اور مسجد الحرام کے اندر سنگ باری کو سیدنا عبداللہ بن عمرؓ نے کیسے گوارہ کیا؟ کیا یہ الحاد فی الحرم نہیں ہے؟ اور کیا تعظیم شعائر اللہ مناسک کے حدود سے بالکل خارج اور ان سے کلیۃً بے تعلق ہے؟ اگر نہیں تو یہ بات بالکل ناقابل فہم ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عمرؓ نے اس پر کوئی نکیر نہیں فرمائی۔ اگر نکیر کی ہوتی تو شہرت کے ساتھ منقول ہوتی، لیکن اس قسم کی کوئی چیز ہمیں نہیں ملتی۔ اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ کعبہ شریف پر سنگ باری کی روایت بالکل جھوٹی، موضوع اور سبائیت نوازوں کی گھڑی ہوئی ہے اور حجاجؒ مرحوم اور ان کے لشکر والوں پر روافض کا افتراء و بہتان ہے۔

عبدالملک بن مروانؒ اور سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ کے درمیان تصادم کی ابتداء جمادی الاولیٰ ۷۲ھ میں ہوئی تھی اور جمادی الاولیٰ ۷۳ھ میں سیدنا ابن زبیرؓ کی شہادت پر اس کا خاتمہ ہوگیا۔ گویا اس کی ابتداء اور انتہا کے درمیان ایک سال کا فاصلہ ہے۔ اس ایک سال کے واقعات متعلقہ کی کیفیت حافظ ابن کثیرؒ نے البدایہ والنہایہ میں لکھی ہے۔ وہ مختصراً درج ذیل ہیں۔ ۷۲ھ کے احوال کے بیان میں انھوں نے لکھا ہے کہ:

۱۔ البدایہ والنہایہ، جلد ۸، صفحہ ۳۲۵، احوال ۷۲ھ۔

امیر المومنین عبدالملک بن مروانؒ نے حجاج کو سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ کے مقابلے کے لیے روانہ کیا۔

فبعثه فی جیش کثیف من اھل الشام و کتب معه امانا لا ھل ملة ان ھم اطاعوه یعنی انھیں (حجاجؒ) اہل شام کا ایک بڑا لشکر دے کر روانہ کیا اور اہل مکہ کے لیے امان نامہ بشرط اطاعت لکھ کر انھیں دے دیا۔(۱)

پھر لکھتے ہیں کہ حجاجؒ دو ہزار شامیوں کا لشکر لے کر گئے اور طائف کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا:

''حجاج نے طائف میں قیام کرکے عرفہ کی طرف لشکر بھیجنا شروع کیے۔ ادھر سے ابن زبیرؓ اپنے سواروں کو بھیجتے تھے۔ سیدنا ابن زبیرؓ کے سواروں کو شکست ہوجاتی تھی اور حجاج کے سوار غالب رہتے تھے۔'' (۲)

ان مقابلوں میں سے کسی بھی معرکہ کا حرم شریف کے اندر ہونا کہیں سے بھی نہیں ثابت ہے۔ ذوالحجہ سے پہلے ہی یہ جنگ بند ہوگئی اور محاصرہ کی ابتداء ہوئی۔ حافظ صاحب لکھتے ہیں:

ثم کتب الحجاج الی عبدالملك یستاذنه فی دخول الحرم و محاصرة ابن الزبیر رضی اللہ عنہ یعنی پھر حجاجؒ نے عبدالملک کو لکھا کہ انھیں حرم میں داخل ہونے اور ابن زبیرؓ کا محاصرہ کرنے کی اجازت دی جائے۔

واقدی کی روایت بحوالہ ابن کثیرؒ اوپر نقل ہوچکی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے

۱۔ البدایہ والنہایہ، جلد ۸، صفحہ ۳۲۵۔

۲۔ ایضاً۔

کہ محاصرہ ذی الحجہ کی چاند رات سے شروع ہوا۔ اس سال حج کے حالات میں لکھتے ہیں:

> ''ذوالحجہ کا مہینہ آیا تو اس سال لوگوں کو حجاج نے حج کرایا اور حجاج اور ان کے ساتھیوں نے جب عرفہ میں وقوف کیا تو مسلح رہے۔ اسی طرح عرفات کے بعد والے مشاعر میں بھی یہ سب مسلح رہے اور ابن زبیرؓ محصور رہے، وہ اس سال حج نہ کر سکے مگر یوم النحر میں اونٹوں کی قربانی کی اور اسی طرح ان کے بہت سے ساتھی بھی حج نہ کر سکے۔ (۱)

ملحوظ رہے کہ سیدنا ابن زبیرؓ اور ان کے ساتھیوں پر جن کا تذکرہ اس روایت میں ہے، حج فرض نہ تھا۔ اپنا حج فرض یہ بہت پہلے ادا کر چکے تھے، بلکہ اس کے بعد بکثرت نفل حج کر چکے تھے۔ اس لیے ان لوگوں نے اس سال حج نہیں کیا۔ حجاج کی طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں تھی اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اسی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے رفقاء میں کثیر تعداد نے حج نہیں کیا، جس کا مطلب ہے کہ بعض نے حج کیا۔ اگر حجاجؒ کی طرف سے کوئی امر مانع ہوتا تو ابن زبیرؓ کے بعض رفقاء کیسے حج کرتے؟ علاوہ بریں حضرت موصوفؓ قربانی کیسے کرتے؟ حج کرنے والے حجاج کے لشکر کے لوگ اور دوسرے باہر کے لوگ تھے جو اس معاملے میں بالکل غیر جانبدار تھے۔ امیر الحجاج خود حجاجؒ بن یوسف تھے جو لشکر کے سپہ سالار بھی تھے اور وہ مناسک کے بارے میں سیدنا عبداللہ بن عمرؓ کے تابع فرمان تھے۔ سوال یہ ہے کہ لشکر حجاجؒ کے لوگ تو حج ، طواف، سعی وغیرہ میں مشغول تھے، تو پھر اس موقع پر سنگ باری کون کر رہا تھا؟ مخالفین کہتے ہیں کہ پہاڑ پر منجنیق نصب تھی جس سے سنگ باری کی گئی، مگر وہ سنگ باری کس نے کی؟ کیا اس وقت کوئی آٹو میٹک منجنیق ایجاد کر لی گئی تھی؟ جسے کمپیوٹر سے کنٹرول کیا جاتا تھا؟ اگر ہم یہ بھی تسلیم کر لیں تو دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مطاف، مسجد الحرام، مسعی (صفا و مروہ کے درمیان) وغیرہ

۱۔ البدایہ و النہایہ، جلد ۸ ،صفحہ ۳۲۵۔

مقامات متبرکہ میں تو حجاج کا لشکر پھیلا ہوا تھا اور خود حجاجؒ بھی موجود تھے۔ سیدنا عبداللہ بن عمرؓ بھی انھیں کے ساتھ تھے، پھر یہ سنگ باری کیا یہ لوگ اپنے ہی اوپر کررہے تھے؟ اور کیا حجاجؒ نے اپنا اور اپنے لشکر والوں نیز غیر جانبدار لوگوں کا سر پھوڑنے کا حکم دیا تھا؟ سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ اور ان کے رفقاء تو وہاں موجود ہی نہیں تھے، پھر یہ سنگ باری کس پر ہورہی تھی؟ عداوتِ بنی امیہ کے جوش میں راوی کذاب کے ہوش گم ہوگئے اور اسے یہ احساس نہ ہوا کہ وہ بہکی بہکی باتیں کرنے لگا ہے۔

تیسرا سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عمرؓ نے اس الحاد فی الحرم کو کسی طرح گوارا کرکیا ؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اسے دیکھتے اور کوئی نکیر نہ کرتے۔

ان واضح امور پر نظر کرنے سے یہ حقیقت روشن ہوجاتی ہے کہ کعبہ شریف پر آتش باری کی کہانی کی طرح اس پر سنگ باری کرنے کی کہانی بھی بالکل غلط اور سرتاپا جھوٹ ہے۔ جس طرح ان کہانیوں کے تراشنے اور گھڑنے والے گناہ کبیرہ کے مرتکب ہوئے، اسی طرح (ان کو بلا تحقیق) نقل کرنے والے بھی کاذب و مفتری اور گناہ کبیرہ کے مرتکب ٹھہرتے ہیں۔ اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی واضح ہوگئی کہ حرم کعبہ مکرم کے اندر کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ یہ کہنا کہ ''مکہ معظّمہ'' پر حجاجؒ نے حملہ کیا، قطعاً غلط ہے۔ ان پر اور ان کے لشکر پر یہ الزام قطعاً بہتان و افتراء ہے۔ طبری نے اپنے تشیع کی وجہ سے سبائیوں کی مشہور کی ہوئی یہ جھوٹی افواہ اپنی کتاب میں درج کرلی۔ ابن اثیرؒ خبر و روایت کے بارے میں غیر محتاط ہیں، حدیث میں بھی وہ احتیاط نہیں کرتے چہ جائیکہ تاریخ میں انھوں نے بغیر سوچے سمجھے طبری سے من گھڑت کہانیاں نقل کردیں اور دل میں ''دروغ بر گردن راوی'' کہہ کر مطمئن ہوگئے۔ ''نقل راچہ عقل'' پر عمل ایک مؤرخ کے لیے بہت بڑا نقص ہے۔ وہ شیعہ تو نہیں ہیں لیکن ان کی تالیفات دیکھ کر ''سُنّی ذہن'' رکھنے والا قاری ان کے اس نقص سے بھی انکار نہیں کرسکتا کہ ان کے ذہن پر شیعیت کا خفیف سا اثر موجود ہے۔ بنو

امیہ کے ساتھ ان کا عناد اور ان کے دل میں صحابہ کرامؓ کی قدروعظمت کی کمی، ایسی چیزیں ہیں جو ان کی تحریروں سے ظاہر ہوتی ہیں۔ ان کی یہ کمزوری اس درجہ کی تو نہیں ہے کہ انھیں شیعہ کہا جا سکے۔ اس سے کم درجہ کی ہیں اسی لیے ہم انھیں شیعہ نہیں کہتے مگر یہ زیر بحث قسم کے حوادث و اخبار کے بارے میں ان کی تاریخ پر بے اعتمادی پیدا کرنے کے لیے کافی ہیں۔

حصار پر کچھ مدت گزری تو سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ کے رفقاء ان کا ساتھ چھوڑنے لگے۔ حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں:

> ''اہل مکہ برابر سیدنا ابن زبیرؓ کا ساتھ چھوڑ کر حجاج کے پاس ان سے امان لے کر پہنچتے رہے۔ یہاں تک تقریباً دس ہزار آدمی نکل گئے اور ان سب کو (حجاج نے) امان دے دی۔ اور سیدنا ابن زبیرؓ کے ساتھ بہت کم لوگ رہ گئے۔ یہاں تک کہ سیدنا ابن زبیرؓ کے دو بیٹے حمزہ اور خبیب بھی حجاج کے پاس پہنچ گئے اور ان دونوں نے اپنے لیے امان حاصل کرلی اور حجاج نے انھیں امان دے دی۔'' (۱)

محاصرہ تنگ ہوگیا۔ یہاں تک کہ سیدنا ابن زبیرؓ کو مسجد الحرام میں محصور کرلیا گیا۔ حافظ ابن کثیرؒ اس وقت کی کیفیت لکھتے ہیں:

> ''ان لوگوں نے بیان کیا ہے کہ وہ (ابن زبیرؓ) مسجد الحرام کے دروازے سے نکلتے تھے اور دروازے پر پانچ سو سوار اور پیادے جمع ہوتے تھے، وہ ان پر حملہ کرتے تھے تو وہ دائیں بائیں منتشر ہوجاتے۔ ان کے مقابلے میں کوئی نہیں ٹھہرتا تھا۔۔۔
>
> سیدنا ابن زبیرؓ جس دروازے کے محافظوں کے مقابلے میں بھی نکلتے تھے، ان کے مجمع کو پراگندہ کردیتے تھے، اور انھیں بھگا دیتے تھے

۱۔ البدایہ والنہایہ، جلد ۸، صفحہ ۳۳۱۔

حالانکہ وہ (ابن زبیرؓ) زرہ بھی نہیں پہنے ہوتے تھے۔"(۱)

اس خبر سے یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ حجاجؒ کی فوج کے لوگ جو محاصرہ کیے ہوئے تھے حرم میں خون نہیں بہانا چاہتے تھے اور سیدنا ابن زبیرؓ کے قتل کرنے یا انھیں زخمی کرنے کا ارادہ نہ رکھتے تھے۔ ورنہ پانچ سو آدمیوں کا ایک شخص کے سامنے سے ڈر کر بھاگ جانا بالکل بعید از عقل و قیاس ہے خصوصاً جب ان میں سوار بھی ہوں۔ اگر ان کی نیت قتل و خونریزی کی ہوتی تو وہ انھیں آسانی کے ساتھ قتل کرسکتے تھے خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ ان کے ساتھی، یہاں تک کہ ان کے بیٹے بھی ان کا ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ علی ہذا روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا ابن زبیرؓ بھی کسی کو قتل یا مجروح نہیں کرنا چاہتے تھے ورنہ کم از کم ایک دو کو تو وہ قتل یا مجروح کر ہی سکتے تھے۔ خصوصاً جبکہ بظاہر مخالفین کے یہ سپاہی ان سے مرعوب بھی تھے اور اسلحہ کے استعمال سے گریز کررہے تھے۔ سیدنا ابن زبیرؓ کا یہ رویہ بھی احترامِ حرم کی وجہ سے تھا۔ وہ اپنے مخالفین کی طرح خود بھی حرم شریف میں کسی کو قتل یا زخمی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ محض خالی ہاتھ دفاع کرنا چاہتے تھے یعنی مخالفین کو دھکے دے کر دروازہ پر سے ہٹانا چاہتے تھے۔ مگر حجاجؒ کے لشکروالوں نے اس کی بھی نوبت نہ آنے دی۔ وہ سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ کے قریب ہی نہ آتے تھے بلکہ پہلے ہی بھاگ جاتے تھے۔ اسی سلسلہ کی ایک روایت میں آتا ہے کہ

ولقد کان حجر المنجنیق یقع علی طرف ثوبہ فلا ینزعج بذالك

یعنی منجنیق کے پتھر آں محترم کے دامن پر لگتے تھے مگر اس سے آں محترم کو کوئی ہچکچاہٹ نہیں پیدا ہوتی تھی۔

یہ روایت قوسین کے درمیان لکھ کر حاشیہ پر ناشر نے لکھا ہے کہ یہ البدایہ و النہایہ کے مصری نسخہ میں موجود نہیں ہے۔ تاہم اگر اس روایت کو ثابت تسلیم کرلیا

۱۔ البدایہ والنہایہ، جلد ۸، صفحہ ۳۳۱۔

جائے تو یہ بھی اس امر کی دلیل ہے کہ حجاجؒ کے لشکر والے سیدنا ابن زبیرؓ کو قتل یا زخمی کرنا نہیں چاہتے تھے، ورنہ تاک کر پتھر پھینکنا کوئی مشکل بات نہ تھی۔ اس کی کیا وجہ ہے کہ پتھر ان کے دامن پر لگتا تھا مگر ان کے جسم کو چھوتا بھی نہیں تھا؟ اگر انھیں قتل یا مجروح کرنا مقصود ہوتا تو منجنیق کے بجائے، ہاتھوں سے پتھر مارے جاسکتے تھے۔ تیر سے بھی کام لیا جاسکتا تھا۔ پانچ سو میں سے سو دو سو آدمی بھی سنگ باری کرتے تو آں محترم کا ان سے محفوظ رہنا غیر ممکن تھا۔ خصوصاً جبکہ موصوف کے جسم پر زرہ بھی نہیں تھی۔ اس سے روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ فریقین میں سے کوئی بھی حرم محترم میں خونریزی اور جنگ نہیں کرنا چاہتا تھا اور حرم میں درحقیقت کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ یہ پتھر پھینکنا ایسا ہی تھا جیسے آج کل مجمع کو منتشر کرنے کے لیے ہوائی فائر کیے جاتے ہیں۔ حجاج کے لشکر والے یہ چاہتے تھے کہ سیدنا ابن زبیرؓ حرم میں محصور رہیں اور ہم پر حملہ نہ کرسکیں اور نہ کسی دوسری جگہ جاسکیں۔

سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ کی شہادت:

سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ نے ۱۷ جمادی الاول ۷۳ ھ کو جام شہادت نوش فرمایا۔ پوری رات نمازیں پڑھتے رہے، صبح کے قریب ذرا سی جھپکی لی۔ بیدار ہوکر اول وقت فجر کی نماز طول قنوت کے ساتھ ادا کی۔ اپنے رفقاء کا جائزہ لیا۔ اس کے بعد محاصرہ کرنے والوں پر اپنے رفقاء کو ساتھ لےکر حملہ آور ہوئے، فوج مخالف تتر بتر ہوگئی اور آں محترم اپنے رفقاء کے ساتھ ان کا پیچھا کرتے ہوئے مقام الحجون تک پہنچ گئے۔ وہاں ایک اینٹ آکر چہرے مبارک پر لگی، جس سے خون بہنے لگا۔ اس پر آں محترم نے ایک رجزیہ شعر پڑھا، اس کے بعد گر گئے۔ ان واقعات کے تذکرے کے بعد حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں:

ثم سقط الی الارض فاسرعوا الیہ فقتلوہ یعنی پھر آں محترم

> زمین پر گر گئے (یہ دیکھ کر) وہ لوگ (لشکر حجاج کے لوگ) جلدی
> سے دوڑے اور انھیں قتل کردیا۔(۱)

پھر ایک صفحہ کے بعد صفحہ ۳۳۲ پر آں محترم کے سر کاٹنے اور دمشق بھیجنے، جسم سولی پر لٹکانے کی غلط ، موضوع اور جعلی روایتیں بھی نقل کی ہیں۔ شیعوں کی گھڑی ہوئی ان سب روایتوں کا غلط اور بہتان خالص ہونا ان شاءاللہ مندرجہ ذیل سطروں سے واضح ہوجائے گا۔

اس روایت میں اتنی بات تو صحیح معلوم ہوتی ہے کہ چہرے پر اینٹ لگنے سے حضرت موصوفؓ زمین پر گر پڑے لیکن یہ بات کہ ''لشکرِ مخالف کے لوگ دوڑ پڑے اور انھیں قتل کردیا'' بوجوہ غلط معلوم ہوتی ہے۔ قرین قیاس یہی ہے کہ اسی اینٹ کے لگنے سے آں محترم کی وفات ہوئی۔ چوٹ اور زخم لگنے سے خون زیادہ نکل گیا جس کی وجہ سے وفات ہوگئی اور آں محترم مرتبہ شہادت پر فائز ہوئے، رضی اللہ عنہ و ارضاہ۔ مخالفین لشکر نے انھیں قتل نہیں کیا۔ روایت کا یہ حصہ ''**فاسرعوالیہ فقتلوہٗ**'' بالکل غلط اور کسی سبائی یا سبائیت نواز راوی یا مؤرخ کا اضافہ ہے جو اس نے اپنی طرف سے بڑھادیا ہے۔ مندرجہ ذیل قرائن ہماری رائے کی تصدیق اور روایت زیر بحث کے حصہ مذکور کی تکذیب کررہے ہیں:

اوّل:۔ اس آخری کشمکش میں بھی فریقین کے درمیان کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ دونوں نے حرم کے احترام کی وجہ سے اسلحہ سے کام نہیں لیا۔ اس روایت میں اس حادثہ سے متعلق صرف اتنا کہا گیا ہے

> ''پھر ابن زبیرؓ اٹھے اور آں محترم اور ان کے رفقاء نے حملہ کیا یہاں
> تک کہ دشمنوں کو حجون تک پسپا کردیا۔''(۲)

۱۔ البدایہ والنہایہ، جلد ۸ ،صفحہ ۳۳۱۔

۲۔ ایضاً۔

اس روایت میں نہ تو کسی کے قتل کا تذکرہ ہے اور نہ زخمی ہونے کا، نہ کسی سلاح کے استعمال کا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی جنگ نہیں ہوئی، فریقین نے حرم شریف کی حرمت و عظمت کا پاس و لحاظ کیا اور کسی نے ایک دوسرے پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ حسب سابق (جیسا کہ مذکور ہوچکا ہے) سیدنا ابن زبیرؓ ان کی طرف بڑھتے تھے اور وہ لوگ بھاگ جاتے تھے۔ حرم مکہ کے اندر کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ اس سے عیاں ہے کہ لشکر حجاجؒ انھیں قتل نہیں کرنا چاہتا تھا بلکہ صرف محصور کر کے ان سے ہتھیار ڈلوانا اور صلح پر آمادہ کرنا چاہتا تھا۔ جب لشکر کا یہ رجحان تھا تو یہ بات بعید از قیاس ہے کہ انھوں نے آں محترم کو گرتا ہوا دیکھ کر ان کے قتل کا ارادہ کرلیا ہو اور انھیں شہید کردیا ہو۔ خصوصاً جبکہ انھیں توقع ہو کہ اینٹ کی چوٹ سے ہی ان کی وفات ہوجائے گی۔

اگر یہ کہا جائے کہ ''یہ واقعہ حرم سے باہر کا ہے، حرم کے اندر تو ان لوگوں نے احترامِ حرم کی وجہ سے ان کے قتل کا ارادہ نہیں کیا، لیکن ممکن ہے کہ جب حرم سے باہر آگئے تھے تو ارادہ قتل کرلیا ہو۔'' اس کا جواب یہ ہے کہ بلاشبہ سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ اور ان کے رفقاء کی طرح حجاجؒ اور لشکر حجاجؒ کو بھی احترام حرم کا پورا پورا پاس و لحاظ تھا۔ اسی وجہ سے حرم شریف میں فریقین کے درمیان کوئی جنگ نہیں ہوئی، کسی نے اسلحہ سے کام نہیں لیا اور نہ کسی نے کسی کو مجروح کرنے کی کوشش کی۔ لیکن حجاجؒ کی فوج کا دوران محاصرہ جو رویہ رہا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صرف احترام حرم ہی اس کا سبب نہ تھا بلکہ وہ سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ کو قتل یا مجروح کرنا ہی نہ چاہتے تھے بلکہ اس سے گریز کرتے تھے۔ اگر وہ اس سے بچنا نہ چاہتے تھے، یا اس کے خواہاں ہوتے تو پانچ ماہ کے محاصرے کے دوران کسی موقع پر تو وہ اس کی کوشش کرتے کہ حضرت موصوفؓ کو اپنے پیچھے لگا کر حرم مکہ سے باہر لے آئیں اور وہاں حملہ کرکے انھیں شہید کردیں۔ مگر اس قسم کی کسی کوشش کا کوئی ثبوت بھی

نہیں ملتا بلکہ کوئی ایسی بات بھی نہیں ملتی جس سے ان کے لشکر والوں پر اس کا شبہ بھی کیا جا سکے۔ اس سے روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ حجاجؒ اور اس کے لشکر والے سب حضرات ابن زبیرؓ کی عظمت کے قائل تھے اور ان کے قتل یا انھیں مجروح کرنے سے سخت کارہ تھے، قطعاً انھیں جانی نقصان نہیں پہنچانا چاہتے تھے۔ اس لیے یہ بات بالکل بعید از قیاس ہے کہ انھوں نے آں محترم کو شہید کیا ہو۔

دوم:۔ سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ اس موقع پر تنہا نہیں تھے۔ ان کے ساتھ ان کا لشکر تھا۔ ان کی تعداد اگرچہ بہت کم تھی مگر پھر بھی معتدبہ تھی۔ جب بقول راوی، مخالفین دوڑ کر انھیں قتل کرنے کے لیے آئے تو ان کے رفقاء نے کیا کیا؟ انھوں نے آں محترم کی حفاظت اور ان کی طرف سے مدافعت کی یا نہیں؟ اس کا کوئی تذکرہ کسی روایت میں نہیں، اگر کوئی مدافعت کی ہوتی تو ضرور اس کا تذکرہ ہوتا۔ یہ بھی بالکل بعید از عقل و قیاس ہے کہ انھوں نے کوئی مدافعت نہ کی ہو اور اسے گوارا کرلیا ہو کہ ان کے منتخب کیے ہوئے خلیفہ اور امیر کو ان کے دشمن ان کے سامنے ذبح کریں۔ یہ بات تو غیرت وحمیت، خلوص اور وفاداری کے بالکل منافی اور مخالف ہے بلکہ ایک قسم کا غدر ہے جو جائز نہیں بلکہ سخت مذموم اور معصیتِ کبیرہ ہے۔ ان واقعات پر نظر کرنے سے یقینی طور پر یہی بات ظاہر ہوتی ہے کہ حجاجؒ کے لشکر والوں نے آں محترم کو قتل کرنے کا کوئی ارادہ یا اقدام نہیں کیا اور قتل والی روایت بالکل جھوٹی، غلط اور جعلی ہے۔ صحیح یہ ہے کہ آں محترم کی وفات اسی اینٹ کے لگنے سے ہوئی، جس کی چوٹ کھا کر آپ گر پڑے تھے۔ گرنے کے سبب کوئی آپ کو قتل کرنے نہیں آیا بلکہ خون زیادہ نکل جانے کی وجہ سے آں محترم کا انتقال ہوگیا۔ رضی اللہ عنہ وارضاہ۔

سوم:۔ حجاجؒ قریشی نہیں تھے۔ ان کے لشکر میں قریشی بھی خال خال ہی ہوں گے۔ سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ، عبدالملک بن مروانؒ کے قریبی رشتہ دار اور نبی

کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابی بھی تھے۔ حجاجؒ اور ان کے لشکر کے کسی شخص کی یہ جرأت نہیں ہوسکتی تھی کہ انھیں خلیفۃ المسلمین کی اجازت کے بغیر قتل کر دے۔ عبدالملکؒ نے صرف ان کے محاصرے کی اجازت دی تھی، قتل و قتال کی اجازت نہیں دی تھی۔ اس لیے وہ کس طرح ان کے قتل کی جرأت کر سکتے تھے۔ انھیں قتل کرنے کی روایت قطعاً غلط ہے جو کسی سبائی یا سبائیت نواز نے گھڑی ہے۔

قتل کی روایت کا کذب و افتراء اور من گھڑت ہونا تو روز روشن کی طرح عیاں ہوگیا اور یہ بات بھی صاف ہوگئی کہ سیدنا ابن زبیرؓ کی شہادت اینٹ کے لگنے کی وجہ سے ہوئی تھی لیکن وہ اینٹ کہاں سے آئی تھی، اس سوال کا کوئی واضح جواب نہیں ملتا۔ تاہم دشمنانِ بنو امیہ یہ بھی نہیں کہہ سکے کہ وہ اینٹ لشکر حجاجؒ میں سے کسی نے پھینکی تھی بلکہ اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ یہ ایک اتفاقی حادثہ تھا۔ کسی نے بھی قصداً ان کی طرف اینٹ نہیں پھینکی تھی جو اتفاقی طور پر ان کے لگ گئی۔ پھر بھی یہ بات راز ہی رہتی ہے کہ وہ اینٹ کسی نے پھینکی تھی اور کس طرف سے آئی تھی۔ حافظ ابن کثیرؒ اس واقعہ کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں:

> فجاءتہ آجرۃ فاصابتہ فی وجھہ فارتعش بھا ۔۔۔ ثم قسط الی الارض یعنی ایک اینٹ ان کے چہرے پر لگی، انھیں اس سے جھرجھری آئی۔۔۔ پھر وہ زمین پر گر پڑے۔[1]

اینٹ کسی نے پھینکی؟ کدھر سے آئی؟ اس کی طرف اس روایت میں اشارہ تک نہیں ملتا۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوجاتی ہے کہ حجاج کے لشکر والوں میں سے کسی نے اینٹ نہیں پھینکی تھی۔ سیدنا ابن زبیرؓ کے واقعہ شہادت کے بارے میں مختلف و متناقص روایتیں ہیں۔ صحیح روایت صرف وہی ہے جو حافظ ابن کثیرؒ نے لکھی ہے اور اوپر منقول ہوئی ہے، باقی روایتیں غلط ہیں اور جمہور مؤرخین کے نزدیک قابل

۱۔ البدایہ والنہایہ، جلد ۸ ،صفحہ ۳۳۱۔

تسلیم نہیں۔

اسی قسم کی ایک روایت البدایہ والنہایہ میں حافظ ابن کثیرؒ نے طبرانی سے نقل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا ابن زبیرؓ کے اعوان و مددگار لشکرِ حجاجؒ پر خشت باری کررہے تھے، انھی کی پھینکی ہوئی ایک اینٹ اتفاقی طور پر سیدنا ابن زبیرؓ کے سر مبارک میں لگی جس سے سر کھل گیا اور گہرا زخم آیا۔ یہ روایت تو غلط ہے اس لیے کہ اس میں بیان کیا گیا ہے کہ اینٹیں مسجد الحرام کی پشت (عقب) کی طرف سے پھینکی جارہی تھیں اور یہ قطعاً غلط ہے۔ اس لیے کہ مسجد کے چاروں طرف دروازے ہیں، اس کا کوئی حصہ ایسا نہیں جسے پشت مسجد کہا جا سکے۔ دوسرے یہ کہ مسجد کے دروازے پر چاروں طرف حجاجؒ کے سپاہی جمع تھے اور پہرہ دے رہے تھے، پھر کسی طرف سے اینٹیں پھینکنے کا موقع کیسے مل سکتا تھا۔ تیسرے یہ کہ اگر بقول راوی، لشکرِ حجاجؒ اندرون مسجد گیا تھا جہاں ابن زبیرؓ کے اعوان و انصار بھی تھے تو اس طرح خشت باری سے اپنے ہی معاونین کے زخمی یا مقتول ہونے کا شدید خطرہ تھا۔ ایسی صورت میں وہ لوگ خشت باری کیسے کرسکتے تھے۔ یہ سب قرائن خشت باری کی اس روایت کو غلط ثابت کرتے ہیں لیکن اس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ جب یہ روایت گھڑی گئی تھی اس وقت عام طور پر لوگ خشت باری کو لشکرِ حجاجؒ کی طرف منسوب نہیں کرتے تھے۔ نیز یہ سمجھتے تھے کہ یہ ایک اتفاقی حادثہ تھا اور کم از کم اس کا احتمال ہے کہ یہ اینٹ سیدنا ابن زبیرؓ کی جماعت والوں اور طرفداروں ہی نے دشمنوں کی طرف پھینکی ہو، جو اتفاق سے سیدنا ابن زبیرؓ کو لگ گئی۔

یہاں تک پہنچنے کے بعد کم از کم ظنِ غالب کی حد تک اس راز کی نقاب کشائی ہوجاتی ہے۔ واقعہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ سبائی سازش کے کچھ ارکان تقیہ کرکے مکہ معظّمہ میں مقیم ہوں گے اور سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ کے رفقاء کے ساتھ گھل مل کر رہتے ہوں گے۔ سیدنا ابن زبیرؓ کے ساتھ الحجون تک گئے اور کہیں چھپ کر موقع پا کر یہ

اینٹ انھیں میں سے کسی نے پھینکی ہوگی جو آں محترم کی وفات و شہادت پر منتج ہوئی۔ جو لوگ شیعیت کے مزاج سے واقف ہیں وہ ہماری اس بات کو بلا شک و شبہ تسلیم کرلیں گے۔ قتل کی روایت غلط ثابت ہوجانے کے بعد لاش کی بے حرمتی کی روایتوں کا غلط ہونا خود بخود واضح ہوجاتا ہے۔

تاریخِ اسلام کے طالبعلم کو یہ اصول ملحوظ رکھنا چاہیے کہ تاریخ اور حدیث کی حیثیت یکساں نہیں ہے۔ حدیث کی روایت میں راوی جس قدر احتیاط کرتا ہے، تاریخ کا راوی اس کا عشر عشیر احتیاط بھی نہیں کرتا۔ تاریخی روایت کی صحت و غلطی متعین کرنے میں قرائن داخلی و خارجی کی اہمیت بہت زیادہ ہے اور درحقیقت فیصلہ قرائن ہی کے اختیار میں ہوتا ہے۔ رواۃ کا ثقہ ہونا کسی تاریخی روایت کی صحت کے لیے کافی نہیں۔ جب تک قرائن بھی اس کی تائید نہ کرتے ہوں یا کم از کم اس کی نفی نہ کرتے ہوں اور اس کے خلاف نہ ہوں۔ کسی تاریخی روایت کے سب راوی ثقہ ہوں، مگر قرائنِ قویہ اس روایت کو غلط ثابت کررہے ہوں تو اسے یقیناً غلط اور مردود سمجھا جائے گا۔ اسے محض ثقات کی روایت ہونے کی بناء پر قبول نہیں کیا جاسکتا۔ حدیث اور تاریخ میں یہ فرق پیش نظر رکھنا لازم ہے۔ حدیث کی صحت و عدم صحت کی جانچ کرنے کے لیے ہمارے لیے ضروری ہے کہ پہلے اس کے راویوں کے احوال معلوم کریں۔ قرائن کو اس میں بھی اہمیت حاصل ہے مگر اس کا درجہ احوال رواۃ کے بعد ہے۔ بخلاف اس کے تاریخ میں قرائن ہی کو اہمیت حاصل ہے۔ اس میں راویوں کی جانچ ثانوی چیز ہے۔ اس کی ایک قوی وجہ یہی ہے کہ تاریخی روایتوں کے بارے میں بڑے بڑے ثقہ اور عادل اشخاص بھی اکثر و بیشتر غیر محتاط ہوتے ہیں۔ نسلی عصبیت، جماعتی و تحریکی تعصب، سیاسی اختلافات اور اس قسم کے دوسرے حالات و جذبات بعض اوقات غالب ہوکر ماضی کی خبروں کے بارے میں بڑے بڑے ثقات کو انتہائی بد احتیاطی کرنے یہاں تک کہ کھلا جھوٹ بولنے اور افتراء کرنے پر آمادہ کردیتے

ہیں۔ یہ واقعہ تنہا میں نے نہیں بلکہ بہتوں نے دیکھا ہے اور دیکھتے رہتے ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ ساتھ سیاسی معاملات اور اختلافات کی صورت میں۔ اس بارے میں احتیاط کرنے والے مفقود تو نہیں مگر بہت قلیل ہیں۔ ان امور پر نظر کرنے کے بعد کوئی ایسی تاریخی روایت جو اگرچہ ثقات سے مروی ہو مگر قرائن اس کی تکذیب کر رہے ہوں قطعاً قبول نہیں کی جاسکتی اور اس پر قطعاً اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ مطالعۂ تاریخ میں اس اصول کا ملحوظ رکھنا لازم ہے ورنہ سخت غلطیوں اور غلط فہمیوں میں پڑنے کا اندیشہ ہے۔ مطالعہ تاریخ کے اس اہم اصول کی وضاحت کے لیے اگرچہ ہم نے زیر ِبحث روایتوں کے راویوں کو ثقہ فرض کیا تھا لیکن حقیقتِ واقعہ یہ ہے کہ ان سب کے راوی عام طور پر مجہول، شیعہ یا شیعیت نواز ہیں۔ یہ جھوٹ بولنے یا جھوٹی روایتیں نقل کرنے میں مشاق تھے۔ بنو امیہ سے بغض و عداوت کی وجہ سے ان کے خلاف زہر اگلنے اور ان پر بہتان و افتراء کرنے میں انھیں کوئی ہچکچاہٹ نہیں محسوس ہوتی تھی۔ ایسے لوگوں کی خبر جو قرائن کے خلاف ہو کسی طرح قابل قبول نہیں ہوسکتی۔ اس اہم اصول کو سامنے رکھ کر مندرجہ ذیل قرائن پر غور کیجئے جو زیر بحث روایتوں کی تکذیب کر رہے ہیں:

اوّل:۔ چند سطریں پہلے یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ حجاجؒ کے لشکر کے لوگ سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ کو قتل یا مجروح نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ان کی عظمت بھی لشکر والوں کے دلوں میں تھی۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ انھوں نے آں محترم کی لاش کی بے حرمتی کی ہو؟ ان کا سر کاٹا ہو اور لاش سولی پر چڑھائی ہو؟ اس سے عیاں ہے کہ یہ روایتیں بالکل غلط ہیں۔

دوم:۔ سیدنا عبداللہ بن عمرؓ وہاں موجود تھے۔ سیدنا ابن زبیرؓ کی شہادت کا واقعہ کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ آں محترم رسول اللہ ﷺ کے صحابی اور قریبی رشتہ کے بھتیجے تھے، دوسرے رشتہ سے نبی ﷺ ابن زبیرؓ کے خالو تھے۔ آں محترم کی

شہادت کی خبر بہت تیزی کے ساتھ مکہ معظّمہ میں پھیل گئی ہوگی اور لاش کے قریب لوگوں کے ٹھٹھ لگ گئے ہوں گے۔ یہ بالکل بعید از قیاس ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عمرؓ جائے حادثہ پر اتنی تاخیر کے ساتھ پہنچے ہوں کہ ان کا سر بھی کاٹا جا چکا ہو اور ان کی لاش کو مقام کدا پر لے جا کر صلیب پر لٹکایا جا چکا ہو۔ یقیناً سیدنا عبداللہ بن عمرؓ فوراً پہنچے ہوں گے۔ پھر انھوں نے سیدنا ابن زبیرؓ کی لاش کی یہ بے حرمتی کیسے گوارا کی؟ اور حجاجؒ یا ان کے لشکر والوں کی یہ جرأت کیسے ہوئی کہ سیدنا ابن زبیرؓ کی لاش کی بے حرمتی کریں۔ اگر اس قسم کا کوئی واقعہ ہوا ہوتا یا اس کا کسی نے ارادہ کیا ہوتا تو یقیناً سیدنا ابن عمرؓ اسے سختی سے منع کرتے اور نہی عن المنکر کے فریضہ سے غفلت نہ برتتے مگر اس مضمون کی کوئی روایت تاریخ میں موجود نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سر کاٹنے، اسے دمشق بھیجنے، جسم بے سر کو سولی دینے اور اس قسم کی دوسری روایتیں قطعاً غلط، جھوٹی اور شیعوں نیز شیعیت نوازوں کی گھڑی ہوئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کذابوں کو رسوا کرے۔

سوم:۔ اوپر مذکور ہو چکا ہے کہ مکہ سے تقریباً دس ہزار آدمی امان لے کر لشکر حجاجؒ میں پہنچ چکے تھے۔ ان میں سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ کے دو بیٹے حمزہ وخبیبؒ بھی تھے۔ ان لوگوں نے ابن زبیرؓ کی لاش کی بے حرمتی کیسے گوارا کی خصوصاً آں محترم کے بیٹوں سے باپ کی لاش کا سر کٹتے اور اسے سولی پر لٹکتے کیسے دیکھا گیا۔ اگر اس قسم کا واقعہ ہوا ہوتا تو یقیناً ان لوگوں نے حجاجؒ کو اس سے منع کیا ہوتا اور اپنے غم و غصہ کا اظہار کیا ہوتا حالانکہ اس قسم کی کوئی روایت موجود نہیں ہے۔ یہ اس امر کا قوی قرینہ ہے کہ اس قسم کا کوئی واقعہ قطعاً نہیں ہوا۔ بلکہ حجاجؒ نے اس کا کوئی ارادہ بھی نہیں کیا۔ سر کاٹنے، اس کی تشہیر کرنے اور لاش کو سولی دینے کی روایتیں قطعاً غلط اور سبائی ڈھانچے میں ڈھلی ہوئی سراپا کذب و دروغ کہانیاں ہیں جن کی کوئی اصل و بنیاد نہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ لوگ حجاجؒ کے خوف کی وجہ سے خاموش رہے تو

اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح انھیں حجاجؒ کا خوف ہوسکتا تھا اسی طرح حجاجؒ بھی ان سے خائف ہوسکتے تھے۔ اندرونِ لشکر اگر دس ہزار میں سے دو ہزار آدمی بھی تلواریں سونت لیتے تو حجاجؒ کے لیے لینے کے دینے پڑ جاتے۔ وہ ایک مدبر اور ذہین شخص تھے۔ ان حالات میں قطعاً ایسی کوئی بات نہیں کرسکتے تھے جس سے ان امان حاصل کرنے والوں میں اشتعال پیدا ہو۔ اول تو پرکاہ کے برابر بھی اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ حجاجؒ کی نیت سیدنا ابن زبیرؓ کی لاش کی توہین کرنے کی تھی۔ لیکن بالفرض المحال ان کی نیت بھی ہوتی تو بھی وہ اس پر عمل تو کجا اس کا اظہار بھی نہیں کرسکتے تھے۔ کیونکہ اس صورت میں امان لینے والوں کی بغاوت کا اندیشہ تھا۔ یہی نہیں بلکہ اس صورت میں خود ان کا لشکر ان کے خلاف ہوجاتا۔ وہ صرف محاصرے کے لیے آئے تھے، ابن زبیرؓ کو قتل کرنے نہیں آئے تھے۔

چہارم:۔ خود حجاجؒ کا لشکر ابن زبیرؓ کا معتقد، ان کی عظمت اور ان کے مقبول بارگاہ الٰہی ہونے کا قائل تھا۔ اسی لیے اس نے کسی موقع پر بھی ان سے مقابلے کی جسارت نہیں کی۔ انھیں دیکھ کر سب محاصرہ کرنے والے بھاگ کھڑے ہوتے تھے۔ اس لشکر کے ایک سردار طارق نے ابن زبیرؓ کی لاش کے پاس کھڑے ہوکر حجاجؒ کے سامنے کہا کہ

"کسی عورت نے اس سے زیادہ جوانمرد نہیں جنا ہے۔"(۱)

خود حجاجؒ بھی ابن زبیرؓ کی عظمت اور ان کی ولایت کے قائل تھے چنانچہ انھوں نے فتح کے بعد جو تقریر کی اس میں ابن زبیرؓ کو "من خیار الناس" یعنی بہترین لوگوں میں سے ایک کہا ہے۔ ایسے لوگوں کا آں محترم کی لاش کے ساتھ توہین آمیز سلوک کرنا بالکل بعید از قیاس وعقل ہے۔

۱۔ البدایہ والنہایہ، جلد ۸، صفحہ ۳۳۱۔

حجاجؒ کی مذمت میں بزرگوں سے منقول اقوال و بیانات کی حقیقت:

مودودی صاحب نے بڑے طمطراق کے ساتھ حجاجؒ مرحوم کے خلاف بعض بزرگ ہستیوں کے اقوال نقل کیے ہیں کہ:

"مشہور امام قرأت عاصم بن ابی النجود کہتے ہیں کہ اللہ کی حرمتوں میں سے کوئی حرمت ایسی نہیں رہ گئی، جس کا ارتکاب اس شخص نے نہ کیا ہو۔"

جناب عمر بن عبدالعزیزؒ کہتے ہیں کہ:

"اگر دنیا کی تمام قومیں خباثت کا مقابلہ کریں اور اپنے سارے خبیث لے آئیں تو ہم تنہا حجاجؒ کو پیش کرکے ان پر بازی لے جاسکتے ہیں۔" (۱)

اسی طرح موصوف نے ذمِ حجاجؒ میں امام شعبی کا قول بھی نقل کیا ہے۔

تبصرہ: شیعوں اور ان کے ساتھ تحریکِ شیعیت میں شرکت کرنے والے علویوں کے جھوٹے پروپیگنڈے اور ارجاف کا اتنا اثر ہوا کہ بنو امیہ کی مذمت کرنا اور ان کے خلفاء وعمال کو ظالم و جابر کہنا فیشن میں داخل ہوگیا۔ خصوصاً حجاجؒ مرحوم کی مذمت تو ہر وہ شخص واجب و لازم سمجھتا ہے جو تاریخِ اسلام کے متعلق کچھ لکھتا ہے یا تقریر کرتا ہے۔ مودودی صاحب جو نسلی تعصبِ جاہلی سے مغلوب تھے، اس تبرابازی سے کیسے باز رہ سکتے تھے۔ اس تبرا بازی سے اس قسم کے لوگوں کو یا دوسرے مسلمانوں کو فائدہ تو کچھ بھی نہیں پہنچتا ، ہاں غیبت بلکہ بہتان کا گناہ ہوتا ہے اور ناواقف مسلمانوں کو یہ نقصان پہنچتا ہے کہ انھیں اپنی تاریخ کے متعلق بدگمانی پیدا

۱۔ خلافت وملوکیت، صفحہ ۱۸۵، ۱۸۶۔

ہوتی ہے اور ان کے اس قابلِ تحسین جذبہ فخر کو ٹھیس لگتی ہے جو اپنی درخشاں اور شاندار تاریخ پر ان کے دلوں میں موجزن ہے اور جو ہر طرح صحیح اور بجا ہے۔

بنو امیہ اور حجاجؒ مرحوم کی مذمت میں جن لوگوں کے اقوال مودودی صاحب نے نقل کیے ہیں، اگر ان کی طرف ان اقوال و بیانات کی نسبت صحیح ہے تو ایک عام مسلمان کے دل میں یہ سوال پیدا ہونا ناگزیز ہے کہ کیا یہ بزرگانِ سلف بھی ''تبرا بازی'' کے خوگر تھے؟ اور کیا یہ حضرات غیبت و بہتان کو تقویٰ کے منافی نہیں سمجھتے تھے؟ اگر یہ بدگوئی کسی شرعی مصلحت و ضرورت کی بناء پر تھی تو وہ معلوم ہونا چاہیے وگرنہ بظاہر تو کوئی مصلحت نظر نہیں آتی۔ عاصم بن ابی النجود نے مبینہ طور پر جس زمانہ میں حجاجؒ کی غیبت یا ان پر بہتان باندھنے کا ارتکاب کیا ہے، اس وقت خلافت بنو امیہ کو زوال ہو چکا تھا، پھر ان کی مذمت کرنے سے کیا فائدہ تھا؟

عاصم کے بعد سب سے زیادہ شدت کے ساتھ خلافت اور حجاجؒ کی مذمت کرنے والے عمر بن عبدالعزیزؒ ہیں۔ یہ امیر المومنین عبدالملک بن مروانؒ کے زمانے میں جوان تھے۔ حجاجؒ کا دور ان کے سامنے گزرا۔ خاندان میں ان کا اتنا اثر تھا کہ ہشام بن عبدالملکؒ نے انھیں اپنا ولی عہد بنایا۔ یہ اپنے زہد و تقویٰ میں ممتاز و معروف ہیں۔ ہر مسلمان ان سے پوچھ سکتا ہے کہ حضرت اس دوران آپ کیا کرتے رہے؟ آپ کا منصب تو یہ تھا کہ آپ اس گریہ و بکا اور مشقِ تبرا کے بجائے حجاجؒ پر علی الاعلان نکیر کرتے، امیر المومنین عبدالملکؒ سے ان کی شکایت کر کے انھیں معزول کرواتے، یہ سب آپ کر سکتے تھے مگر انسداد ظلم کے لیے آپ نے کیوں نہ کیا؟ خلافت امویہ اور حجاجؒ کے مخالفین نے حضرت حسن بصریؒ کا جو طرز عمل ان کے متعلق دکھایا ہے وہ عجیب و غریب ہے۔ ایک طرف وہ حجاجؒ اور اموی خلافت پر تبّرا بھیجتے ہیں اور دوسری طرف امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضہ سے گریز کرنے کے ساتھ خلافتِ بنو امیہ کی امداد و اعانت بھی کرتے ہیں اور اس کے خلاف بغاوت کچلنے میں اس کے

مددگار بن جاتے ہیں۔ امام شعبیؒ کا مسئلہ بھی تقریبا اسی نوعیت کا ہے۔ ان کا انتقال بعمر اسّی (۸۰) سال پہلی صدی ہجری گزرنے کے بعد ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے حجاجؒ اور عبدالملکؒ کا زمانہ پایا ہے اور ان ادوار میں وہ عاقل و بالغ تھے، پھر انھوں نے حجاجؒ اور عبدالملکؒ پر نکیر کیوں نہیں کی۔ ان کی پوزیشن اس قدر اونچی تھی کہ انھیں کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کرنے سے پیشتر حجاجؒ اور عبدالملکؒ کو بھی سوچنا پڑتا اور تابہ امکان وہ انھیں کوئی نقصان یا تکلیف پہنچانے سے گریز کرتے۔ تبرا پڑھنے کے بجائے ان دونوں صاحبان کو تو چاہیے تھا کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتے اور قولاً و عملاً ہر طرح سے ظلم بند کرنے کی کوشش کرتے، مگر انھوں نے یہ نہیں کیا، اگر کیا ہوتا تو ثابت ہوتا۔

مختصر یہ کہ جن بزرگان ملت کی زبان سے مودودی صاحب اور ان کے ہم مشرب علماء و مؤرخین، حجاجؒ اور خلفاء بنی امیہ کی مذمت نقل کرتے ہیں اور انھیں ظالم و جابر کہلواتے ہیں، ان میں سے کسی ایک کے متعلق یہ ثابت نہیں کہ اس نے حجاجؒ یا عبدالملکؒ پر یا کسی دوسرے خلیفہ پر اس کے مبینہ ظلم و جور یا فسق و فجور کے بارے میں نکیر کی ہو یا انھیں ظلم و معصیت سے باز رہنے کی نصیحت کی ہو۔ بلکہ عموماً یہ حضرات حجاجؒ و عبدالملکؒ اور دوسرے عمال و خلفاء بنی امیہ سے مالی امداد حاصل کرتے تھے، پھر ایسے حضرات کی بات پر کیسے اعتبار و اعتماد کیا جائے؟

جس طرح یہ ممکن ہے کہ یہ حضرات بخوفِ حجاجؒ حق بات کہنے اور مظلوموں کی حمایت و نصرت کرنے سے باز رہے ہوں، اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ یہ صاحبان حجاجؒ اور عبدالملک کے خلاف یہ تبرا بخوف عوام کرتے ہوں۔ چونکہ شیعوں اور عباسیوں کے ایجنٹوں نے خلافت بنی امیہ کے خلاف غلط باتوں اور بے بنیاد الزاموں کی تشہیر بہت زیادہ کی تھی، اس لیے عوام کا ایک طبقہ ان کا مخالف ہوگیا تھا۔ اس طبقہ کے خوف کی وجہ سے ان لوگوں نے اپنے ضمیر اور حقیقت واقعہ کے خلاف یہ تبرا بازی

کی ہو۔ کیا یہ ممکن نہیں؟ اگر نہیں تو کیوں؟ جب یہ ناممکن ہے کہ ان کے اقوال مذکورہ اور اسی طرح کے دوسرے اقوال قطعاً ساقط الاعتبار کہے جائیں گے۔

یہ گفتگو تو ہم نے یہ فرض کرکے کی تھی کہ یہ اقوال اور ان کے امثال جو مذکورہ بالا یا ان جیسے دوسرے بزرگوں کی طرف منسوب کیے گئے ہیں، انھیں کے اقوال ہیں اور ان سے ثابت ہیں۔ لیکن حق یہ ہے کہ یہ مفروضہ ہی قطعاً غلط ہے۔ یہ ان حضرات کے اقوال و آراء قطعاً نہیں ہیں۔ بلکہ سبائیوں اور تحریک شیعیت کے حامیوں کے وضع کیے ہوئے اور گھڑے ہوئے جملے ہیں جو ان کذابوں نے ان بزرگوں اور ان جیسے دوسرے بزرگوں کی طرف منسوب کردیئے ہیں۔ یہ ان بزرگوں پر بہتان و افتراء ہے۔ یہ حضرات ان اقوال و آراء سے بالکل بری ہیں۔ اگر درحقیقت یہ ان حضرات کے اقوال ہوتے تو یقیناً یہ حضرات حجاجؒ اور عبدالملکؒ پر ضرور نکیر کرتے۔ یہ مداہنت کرنے والے لوگ نہیں تھے اور اگر یہ حضرات نکیر کرتے تو یہ بات شہرت کے ساتھ منقول ہوتی۔ نیز یہ کہ اس کے اثرات ضرور ظاہر ہوتے اور اس کا ردِّ عمل یقیناً واضح ہوتا حالانکہ تاریخ ان سب امور کے بارے میں بالکل ساکت ہے۔ جن ظالموں کو احادیث وضع کرکے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر افتراء کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہوئی وہ اگر حسن بصریؒ و امام شعبیؒ و امثالہم پر افتراء کریں اور ان کی طرف اپنے اقوال کاذبہ منسوب کردیں تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔

اگر بطور فرض یہ بھی تسلیم کرلیا جائے کہ ان بزرگوں نے واقعی جناب حجاجؒ کی مذمت کی ہے اور انھیں ظالم کہا ہے تو بھی یہ لازم نہیں آتا کہ ہم ان اقوال مذکورہ کو صحیح سمجھ لیں۔ اجتماعی نفسیات کے اس اصول کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے کہ علماء وصوفیاء، علمی ذوق اور علم میں انہماک رکھنے والے لوگ پروپیگنڈے سے بہت زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ یہ لوگ عوام سے بھی زیادہ اس معاملہ میں کمزور ہوتے ہیں۔ وہ علماء وصلحاء اس سے متاثر نہیں ہوتے یا کم متاثر ہوتے ہیں جو علمی مشغلہ کے ساتھ کچھ

دنیاوی اور معاملاتی امور سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔ اس اصول کے پیشِ نظر اگر مذکورہ بالا بزرگوں نے سبائیوں کے جھوٹے پروپیگنڈے سے متاثر ہوکر اس قسم کی باتیں کہیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں لیکن ان کے اقوال کو سند نہیں بنایا جاسکتا بلکہ ان کو ان کی نادانستہ غلط بیانی کہا جائیگا۔ جھوٹ تو جھوٹ ہی رہے گا، خواہ دانستہ بولا جائے یا نا دانستہ۔ ان کے ان اقوال کا کوئی اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ خصوصاً جبکہ دوسرے جلیل القدر علماء حجاجؒ کی تعریف کررہے ہوں، جیسا کہ ہم آئندہ بیان کریں گے۔ یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ جس زمانہ میں بقول مخالفینِ بنی امیہ یہ مذموم واقعات پیش آئے تھے، اس میں صحابہ کرامؓ معتدبہ تعداد میں موجود تھے۔ سیدنا عبداللہ بن عمرؓ جیسے جلیل القدر اور امتیازی شان رکھنے والے صحابیؓ تو حجاجؒ کے ساتھ مکہ معظّمہ ہی میں موجود تھے اور حجاجؒ ایک حیثیت سے ان کے تابع بھی تھے۔ ان کے علاوہ سیدنا ابو ثعلبہؓ بن جرہم خشنی متوفی ۷۵ھ دمشق میں مقیم تھے جو اموی خلافت کا پایہ تخت تھا۔ یہ بزرگ بیعتِ رضوان میں شریک تھے۔ سیدنا سوید بن غفلہؓ متوفی ۸۰ھ کوفہ میں قیام پذیر تھے۔ سیدنا جابر بن عبداللہ الانصاریؓ شریک بیعتِ عقبہ تھے، مدینہ منورہ میں رہتے تھے، ۷۸ھ میں وفات پائی۔ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ۔ یہ چند اسمائے گرامی بطور مثال پیش کردیئے گئے ورنہ اس زمانہ میں جو صحابہ کرامؓ موجود تھے ان کی تعداد اس سے زائد ہے۔ صحابہ کرامؓ کا ایک وصفِ جمیل قرآن مجید میں یہ بیان فرمایا گیا ہے کہ وہ ''امر بالمعروف و نہی عن المنکر'' کے خوگر ہیں۔ اگر دشمنانِ بنی امیہ کا یہ بیان صحیح ہے کہ حجاجؒ و عبدالملکؒ بہت ظالم تھے اور اموی خلافت سے عناد رکھنے والوں نے جو الزام ان پر لگائے ہیں، ان میں ذرّہ برابر بھی صداقت ہے تو ان صحابہ کرام نے ان پر کوئی نکیر کیوں نہیں فرمائی۔ اگر نکیر فرمائی ہوتی تو یقیناً شہرت کے ساتھ منقول ہوتی، حالانکہ تاریخ میں اس قسم کی بات کا نام و نشان بھی نہیں ملتا۔ اس سے روز روشن کی طرح عیاں ہوجاتا ہے کہ شیعوں اور شیعیت نواز سُنّی نما لوگوں نے جو اعتراضات حجاجؒ و

عبدالملکؒ پر کیے ہیں وہ بالکل غلط، بے بنیاد اور خالص جھوٹ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرامؓ کے جو اوصاف حسنہ بیان فرمائے ہیں، ان کا ان حضرات میں پایا جانا قطعی ویقینی ہے۔ اور ان حضرات کا کسی وقت بھی ان میں سے کسی وصف سے خالی اور محروم ہونا قطعاً غیر ممکن اور محال ہے۔ سُنّیت کے مدعی مخالفینِ خلافتِ بنی امیہ کی ذمہ واری ہے کہ اس سوال کا جواب دیں۔ لیکن میں پورے وثوق ویقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ وہ قیامت تک اس کا کوئی جواب نہیں دے سکتے۔

تیسرا سوال بھی ایسا ہی ہے جس کا کوئی جواب بنی امیہ کے ان مخالفین کے پاس نہیں ہے اور وہ اس کا بھی کوئی معقول جواب نہیں دے سکتے۔ سوال یہ ہے کہ الصادق الامین سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد ''خیر القرون قرنی'' الحدیث کے بموجب خلیفۃ المسلمین عبدالملکؒ اور حجاجؒ مرحوم کا زمانہ قرن صحابہؓ ہونے کی بناء پر ''خیر القرون کی حدود'' میں داخل تھا۔ اگر ان معاندین ومخالفین خلافتِ امویہ کے زیرِ گفتگو بیانات صحیح اور مطابقِ واقعہ ہیں تو اس ''قرن'' کو ''خیر القرون'' میں کیسے داخل سمجھا جاسکتا ہے۔ ایک مومن کا فیصلہ یقیناً یہی ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث سچی اور سراپا صدق ہے۔ یہ مؤرخین ومعاندین یقیناً جھوٹے ہیں اور حجاج وعبدالملک کے اوپر جو الزامات انھوں نے لگائے ہیں وہ سب غلط ہیں۔ اس حدیث شریف نے ان مسائل کا دوٹوک فیصلہ کردیا۔ کسی مسلمان کے بارے میں کوئی ایسی بات کہنا جو اس حدیث کے خلاف ہو قطعاً حرام اور تقاضائے ایمان کے خلاف ہے۔ اموی خلافت کے زوال کے بعد عبدالملکؒ اور حجاجؒ کے بارے میں اموی وعباسی دور کے علماء وربانیین نے جس حسنِ ظن کا اظہار کیا ہے اور جس طرح ان کی تعریف کی ہے وہ ان شاءاللہ چند صفحات کے بعد قارئین کرام ملاحظہ فرمائیں گے۔

بحث کی طوالت ممکن ہے کہ بعض حضرات کو گراں گزرے لیکن میرا عذر یہ ہے کہ شیعوں اور شیعیت نوازوں نے اس دور کے بارے میں جھوٹے قصے کہانیوں

کو اس قدر شہرت دی ہے کہ حجاجؒ مرحوم کو ظالم کہنا فیشن میں داخل ہوگیا ہے۔ یہاں تک کہ بعض ایسے مضامین نظر سے گزرے جو حجاجؒ اور عبدالملکؒ کے کارناموں اور ان کی دینی خدمات کے تذکرے کے لیے لکھے گئے تھے مگر ان میں بھی مضمون نگار نے حجاجؒ کے تذکرہ میں یہ لکھنا ضروری سمجھا کہ ''مگر وہ بہت ظالم تھا''۔ اس طرح اچھے اچھے صلحاء بھی بہتان طرازی کے گناہ میں سبائیوں اور سبائیت نوازوں کے ساتھ اشتراک و تعاون کرتے ہیں۔ ایسے لوگ اگر حق پسند ہوں تو ان شاءاللہ اس بحث کو پڑھنے سے ان کی اصلاح ہوجائے گی اور وہ اپنی غلطی سے توبہ کریں گے اور بہتان کے گناہ سے محفوظ رہیں گے۔ اس تطویل کی دوسری وجہ یہ ہے کہ یورپ اور امریکہ کے یہود اور مسیحی مستشرقین اور اب بعض ہنود بھی اس دور کے مبینہ غلط قصوں کو پیش کرکے اس سے استدلال کرتے ہیں کہ معاذاللہ ''نبی ﷺ کی تعلیم و تربیت تقریباً بے اثر رہی اور اسلام عملاً چند سال سے زیادہ قائم نہیں رہا۔'' اس بحث سے اس غلط اور بے بنیاد اعتراض کو بھی دفع کرنا منظور ہے۔

تیسرے یہ کہ ہماری درخشاں تاریخ پر جو سیاہی سبائی منافقین اور یہود نے پھیری ہے اسے دیکھ کر اور حقیقت حال سے بے خبر رہ کر ہماری نئی نسل خصوصاً جو یورپ اور امریکہ سے متاثر ہے، قومی خود حقارتی کے مہلک مرض میں مبتلا ہوجاتی ہے۔ اس کا سدِ باب اور اس مرض کا علاج مقصود ہے۔ اسی کا اثر ہے کہ ہماری قوم میں ایک گروہ ایسا پیدا ہوگیا ہے جو دین اسلام اور شریعت اسلامیہ کو بحالات موجودہ ناقابل عمل قرار دیتا ہے اور اس کی دلیل میں سبائیوں کے وضع کیے ہوئے ان جھوٹے قصوں کو پیش کرتا ہے جو خیر القرون کے ایک حصے میں بھی اسے ناقابل عمل ظاہر کرتے ہیں۔ رسول اکرم ﷺ کے مبارک قول ''خیر القرون قرنی'' الخ کو شیعہ اور ان کے معلم یہود معاذ اللہ غلط ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ ہماری اس بحث کا اہم مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ بلاشبہ الصادق الامین سید المرسلین ﷺ کا قول بالکل سچا بلکہ سراپا صدق اور

سچائی ہے۔ کذابوں کی ہرزہ سرائیوں سے حقائق نہیں بدل سکتے۔ ان اکاذیب و بہتانات کو پیروں سے روند کر پھینک دو پھر دیکھو تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول مذکور کی صداقت روز روشن کی طرح نظر آئے گی۔

مسلمانوں کی ان دو جماعتوں کی اس کشمکش میں جسے علماء نے ''فتنہ'' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، یہ واقعہ قابلِ توجہ ہے کہ کئی ماہ کی اس کشمکش میں فریقین نے حدود شرعیہ سے کبھی تجاوز نہیں کیا۔ حرم کی حرمت کا دونوں نے پورا پورا لحاظ کیا۔ کیا یہ کوئی معمولی بات ہے؟ اس کی کوئی نظیر کوئی دوسری قوم پیش نہیں کرسکتی۔ اگر کعبہ شریف پر سنگ باری یا آتش باری یا سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ کو مسجد الحرام کے اندر قتل کرنے کی روایتوں میں سچائی کا شائبہ بھی ہوتا تو محاصرہ اتنے دن نہ جاری رہتا۔ بلکہ جب ابن زبیرؓ کے تقریباً دس ہزار رفقاء انھیں خیر باد کہہ چکے تھے اسی وقت آں محترم کو قتل کردیا جاتا۔ ان کا قتل کوئی مشکل کام نہیں رہا تھا۔ اگر تلوار سے نہیں تو تیروں سے کام لے کر ان کو قتل کیا جاسکتا تھا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا اور اسی وجہ سے نہیں ہوا کہ ابن زبیرؓ کی طرح ان کے مخالفین بھی حدود شرعیہ سے تجاوز نہیں کرنا چاہتے تھے اور احترامِ حرم کی رعایت کرنا فرض سمجھتے تھے۔ نیز یہ کہ وہ سیدنا ابن زبیرؓ کی جان کے دشمن نہیں تھے۔ ان کی آستین سیدنا ابن زبیرؓ کے خون سے پاک ہے۔ انھوں نے آں محترم کو قتل نہیں کیا بلکہ کسی شقی القلب سبائی نے ان کے سر پر اینٹ مار کر انھیں شہید کیا تھا۔

سبائی سازش:

اس بحث میں طوالت بیان کا چوتھا سبب زیادہ اہم اور قابل ذکر ہے۔ چند سال سے پاکستان میں یہ مسئلہ درپیش ہے کہ نفاذِ شریعت کی کیا صورت اختیار کی جائے؟ غالب اکثریت کی رائے ہے کہ فقہ حنفی کو قوانین کا ماخذ بنایا جائے۔ بعض لوگوں کی

رائے یہ ہے کہ جملہ مکاتبِ فقہ کو سامنے رکھ کر قانون سازی کی جائے۔ یہ سطریں ۱۴۱۰ھ بمطابق ۱۹۹۰ء میں لکھ رہا ہوں۔ نفاذ شریعت کی منزل تو ابھی بہت دور نظر آتی ہے۔ یہ بحث بھی اب ختم ہو چکی ہے یا دب گئی ہے۔ مگر اس بحث کے دوران ہی ہماری قوم یعنی اہلسنت ہی کے ایک معتد بہ گروہ نے برملا کہا اور لکھا کہ:

> ''فقہ حنفی و مالکی وغیرہ جو مدون ہوئے ان میں ان ادوار کے حکمرانوں (خلفاء امراء) کی ذاتی و سیاسی مصلحتوں کی رعایت کی گئی ہے اور احکامِ شرعیہ کو ان کے مصالح کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی گئی ہے، اس لیے ان پر اعتماد نہیں جا سکتا۔ ضرورت ہے کہ پاکستان کے علماء اور قانون داں مل کے نئے سرے سے اجتہاد کریں اور کتاب و سنت سے قوانین کا استنباط کریں۔''

یہ گروہ جسے اس وقت عرفاً دانش ور کہا جاتا ہے، وہ ہے جو انگریزی دان اور موجودہ قانون کا ماہر اور اس کے ساتھ عربی دان بھی ہے۔ اور ساتھ ہی فقہ اسلامی نیز تاریخ اسلامی پر بھی وسیع نظر رکھتا ہے۔ فقہ اسلامی اور فقہاء اسلام کے متعلق ان کی مذکورہ بالا رائے تو بالکل غلط ہے لیکن قابل توجہ چیز یہ ہے کہ وہ اس گمراہی میں مبتلا کیوں ہوئے اور ان کی رائے کا سبب کیا ہے؟

سبب ظاہر ہے، ان کا یہ مرض مطالعۂ تاریخ کا اثر ہے۔ سبائیوں نے جو جھوٹ، افتراء اور بہتانوں کے انبار ہماری تاریخ میں لگائے ہیں، ان کے سڑنے سے اس مہلک مرض کے جراثیم پیدا ہوئے جن سے ہماری قوم کا ایک اچھا خاصا طبقہ متاثر ہوا اور ہو رہا ہے۔(۱)

۱۔ وضعی روایات کے تحت عموماً یہ باور کروایا جاتا ہے کہ گویا پہلی صدی کے اختتام سے پہلے ہی عمالِ حکومت اور علمائے اسلام میں کافی بُعد پیدا ہو چکا تھا اور دونوں گروہ ایک دوسرے سے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اس بحث کو طول دینے کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ وہ حضرات جو روافض

بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا:

دوری بنائے رکھتے تھے۔ جبکہ درست تاریخی حقائق اس بات کی کلیتاً نفی کرتے ہیں۔ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر مشتمل پہلی مدون کتاب موطا امام مالکؒ کی بابت صاف تصریح موجود ہے کہ دوسرے عباسی خلیفہ ابو جعفر المنصورؒ کے کہنے پر امام مالک نے اس کی تدوین کا آغاز کیا تھا۔ علامہ ابو زھرہ مصری لکھتے ہیں کہ امام مالکؒ کا موطا جمع کرنا خلیفہ ابو جعفر المنصور عباسیؒ کے کہنے پر مبنی تھا جس میں انھوں نے امام مالکؒ سے درخواست کی تھی:

''حدیث کی ایک ایسی کتاب مدون کیجئے جس میں نہ تو سیدنا عبداللہ بن عمرؓ کے شدائد ہوں، نہ سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ کے شذوذ اور نہ ہی سیدنا عبداللہ بن عباسؓ کی رخصتیں۔ اس میں اوسط امور اور وہ باتیں جس میں صحابہ کا اجماع ہے درج کیجئے۔'' (حیات امام مالک، صفحہ ۲۳۴)

اس مشورے کی بابت ابن خلدونؒ لکھتے ہیں کہ امام مالکؒ نے فرمایا:

''فواللہ لقد علمنی التصنیف یومئذ یعنی اللہ کی قسم (ابو جعفر المنصور نے) مجھے اسی وقت تصنیف کتاب کا طریقہ سمجھادیا۔''

بیان کیا جاتا ہے کہ امام مالک نے موطا کی تدوین مکمل کر کے اپنی کتاب عباسی خلیفہ ہارون الرشید عباسیؒ کے سامنے پیش کی جس پر انھوں نے کتاب کی کافی تعریف کی اور تجویز سامنے رکھی کہ اس کو کعبہ میں لٹکادیا جائے تاکہ تمام بلادِ اسلامیہ میں اس مجموعہ حدیث کے تحت فقہ اسلامی پر عمل کروایا جاسکے، جس پر امام مالکؒ نے علمی توسع کے پیش نظر ہارون الرشیدؒ کو ایسا کرنے سے منع فرمادیا۔

پھر یہ بات بھی غور کرنے لائق ہے کہ عباسی خلیفہ ہارون الرشیدؒ اس کتاب کو پوری بلاد اسلامیہ کا فقہی ماخذ بنانے کی بات کرتے ہیں جس میں امام مالکؒ نے سیدنا معاویہؓ، سیدنا مروانؒ اور امیر عبدالملک بن مروانؒ جیسے اموی اساطین کے فتاویٰ اور تعامل درج کئے ہیں۔ گویا سیاسی اختلاف اپنی جگہ لیکن علمی طور پر بنو امیہ اور بنو عباس میں کوئی باہمی تعصب نہیں تھا کیونکہ دونوں ہی قرآن وسنت کو دین کا ماخذ ماننے کے دعویدار تھے۔ پھر چار عباسی خلفاء نے خود امام مالکؒ سے موطا امام مالک کی سماعت کی یعنی امیر مہدی عباسی، امیر ہارون الرشید

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اور رفض نواز لوگوں کی کورانہ تقلید میں یا اپنی ذاتی سیاسی یا غیر سیاسی غرض کے لیے یا

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا):

عباسی، امیر محمد الامین عباسی اور امیر عبداللہ المامون عباسی۔ علامہ سیوطی لکھتے ہیں :
''قاضی فاضل نے ایک رسالے میں کہا ہے کہ مجھے نہیں معلوم کہ کسی بادشاہ نے طلب علم کے لئے سفر کیا ہو سوائے ہارون الرشید کے۔ وہ اپنے دونوں فرزندوں الامین اور المامون کے ساتھ موطا کی سماعت کے لئے امام مالک کے پاس گئے۔ پھر کہتے ہیں کہ ہارون الرشید نے جس نسخے سے سماعت کی وہ مصریوں کے خزانے میں محفوظ تھا، پھر کہتے ہیں کہ اس کی سماعت کے لئے سلطان صلاح الدین ایوبی نے اسکندریہ کا سفر کیا اور طاہر بن عوف سے اس کی سماعت کی۔ ایسے کسی تیسرے کو میں نہیں جانتا۔'' (تاریخ الخلفاء صفحہ ۳۹۴)
اسی طرح جب یحییٰ مصمودیؒ موطا امام مالکؒ کو لے کر مغرب گئے تو وہاں اموی حکومت کی سرپرستی میں موطا کو مقبولیت نصیب ہوئی اور یوں مالکی فقہ ان علاقوں کا دستور قرار پایا۔ گویا مشرق کے عباسی ہوں یا مغرب کے اموی، سب سیاسی اختلافات کے باوجود ایک دین کے پابند تھے۔ جس طرح عباسیوں نے موطا میں سیدنا مروانؓ اور امیر عبدالملک بن مروانؒ کے فتاویٰ کو دین کی بابت حجت باور کیا، اسی طرح مغرب کے اموی امراء نے بھی اس کا خیال نہیں کیا کہ موطا کی تدوین عباسیوں کی زیر پرستی اور تجویز کے تحت ہوئی ہے۔ اسی طرح سے امام شافعیؒ نے اپنی شہرہ آفاق کتاب ''الام'' کی جلد ۴ صفحہ ۱۵۸ میں دیوان فاروقی کے سلسلے میں امیر المومنین سیدنا معاویہؓ کے ساتھ ساتھ عباسی خلیفہ المہدی عباسی کا تعامل بھی بطور نظیر شرعی درج فرمایا ہے۔ یہی نہیں بلکہ امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد کبیر جناب امام ابو یوسفؒ کو خلافت عباسیہ میں جو مقام و مرتبہ حاصل تھا وہ کس سے مخفی ہے کہ دولت اسلامیہؒ کے پہلے قاضی القضاۃ مقرر کئے گئے۔ بقول علامہ ابو زھرہ مصری کہ خلافت عباسیہ کا استحکام بھی ایک سبب تھا فقہ حنفی کی اشاعت اور فروغ میں۔ (حیات ابو حنیفہ للمولف ابو زھرہ مصری)
بعینہٖ اسی طور سے امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے مذاہب کو بھی مکمل فروغ اس وقت حاصل ہوا جب کہ عباسی خلفاء نے ان کی سرکاری حیثیت کو تسلیم کرلیا۔ امیر القادر باللہ عباسیؒ فقہ شافعی کے ائمہ میں سے تھے اور ساتھ ہی ایک اور عباسی خلیفہ امیر المسترشد باللہؒ جوکہ عمدۃ

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

نسلی تعصب یا حسد کی بناء پر خلفاء بنی امیہ و بنی عباس اور ان کے عمال و اعوان خصوصاً

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا):

الدنیا والدین کہلاتے تھے وہ بھی فقہ شافعی کے پیروکار تھے اور ان کے اسی لقب کی مناسبت سے امام ابو بکر الشاشی نے اپنی کتاب ''العمدۃ'' تحریر کی تھی۔ (طبقات الشافعیہ الکبریٰ جلد ۴ صفحہ ۲۹۱)۔ امام شافعیؒ اور امیر ہارون الرشید عباسیؒ کے کافی قریبی تعلقات کا مورخین وفقہاء نے ذکر کیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ ہارون الرشید امام مالک کے ساتھ ساتھ امام شافعی کے بھی کافی معتقد تھے۔ اسی طرح سے مامون اور مابعد کے معتزلی عباسیوں کے ظلم کے بعد جب متبع سنت عباسی خلیفہ جعفر المتوکل علی اللہ عباسیؒ برسراقتدار آئے تو نہ صرف انہوں نے امام احمدؒ کو خلق قرآن کے مسئلہ کی بابت صعوبتوں سے مکمل نجات دلوائی بلکہ ان کے مخلص معتقد رہے۔ یہی وجہ رہی کہ مابعد کے ادوار میں آنے والے عباسی خلیفہ امیر الناصر الدین باللہ اور امیر المستضی باللہ نے حنبلی مذہب اختیار کرکے اپنے عہد حکومت میں اس کی اشاعت کی۔ الغرض ایسا قطعی نہیں تھا کہ خلفائے اسلام اور علمائے اسلام میں کوئی مشرق ومغرب کا بُعد تھا بلکہ ہمارے اکثر خلفاء وعمال امور دین کے ماہر بھی ہوتے تھے۔ محمد بن قاسمؒ جب سندھ فتح کرنے آئے تو اس وقت علوم الاسلامیہ کی کافی شد بد رکھتے تھے اور جس حجاج بن یوسفؒ نے انھیں سندھ فتح کرنے بھیجا اس کی قرآن فہمی اور ذوق قرآنی سے کس کو مجال انکار ہے۔ قرآن کی رکوعوں میں تقسیم اور ان پر حرکات و اعراب لگوانے کا کام امیر حجاجؒ نے ہی کروایا تھا۔ اسی طرح الجوہر المضیہ فی طبقات الحنفیہ میں یہ تصریح ہے کہ سلطان محمود غزنوی فقہ میں کافی درک رکھتے تھے اور کئی فقہی مسائل کی تنقیح ان سے ثابت ہے۔ ایسا ہی کچھ معاملہ سلطان صلاح الدین ایوبی کا تھا جنھوں نے طاہر بن عوف سے موطا کی سماعت کے لیے اسکندریہ کا سفر کیا۔ المختصر اسلامی تاریخ کے بیشتر خلفاء و امراء اور سلاطین عام طور پر اصحاب علم و فضل تھے جن کی زندگی علم سیاست کے ساتھ ساتھ علم دوستی میں بھی صرف ہوئی۔

نوٹ: بعض خلفاء اور علمائے وقت کے مابین اختلافات اور باہمی نزاعات کے واقعات بھی ملتے ہیں جن سے ہمیں مجال انکار نہیں، تاہم ایسے واقعات کافی کم ہیں اور چند علماء تک ہی محدود ہیں۔ جیسے امام احمد بن حنبلؒ اور معتزلی خلیفہ مامون عباسی کا اختلاف جس کی پاداش میں امام احمد بن حنبلؒ کو سخت صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔ (محمد فہد حارث)

حجاجؒ مرحوم کو ظالم و جابر کہنا اپنا فریضہ سمجھتے ہیں۔ ان کے محاسن چھپاتے ہیں۔ ان کی تعریف کرنا گناہ سمجھتے ہیں۔ جو شخص جھوٹے الزاموں سے ان کی برات ثابت کرتا ہے اسے خارجی کہنے لگتے ہیں۔ ذرا سوچیں کہ وہ اسلام اور اہل اسلام کو کس قدر نقصان پہنچا رہے ہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی سوچیں کہ قیامت کے دن اس کے بارے میں باز پرس کا بھی خطرہ ہے۔

خاتمہ بحث پر اس واقعہ کا اظہار کر دینا بھی ضروری اور مفید ہے کہ شیعوں اور شیعہ نوازوں نے اس سلسلہ میں بکثرت روایتیں وضع کی تھیں۔ یہاں تک کہ حدیث کے نام سے بھی متعدد کہانیاں وضع کرلیں اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر افتراء پردازی کرتے ہوئے بھی انھیں اللہ کا خوف نہ ہوا۔ ان روایتوں اور نام نہاد حدیثوں میں سے بعض سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ کی ستائش اور بنوامیہ یا حجاجؒ کی مذمت میں ہیں اور بعض خود سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ کی مذمت میں ہیں۔

اس قسم کی روایات اور نام نہاد احادیث میں سے بعض پر حافظ ابن کثیرؒ نے تنقید کی ہے اور ان کا باطل و موضوع ہونا ثابت کیا ہے۔ بعض کو بلا تبصرہ اس لیے ذکر کردیا ہے کہ ان کا موضوع، جعلی اور غلط ہونا ان کے مضمون یا اسلوب بیان کی رکاکت کی وجہ سے ایسا ظاہر ہے کہ بیان کی حاجت نہیں۔ حاصل یہ کہ اس قسم کی سب روایتیں اور نام نہاد احادیث جو بنوامیہ یا حجاجؒ کی مذمت میں یا خلاف واقعہ حکایات یا سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ کی تنقیص پر مشتمل ہیں، قطعاً باطل، موضوع اور جعلی ہیں۔ یہ سب شیعوں اور شیعہ نواز مؤرخوں اور راویوں یا سبائیوں کے ایجنٹوں کے کارخانہ دروغ بافی میں ڈھالی ہوئی کہانیاں اور افتراء پردازیاں ہیں جو سبائی فنِ تشہیر کا نمونہ ہیں۔ ان بے اصل جھوٹی روایتوں اور ان نام نہاد حدیثوں کا کوئی اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔

عبدالملک بن مروانؒ اور حجاجؒ کے ساتھ لڑائی ہونے سے پہلے سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ اور امیر یزیدؒ کے درمیان معرکہ آرائی ہوچکی تھی۔ سیدنا مسلم بن عقبہؓ امیر یزیدؒ

کی طرف سے اس فوج کے سپہ سالا رتھے جو مکہ معظّمہ کی طرف سیدنا ابن زبیرؓ کے خلاف بھیجی گئی تھی۔ شیعہ افواہ بازوں اور مؤرخوں نیز نسلی و خاندانی تعصب جاہلی کے مریضوں نے ان واقعات کے متعلق بھی پیٹ بھر کر جھوٹ بولا ہے۔ سنگ باری، آتش باری وغیرہ کے جھوٹے الزام امیر یزیدؒ مرحوم کے فرستادہ لشکر پر بھی لگائے ہیں۔ ان کے متعلق بھی یہ سمجھ لینا چاہیے کہ وہ بھی غلط اور سراپا کذب و بہتان الزام ہیں۔ ہماری مذکورہ بالا بحث اور تحقیق ان کو بھی باطل اور غلط ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔ جن کذابوں نے حجاجؒ مرحوم اور عبدالملکؒ مرحوم اور ان کے لشکر پر بہتان باندھے ہیں، انھیں نے امیر یزیدؒ مرحوم اور سیدنا مسلم بن عقبہؓ اور ان کے لشکر پر بھی بہتان باندھے ہیں اور ان سب پر جھوٹے اتہامات لگائے ہیں۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ سیدنا مسلم بن عقبہؓ اور سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ کے درمیان کوئی جنگ حرم مکہ کے اندر نہیں ہوئی۔ انھوں نے صرف محاصرہ کیا تھا۔ دونوں فوجوں میں جو معمولی سی لڑائی ہو وہ حرم کے باہر ہوئی۔ احترام ِحرم کا پاس و لحاظ فریقین کرتے رہے۔ طبری وغیرہ کی تاریخوں میں جو سنگ باری وغیرہ کے قصے اس حادثہ کے متعلق ملتے ہیں وہ سب روافض اور رافضیت نوازوں کے گھڑے ہوئے ، بے اصل و بے بنیاد جھوٹے قصے ہیں۔ ہماری بحث مذکور سے یہ حقیقت خوب روشن ہوجاتی ہے، ذرا غور کرنے کی ضرورت ہے۔

سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ اور دو اموی خلفاء کے درمیان جنگ کے اسباب:

سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ اور دو اموی خلفاء کے درمیان معرکہ آرائی ہوئی، اس کے اسباب کیا ہوئے؟ اس کی تفصیل مؤرخ کا کام ہے۔ ہم تفصیل کو نظر انداز کرکے صرف اس امر کی نشاندہی کرنا چاہتے ہیں جو اس خلفشار اور باہمی منازعت و تفرقہ کا حقیقی سبب بنا۔ اور دوسرا مقصد یہ ہے کہ اس سوئے ظن کو دور کیا جائے جو مؤرخین کے غلط اور نامناسب اسلوب بیان اور سبائیوں کے وضع کیے ہوئے جھوٹے قصص و

روایات کی وجہ سے متعلق افراد کے بارے میں پیدا ہوتا ہے۔

پہلی بات کے متعلق ہمیں یہ عرض کرنا ہے کہ یہ دونوں لڑائیاں سراسر شیعوں اور شیعت نوازوں کی ریشہ دوانیوں،دسیسہ کاریوں اور فتنہ پردازیوں کا نتیجہ تھیں ورنہ فریقوں کا وجود ہی نہ ہوتا اور ان کے درمیان کسی جنگ کا تصور ہی نہ کیا جاسکتا تھا۔ اختصار کے ساتھ اس کی توضیح یہ ہے کہ سبائیوں نے جو تقیہ کرکے دمشق میں بھی جمع ہوگئے تھے، عبداللہ بن مطیع کو اپنا آلہ کار بنایا، انھوں نے نیز بعض دوسرے تقیہ باز سبائیوں اور سبائیوں کے ایجنٹوں نے سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ کو یہ باور کروادیا کہ امیر یزیدؒ فاسق و فاجر ہے، ملت ان سے بیزار ہے۔ صالحین قوم کسی ایسی اولوالعزم شخصیت کے خروج کے منتظر ہیں جو اصلاحِ حال کے لیے امیر یزیدؒ پر سختی سے نکیر کرے۔ اگر وہ نہ مانیں تو بزور قوت انھیں معزول کردے۔ نیز انھیں یہ باور کروایا کہ قوم کی نظریں آپ کی طرف ہیں اور وہ آپ کو خلیفۃ المسلمین بنانا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ دوسری طرف امیر المومنین کے کان بھرتے رہے اور انھیں یہ باور کروایا کہ سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ جاہ اقتدار کے طالب، خلافت کے خواہاں اور آمادہ بغاوت ہیں۔ ان دونوں کو ورغلا کر ان سبائی منافقین نے دونوں کی فوجوں کو آمنے سامنے صف آراء کردیا۔ امیر یزیدؒ کے خلافت کے زمانہ میں پورا عالم اسلامی ایک مرکز پر مجتمع ہوگیا تھا۔ یہ چیز شیعوں اور یہود کے لیے سوہان روح تھی۔ امیر یزیدؒ کے تدبر اور ان کی دانشمندی اور اعلیٰ صلاحیتِ حکمرانی کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ امت میں خلفشار پیدا کرنے کی شیعی اور یہودی مساعی کے باوجود انھوں نے امت کو ایک مرکز پر مجتمع رکھا۔ ان کے انتقال کے بعد روافض اور ان کے آلہ کار رافضی نوازوں ، نیز یہود کی ریشہ دوانیوں اور خفیہ و علانیہ دسیسہ کاریوں اور فساد انگیزیوں کی وجہ سے عالم اسلامی میں سخت خلفشار اور لامرکزیت کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں:

"تین ماہ تک عالم اسلام بغیر کسی امام اور خلیفہ کے رہا"(۱)

اس لامرکزیت اور افراتفری کے عالم میں اہل حجاز نے سیدنا ابن زبیرؓ سے بیعت کرلی اور شام کے لوگوں نے سیدنا مروانؒ سے بیعت کرکے انھیں خلیفہ منتخب کرلیا۔ بیعت دونوں میں سے کس سے پہلے کی گئی اور کس سے بعد میں؟ اس کا کوئی جواب نہیں مل سکا۔ سبائیوں نے فساد پیدا کرنے کے لیے اسے اور مبہم بنادیا۔

ان شیعہ مفسدین کے دو گروہ ہوگئے اور آپس میں صلاح و مشورہ کرکے دونوں طرف پہنچ گئے۔ ایک گروہ نے سیدنا ابن زبیرؓ کو باور کرادیا کہ ان کی بیعت پہلے ہوئی ہے، اس لیے سیدنا مروانؒ اور ان کے جانشین عبدالملک بن مروانؒ باغی ہیں اور حفاظتِ خلافت کے لیے ان سے قتال واجب ہے۔ دوسری طرف دوسرے گروہ نے سیدنا مروانؒ اور عبدالملک مروانؒ کو اسی طرح اولیت کا یقین دلا کر بغاوت فرو کرنے اور اس کے لیے جنگ کرنے پر آمادہ کیا۔ اس طرح یہ مفسد منافقین ان صالح مسلمانوں کے دو ایسے گروہوں کو میدان جنگ میں ایک دوسرے کے مقابل لے آئے جو اپنے مسلمان بھائیوں سے قطعاً جنگ نہیں کرنا چاہتے تھے۔

سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ کے متعلق یہ سوئے ظن کرنا کہ انھوں نے جاہ و اقتدار حاصل کرنے کے لیے جنگ کی سخت غلطی ہے۔ آں محترم نبی اکرم ﷺ کے صحابی ہیں۔ وہ اس ورطہ میں مبتلا نہیں ہوسکتے تھے۔ اگر وقتی طور پر ان کے دل میں یہ جذبہ پیدا بھی ہوتا تو اس کی بقاء غیر ممکن تھی کیونکہ پوری جماعت صحابہؓ کا ایک خاص وصف جمیل قرآن مجید میں یہ بیان فرمایا گیا ہے کہ

وَلَمْ يُصِرُّوا عَلَىٰ مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ

وہ اپنی غلطی پر اصرار نہیں کرتے درآں حالانکہ وہ جانتے ہیں (۲)

۱۔ البدایہ والنہایہ، جلد ۸، صفحہ ۳۳۹۔

۲۔ سورۃ آل عمران: ۱۳۵۔

صحابہ کرام معصوم نہیں تھے۔ معصیت کا صدور ان سے بھی ممکن تھا، مگر کسی معصیت کا عادی ہوجانا یا اسے بار بار دہرانا، ان کے لیے غیر ممکن تھا۔ جنگ و جدل کا سلسلہ خاصی مدت تک جاری رہا۔ اگر اس کا محرک جذبہ حُبّ ِ جاہ و اقتدار ہوتا تو اتنے دن اس کی بقاء کا شمار ''اصرار علی المعصیۃ'' میں ہوتا۔ جس کا صدور ان سے ازروئے قرآن کریم غیر ممکن اور محال تھا۔ اس لیے یہ ماننا پڑے گا کہ وہ مخلص تھے اور انھوں نے اپنے اجتہاد کے بموجب اتباع شریعت ہی کے لیے جنگ کی۔

ان کے مقابلے میں عبدالملکؒ تھے۔ وہ اگرچہ صحابی نہیں تھے مگر ان کی پوزیشن بھی ازروئے شریعت اور دستورِ اسلامی مستحکم تھی۔ انھوں نے بھی اپنے اجتہاد کے بموجب خلوص کے ساتھ اتباع شریعت ہی کے لیے جنگ کی۔ کوئی وجہ نہیں کہ ہم انھیں حب جاو و اقتدار کا مریض قرار دیں۔ وہ صحابی نہیں ہیں۔ اس لیے ان سے اس کی قطعی نفی کی تو کوئی دلیل شرعی ہمارے پاس نہیں۔ لیکن ازروئے شریعت اسلامیہ و دستور اسلامی ان کا موقف بھی مستحکم تھا اور جس طرح سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ کے لیے حفاظتِ خلافت اور بغاوت ختم کرنے کے لیے قتال و جدال شرعاً جائز تھا، اسی طرح ان کے لیے بھی جائز تھا۔ دونوں کے اجتہادوں میں سے کس کا اجتہاد صحیح تھا؟ اس کا کوئی فیصلہ نہ ہوسکا اور اب اس کا فیصلہ کرنے کی کوشش کرنا بے سود ہے۔ جب تک کوئی دلیل نہ ہو اس وقت تک ان کی نیت پر بھی شبہ کرنا جائز نہیں۔ انھیں بھی مخلص ہی کہا جائے گا۔ اختلافِ اجتہاد کی وجہ سے جدال و قتال ہوجانا کوئی عیب نہیں کہا جاسکتا۔ یہ طاعت ہی تھی معصیت نہیں تھی۔ اپنے اخلاص کی وجہ سے ابن زبیرؓ مرتبہ شہادت پر فائز ہوئے۔ سیدنا مروانؓ اور مسلم بن عقبہؒ کے متعلق بھی یہی تقریر کافی ہے۔ یہ حضرات بھی مخلص تھے اور اپنے مخلصانہ عمل میں ماجور ہوئے۔ فریق مقابل کے مقابلے میں یہ حضرات دلیل شرعی کی بناء پر خود کو حق پر سمجھتے تھے اور فریق مقابل کو اسی دلیل کی بناء پر برسر باطل جانتے تھے۔ حقیقت واقعہ کے لحاظ سے ان کی

رائے صحیح تھی یا غلط؟ اس سے بحث نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں معاملہ ان کی نیت کی بناء پر ہوگا۔ اپنی دانست میں انھوں نے حکم شرعی پر عمل کیا اس لیے وہ گنہگار نہیں ہوئے بلکہ ماجور ہوئے۔ حرم شریف میں سنگ باری اور اس کے دوسرے متعلقات کی بحث تو ختم ہوئی۔ اس کے ساتھ خلافت عادلہ امویہ کے اوپر مخالفین کے بہت سے اعتراضات کی غلطی بھی ثابت ہوگئی۔ یہ اعتراضات و الزام مخالفینِ بنی امیہ کے لیے مایہ ناز ہیں لیکن ان سطور کا مطالعہ کرنے والوں نے دیکھ لیا کہ یہ صحت وحقیقت سے کس قدر دور ہیں اور صرف بغض وعباد اور حسد سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی کوئی مستحکم اصل و بنیاد نہیں۔ اسی بحث کو سامنے رکھ کر ان لوگوں کے دوسرے غلط الزامات پر بھی نظر کرنا چاہیے، ان شاءاللہ ان کی غلطی بھی آسانی کے ساتھ سمجھ میں آجائے گی۔